سوانحِ فضلِ عمر

جلد اوّل

حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر الدّین محمود احمد
فضلِ عمر، مصلح موعود، خلیفۃ المسیح الثانی
کے سوانح حیات

تصنیف

مرزا طاہر احمد

ناشرین
فضلِ عمر فاؤنڈیشن

طبع اول .... دسمبر ۱۹۷۵ء
تعداد .... دو ہزار
طابع .... اقبال احمد شمیم

ناشرین
فضل عمر فاؤنڈیشن

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

عرضِ حال

حضرت فضلِ عمر مرزا بشیرالدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی سوانح کی تصنیف و ترتیب کا کام فضلِ عمر فاؤنڈیشن۔ ربوہ کے فیصلہ کے مطابق قبل ازیں استاذی المکرم ملک سیف الرحمٰن صاحب پرنسپل جامعہ احمدیہ۔ ربوہ کے سپرد تھا۔ آپ نے بڑی محنت اور کاوش کے ساتھ کئی سال تک اس بارہ میں متفرق مواد کو یکجا کیا اور ابتدائی چند ابواب کی تصنیف بھی مکمل کر لی لیکن بعد ازاں بعض مصالح کے پیشِ نظر یہ ذمہ داری خاکسار راقم الحروف کے کندھوں پر ڈال دی گئی۔

خاکسار کے لئے ازسرِنو اس کام کا آغاز کرنا ایک مشکل امر تھا اور جو طویل مواد مکرم محترم ملک صاحب نے بڑی محنت سے یکجا کیا تھا اس کے بغور مطالعہ کے لئے ہی بہت وقت درکار تھا۔ افسوس کہ اپنی دیگر مصروفیات اور مشاغل کے باعث میں اس اہم کام کے لئے خاطرخواہ وقت نہ دے سکا۔ نتیجۃً توقع سے زیادہ تاخیر ہوتی چلی گئی اور اب کئی سال کے انتظار کے بعد حضرت فضلِ عمر رضی اللہ عنہ کی طویل سوانح حیات کی پہلی جلد ہدیۂ قارئین کرنے کے قابل ہو سکا ہوں۔

جو قارئین مختلف قسم کی تصانیف کا تجربہ رکھتے ہیں وہ مجھ سے غالباً اس امر میں اتفاق فرمائیں گے کہ تصانیف کی مختلف انواع میں سب سے مشکل اور وقت طلب نوع کسی سوانحِ حیات کی تصنیف ہے۔ بعض ایسی شخصیات کی سوانحِ حیات کی تیاری میں بھی جو اپنی ہمعصر اور ہم قوم شخصیات میں کوئی غیر معمولی عظمت کا مقام نہ رکھتی تھیں، اُن کے سوانح نگار کو سالہا سال تک محنت اور کاوش کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ لارڈ فشر کے سوانح نگار ایڈمرل بیکن نے ہمہ وقت کام کرنے کے باوجود اس کام پر دس سال کا طویل عرصہ صَرف کیا۔ یہ مثال محض اس لئے پیش کی جا رہی ہے کہ ایک سوانح نگار کی مشکلات کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

حضرت فضلِ عمر مرزا بشیرالدین محمود احمد رضی اللہ عنہ کی سوانح حیات کئی پہلوؤں سے ایک عام دنیاوی رہنما یا جرنیل یا اہلِ قلم کی سوانح سے مختلف اور ممتاز حیثیت رکھتی ہے اور گو اس وقت ہمارا یہ دعویٰ بعض قارئین کو عجیب معلوم ہو لیکن ہر آنے والا سال ہمارے اس دعویٰ کی صداقت پر نئی

شہادتیں ثبت کرتا ہے گا کہ آپ اُن ممتاز ابنائے آدم میں سے تھے جو صدیوں ہی میں نہیں بلکہ ہزاروں سال میں کبھی ایک بار اُفقِ انسانیت پر طلوع ہوتے ہیں اور جن کی روشنی صرف ایک نسل کو نہیں بلکہ بیسیوں انسانی نسلوں کو اپنی ضیاء پاشی سے منوّر کرتی رہتی ہے۔ آپ بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ حضرت مرزا غلام احمد علیہ السلام کے دوسرے خلیفہ کی حیثیت سے اس وقت مسندِ خلافت پر متمکن ہوئے جب آپ کی عمر صرف ۲۵ برس تھی۔ مسلسل ۵۲ سال تک آپ نے خلافتِ احمدیہ کی عظیم ذمہ داریوں کو سرانجام دیا اور ۷۷ سال کی عمر میں وفات پائی۔

۵۲ سال کا عرصہ ہندوستان کی اوسط انسانی عمر کے لحاظ سے تقریباً دو انسانی عمروں کا عرصہ بنتا ہے۔ یہ تمام عرصہ آپ نے ہمہ تن مشغولیت کے عالم میں صرف کیا۔ آپ کے خطبات اور تقاریر اور مختلف تقاریب پر خطابات کی تعداد ہی ہزاروں تک جا پہنچتی ہے۔ بیسیوں اہم تصانیف ہیں۔ سینکڑوں سفر اور دیگر مشاغل کا ذکر اخبارات کے ہزارہا صفحات پر پھیلا پڑا ہے۔ اگرچہ آج آپ کے اکثر ہمعصر اس دنیا سے اُٹھ چکے ہیں لیکن آج بھی ہزاروں ایسے احباب زندہ موجود ہیں جو آپ کے اخلاق اور عادات اور احسانات کی میٹھی یادیں لئے ہوئے ہیں۔ ہزاروں صفحات پر مشتمل ایسا ریکارڈ ہمارے پاس موجود ہے جس میں آپ کو قریب سے دیکھنے والوں نے اپنے تاثرات اور خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس تمام مواد کی چھان بین اور انتخاب اور مناسب ابواب میں اس کی برمحل ترتیب کوئی معمولی کام نہیں۔ آپ کی بچپن کی زندگی کے حالات بھی یکجائی صُورت میں نہیں ملتے بلکہ ورق در ورق بکھرے پڑے ہیں۔ آپ کے بعض ہمعصر بچپن کے ساتھی ایسے ہیں جو آج بھی بفضلہٖ تعالیٰ زندہ موجود ہیں اور بعض نے ابھی قریب کے زمانہ میں ہی وفات پائی ہے۔ ایسے بزرگان سے اُن کی یادوں کو کرید کر قابلِ ذکر واقعات کی جستجو کوئی معمولی کوشش نہیں۔ مَیں ایک دفعہ پھر محترم ملک سیف الرحمٰن صاحب کی محنت اور کاوش کو سراہنے پر مجبور ہوں کہ انہوں نے بڑی تندہی اور لگن سے ایسا مواد اکٹھا کرکے میرے کام کو آسان کر دیا لیکن اس کے باوجود ابھی بہت سے ایسے بزرگ تھے جو اپنی عمر کی زیادتی اور صحت کی کمزوری کے باعث محض اخباری اعلانات یا خطوط کے ذریعہ کچھ لکھنے کی طاقت نہ پا سکے یا بعض دیگر مصروفیات اور مشاغل کے باعث اتنا وقت فارغ نہ کر سکے کہ اپنی یادوں کو مجتمع کرکے پُورے انہماک کے ساتھ اس موضوع پر قلم اُٹھا سکیں۔ ایسے متعدد دوستوں سے رابطہ پیدا کرکے اُن کی قیمتی یادوں کا سرمایہ اکٹھا کرنے کی کوشش ہماری طرف سے آج بھی جاری ہے۔

جلد اوّل سے متعلّق ایک ضروری صراحت

سوانح فضل عمر کی جلد اوّل میں قارئین بہت سا ایسا مواد بھی پائیں گے جو براہِ راست سوانح حضرت فضل عمر رضی اللہ عنہ کے موضوع سے تعلق نہیں رکھتا۔ مثلاً مذہبی پس منظر۔ احمدیت کا تعارف تاریخ احمدیت کے کچھ احوال وغیرہ۔ یہ بظاہر بے تعلق مواد ایک مجبوری کے تحت پیش کیا جا رہا ہے۔ اور بنظرِ غائر دیکھا جائے تو کچھ ایسا بے تعلق بھی معلوم نہ ہوگا۔

وہ قارئین جو احمدیّت سے کسی حد تک شناسا ہیں اُن کے لئے تو حضرت فضل عمر رضی اللہ عنہ کی سوانح حیات کو کما حقہٗ سمجھنا چنداں مشکل نہ ہوگا مگر ہمارے پیشِ نظر ایسے قارئین بھی ہیں جو ہمارے ہم وطن ہونے کے باوجود تحریکِ احمدیت سے بنیادی طور پر ناآشنا ہوں بلکہ جو کچھ جانتے ہوں وہ محض دشمن کی زبان سے پہنچی ہُوئی کہانی کی حد تک۔ ایسے دوستوں کو جب تک احمدیّت کے اصلی خدّوخال سے روشناس نہ کروایا جاتا اُن کے لئے حضرت فضل عمر رضی اللہ عنہ کی سوانح حیات صحیح معنوں میں سمجھنا مشکل ہوتا۔

تعارفِ احمدیّت کے علاوہ تاریخِ احمدیت کے بعض پہلوؤں کا ذکر بھی ایک وجہ سے ناگزیر تھا۔ حضرت فضل عمر رضی اللہ عنہ کے باوَن ۵۲ سالہ دَورِ خلافت میں آپ کی سوانح کے خطوط کو تاریخِ احمدیّت کے خطوط سے کلیۃً الگ کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔ لہٰذا اس سے قبل کے نسبتاً مختصر دَور میں اگر تاریخ احمدیت کو کلیۃً نظرانداز کر دیا جاتا تو سوانح کی بعد کی جلدوں میں قارئین یقیناً جا بجا تشنگی محسوس کرتے۔ لہٰذا ربطِ کلام کی خاطر تاریخِ احمدیّت کے محض اُن پہلوؤں کا ذکر اس جلد میں کیا گیا ہے جو آپ کی زندگی پر کسی نہ کسی حد تک اثرانداز ہُوئے یا آپ کی زندگی جن سے کسی رنگ میں اثر پذیر ہُوئی۔

ہماری کوشش ہوگی کہ تمام سوانح حیات قریباً تین جلدوں میں یا کم و بیش بارہ صد صفحات کے اندر مکمل ہو جائے لیکن حضرت فضل عمر رضی اللہ عنہ کی بھرپُور زندگی اور بے شمار قابلِ ذکر کارناموں، تصانیف اور تقاریر کے پیشِ نظر اتنے تھوڑے صفحات میں اس کام کو سمیٹنا ایک مشکل امر ضرور ہے۔ زیرِ نظر جلد میں ہی اقتباسات کے اختیار و ترک کے مسئلہ نے کئی ماہ تک ہماری توجہ کو اپنی طرف مبذول کئے رکھا۔

بورڈ آف ایڈیٹرز کے بارہ میں چند الفاظِ تشکّر

کام کی غیر معمولی اہمیّت کے پیشِ نظر فضل عمر فاؤنڈیشن نے یہ پسند نہ کیا کہ ایک ہی شخص کی صوابدید پر اس کام کو چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ سلسلہ کے بعض بلند پایہ بزرگان اور جیّد علمآ پر مشتمل ایک بورڈ تشکیل کیا گیا جس کے اراکین کے اسمآ ٹائٹل پیج پر درج ہیں۔ مضمون کا مسودہ باری باری اِن تمام بزرگان کی خدمت میں اُن کی آرآ اور رہنمائی کے لئے ارسال کیا جاتا رہا جو اپنی اپنی مصروفیات کے مطابق کبھی کم اور کبھی زیادہ وقت لے کر مسوّدہ کا گہری تنقیدی نظر سے مطالعہ فرمانے کے بعد خاکسار کی مناسب رہنمائی فرماتے رہے۔ یہ کام خاصہ وقت طلب تھا اور مختلف آرآ کو مختلف بزرگان کے سامنے از سرِ نو پیش کر کے کسی ایک نتیجہ تک پہنچنا مزید وقت کا متقاضی تھا جو جملہ ممبرانِ بورڈ نے بڑی بشاشت اور فراخدلی سے صَرف فرمایا۔ بالخصوص حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب اور حضرت شیخ محمد احمد صاحب مظہر کا تعاون اور مشفقانہ رہنمائی میرے لئے مشعلِ راہ ثابت ہُوئے۔ اِن دونوں بزرگان نے کم سے کم مدّت میں مسوّدہ کے ہر حصہ کا بالاستیعاب مطالعہ کر کے ہمیشہ نہایت قیمتی تنقید اور اصلاح فرمائی۔ فجزاھم اللہ احسن الجزآءُ۔

آخر پر مَیں مکرم یوسف سلیم صاحب ایم۔ اے انچارج شعبہ زُود نویسی کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں جو ابتدآ ہی سے اس کام سے متعلق رہے اور ضروری مواد اکٹھا کرنے اور ترتیب دینے میں محترم ملک سیف الرحمٰن صاحب کے بعد خاکسار کا بھی بڑے خلوص اور محنت سے ہاتھ بٹاتے رہے۔ اسی طرح کاپی ریڈنگ میں بھی آپ نے بہت جانفشانی دکھائی اور چھوٹے چھوٹے اسقام کی بھی نشاندہی کرتے رہے۔ اس جلد کی کتابت جس نوجوان کاتب اعجاز احمد محمود نے کی ہے وہ بھی میرے شکریہ کے مستحق ہیں کیونکہ اُن کا تعاون اُجرانہ نسبت سے بہت بڑھ کر تھا اور دلی لگن اور جذبۂ شوق کے ساتھ اس کام کو سرانجام دیا۔ وما توفیقنا اِلّا باللہ۔

والسلام

خاکسار مرزا طاہر احمد

۴ر دسمبر ۱۹۷۵ء

ترتیب

عناوین	صفحہ نمبر
باب اوّل :	
پیشگوئی مصلح موعود' مذہبی پس منظر اور احمدیت کا مختصر تعارف	
رحمت کا نشان ۔	۳
مذہبی پس منظر ۔	۴
مسلمانوں کی حالت ۔	۷
غیر مذاہب پر عیسائیت کی یلغار اور اس کے خطرناک نتائج ۔	۱۱
ہندوستان سے اسلام کو مٹانے کے ہندو منصوبے ۔	۱۵
احمدیت کا مختصر تعارف ۔	۱۷
ماموریت کا دعویٰ اور جماعت کا باقاعدہ قیام	۲۵
وفاتِ مسیح ناصری کا ولولہ خیز اعلان اور مسیحیت کا دعویٰ ۔	۲۷
مسیح موعود کے نزول کی پیشگوئی اور اس کی لطیف تشریح ۔	۳۳
دیگر دعاوی اور آپ کے مشن کی عالمگیر حیثیت ۔	۳۶
احمدیت مخالفت کی بھٹی میں ۔	۳۹
دیگر مذاہب کی طرف سے مخالفت اور آریہ سماج کا مقابلہ ۔	۴۵
مسیح موعود کے صاحبِ اولاد ہونے کے متعلق حضرت سرورِ دو عالمؐ کی عظیم الشان خوشخبری اور بزرگانِ اُمت کی بشارات ۔	۶۵

عناوین	صفحہ نمبر
باب دوم :	
موعود بیٹے کی ولادت' بچپن تعلیم و تربیت اور عنفوانِ شباب	
موعود بیٹے کی ولادت ۔	۷۱
بچپن کے ابتدائی ایام اور تربیتِ والدین ۔	۷۵
آپ کی تربیت میں آپ کی بزرگ والدہ کا حصہ ۔	۸۸
تربیت قبول کرنے کی اہلیت ۔	۹۰
خود اپنی تربیت کی اہلیت ۔	۹۵
تعلیم ۔	۹۹
تقریر و تحریر ۔	۱۱۸
بچپن کی دلچسپیاں' تفریحات اور کھیلیں ۔	۱۲۶
تعلقات کے دائرے ۔	۱۳۷
پہلی شادی ۔	۱۴۴
اپنے عظیم باپ کی صداقت پر آپ کا ایمان اور اس کے نتائج ۔	۱۴۷
پرہول اور پرخطر فضاؤں تلے ۔	۱۵۵
حضرت مسیح موعودؑ کی صداقت پر آپ کا روز و شب بڑھتا ہوا ایمان ۔	۱۶۱
باب سوم	
حضرت مسیح موعودؑ کا وصال' خلافتِ اُولیٰ کا قیام' حضرت صاحبزادہ صاحب کی استحکامِ خلافت کے لئے عظیم خدمات	

عناوین	صفحہ نمبر
دیگر مشاغل اور مصروفیات	
حضرت مسیح موعودؑ کا وصال اور تدفین ۔	۱۶۵
حضرت صاحبزادہ صاحب کا ایک تاریخی عہد ۔	۱۷۷
جماعتِ احمدیہ میں نظامِ خلافت کا قیام	۱۸۰
نظامِ خلافت کے استحکام کیلئے جدوجہد	
حضرت خلیفۃ المسیح الاولؓ سے کامل اطاعت اور وفا کا تعلق ۔	۱۸۵
حضرت صاحبزادہ صاحب کا ایک اہم رویاء	
تقریر و تحریر	۲۱۷
طرزِ خطابت اور اس کے گہرے اثرات	۲۲۵
بعض دیگر اہم اور دُور رس علمی خدمات:	
رسالہ تشحیذ الاذہان کا اجراء	۲۲۵
احمدیہ دار المطالعہ اور لائبریری کا قیام	۲۲۷
اخبار "الفضل" کا اجراء	۲۲۸
مالی مشکلات	۲۴۲
حضرت صاحبزادہ صاحب کا منظوم کلام	۲۴۵
مختلف سفروں کی روئداد	۲۵۴
محمود کی کہانی محمود کی زبانی	
حج بیت اللہ اور سفرِ مصر	
باب چہارم:	
حضرت صاحبزادہ صاحب کی سیرت کے چند اور متفرق پہلو ۔	

عناوین	صفحہ نمبر
درسِ قرآن کریم	۲۰۱
مجلس انصار اللہ کے شیریں ثمرات	۲۰۳
حضرت مسیح موعود کے صحابہ سے گہری محبت	۲۰۶
تضرعات کا رنگ	۲۰۹
حضرت خلیفۃ المسیح الاولؓ کی صاحبزادہ صاحب سے بلند توقعات اور کامل اعتماد	۲۱۳
انتخاب بحیثیت پریذیڈنٹ مجلس مشاورت	۲۱۴
تعلیم الاسلام سکول کے جاری رکھنے اور مدرسہ احمدیہ کے قیام میں تاریخی کردار	۲۱۴
مدرسہ احمدیہ کی بہبود اور ترقی کے لئے مزید خدمات	۲۲۱
ایک غیر از جماعت صحافی کے تاثرات	۲۲۴
باب پنجم:	
عہد خلافتِ اُولیٰ کے آخری ایام	
خلافتِ ثانیہ کا قیام، انکارِ خلافت کا فتنہ اور اس کی مختلف اشکال	
عہد خلافتِ اُولیٰ کے آخری ایام	۲۲۷
حضرت خلیفۃ المسیح الاولؓ کی وفات اور خلافتِ ثانیہ کا قیام	۲۳۴
امامِ وقت پر آمریت کا الزام	۲۴۷
پہلے امام یا خلیفہ کی مخالفت کا الزام	۲۴۸
قومی اموال میں غلط تصرف کا الزام	۲۵۰

عناوین	صفحہ نمبر
یہ اعتراض کہ حق حقدار کو نہیں پہنچا بلکہ کمتر شخص کو اختیار کر لیا گیا ہے۔	۳۵۲
جُزئی فضیلت کی بخشش یا نفاق کا چور دروازہ	۳۵۳
خلیفۂ وقت کی غلطیوں کی نشاندہی اور اُن کے چرچے	۳۵۵
بڑھاپے اور جسمانی کمزوری کے باعث نااہلی کا الزام	۳۵۶
ایک چاند کے بعد دُوسرا چاند	۳۵۸

بابِ اوّل

پیشگوئی مصلح موعود

مذہبی پس منظر اور

احمدیت کا مختصر تعارف

- رحمت کا نشان۔
- مذہبی پس منظر۔
- مسلمانوں کی حالت۔
- غیر مذاہب پر عیسائیت کی عالمگیر یلغار اور اسکے خطرناک نتائج۔
- ہندوستان سے اسلام کو مٹانے کے ہندو منصوبے۔
- احمدیت کا مختصر تعارف۔
- ماموریت کا دعویٰ اور جماعت احمدیہ کا باقاعدہ قیام۔
- وفاتِ مسیح ناصری کا ولولہ خیز اعلان اور مسیحیت کا دعویٰ۔
- مسیح موعود کے نزول کی پیشگوئی اور اس کی لطیف تشریح۔
- دیگر دعاوی اور آپ کے مشن کی عالمگیر حیثیت۔
- احمدیت مخالفت کی بھٹی میں۔
- دیگر مذاہب کی طرف سے مخالفت اور آریہ سماج سے مقابلہ۔
- مسیح موعود کے صاحب اولاد ہونے کے متعلق حضرت سرورِ دو عالم صلے اللہ علیہ وسلّم کی عظیم الشان خوشخبری اور بزرگانِ اُمّت کی بشارات۔

بسم الله الرحمن الرحيم

نحمده ونصلي على رسوله الكريم

رحمت کا نشان

"میں تجھے ایک رحمت کا نشان دیتا ہوں اُسی کے موافق جو تُو نے مجھ سے مانگا...
نُور آتا ہے نُور جس کو خدا نے اپنی رضامندی کے عطر سے ممسُوح کیا۔ ہم اس
میں اپنی رُوح ڈالیں گے اور خدا کا سایہ اس کے سر پر ہو گا۔ وہ جلد جلد بڑھے
گا اور اسیروں کی رستگاری کا مُوجب ہو گا اور زمین کے کناروں تک شہرت
پائے گا اور قومیں اس سے برکت پائیں گی۔ تب اپنے نفسی نقطہ آسمان کی
طرف اُٹھایا جائے گا۔ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا"

یہ پُرشوکت الفاظ اُس پیشگوئی کی ابتداء اور آخر سے لئے گئے ہیں جس میں ایک عظیم الشان انسان کی ولادت کی خبر دی گئی تھی جس نے اپنی ہم عصر دُنیا میں ہی نہیں بلکہ بعد کی دُنیا میں بھی ایک بلند اور درخشندہ نام اور وُسعت پذیر کام پیچھے چھوڑنا تھا ــ کب، کیوں، کس کو اور کس کی ولادت کی خبر ان الفاظ میں دی گئی اور ہم عصر دُنیا اور بعد کے آنے والے انسانوں کو اس پیشگوئی نے کس حد تک اور کیسے متاثر کیا ــ ؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن پر آئندہ اس مضمون میں روشنی ڈالی جائے گی لیکن قبل اسکے کہ اس عظیم انسان کی زندگی کے دلچسپ اور عجیب حالات کا تذکرہ چھیڑا جائے، اس پیشگوئی کے پس منظر کے متعلق کچھ بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

دراصل اس پیشگوئی میں کسی انفرادی عظمت کے حامل عظیم ہیرو کی پیدائش کا ذکر نہیں بلکہ ایک ایسے مذہبی رہنما کی ولادت کی خبر دی جارہی ہے جسے اس زمانہ کی ایک مذہبی تحریک کا رُوحِ رواں

بننا تھا اور جس کی تمام قوتیں اور فطری استعدادیں اسی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے وقف ہو جانا تھیں۔ پس جب تک کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس تحریک کے خدّو خال پر روشنی نہ ڈالی جائے اور یہ ظاہر نہ کیا جائے کہ اس پیشگوئی کا اس تحریک سے کس نوعیت کا تعلق ہے، قارئین اس سوانحِ حیات کو کماحقہٗ سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔

مذہبی پس منظر

تاریخِ مذاہب میں ۱۹ ویں صدی کا نصف آخر اور ۲۰ ویں صدی عیسوی کا آغاز خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ وہ دَور ہے جب کہ تمام روئے زمین پر ایک طرف تو بڑے بڑے مذاہب کے درمیان گہری سنجیدگی اور انہماک کے ساتھ نظریاتی جنگ لڑی جا رہی تھی اور دوسری طرف احیائے علوم اور تہذیبِ نَو کے نتیجہ میں مذہبی اور غیر مذہبی نظریات باہم دِگر بڑی شدت کے ساتھ برسرِ پیکار تھے

اوّل الذکر مقابلہ میں عیسائیت، اسلام اور ہندو مت کا مجادلہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ان تینوں مذاہب کی باہمی جنگوں کے لئے ہندوستان ہی بہترین اکھاڑا ثابت ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ۱۸ ویں صدی کے نصف آخر میں سرزمینِ ہند میں ان تینوں مذاہب کے درمیان وسیع پیمانے پر تاریخی اہمیت کی نظریاتی جنگیں لڑی گئیں اور یہ سلسلہ کسی نہ کسی رنگ میں اب تک جاری ہے۔

سرزمینِ ہند میں ان تینوں مذاہب کے مابین مذہبی جنگوں کے جو بکثرت محرکات موجود تھے، اُن کا مختصراً جائزہ حسبِ ذیل ہے:۔

۱۔ احیائے علوم اور تہذیبِ نو نے عموماً مذہب اور خصوصاً عیسائیت کو جو چیلنج دیا تھا، اُس کے نتیجہ میں عیسائی پادریوں میں مقابلے اور مدافعت کا ایک نیا جوش پیدا ہونے کے علاوہ انہیں عیسائیت کے لئے نئی منڈیوں کی بھی تلاش تھی۔ اور نوآبادیات سے بہتر انہیں کوئی اور جگہ اس غرض کو پورا کرنے کے لئے نظر نہ آتی تھی۔ انگریزی حکومت کا سُورج نصف النہار پر تھا اور حکومت کے مذہب کو جو نفسیاتی برتری حاصل ہوتی رہی ہے، وہ پوری شان کے ساتھ عیسائیت کو ہندوستان میں حاصل تھی، نیز اس مذہب کو اختیار کرنے کے نتیجہ میں جو اقتصادی اور اقتداری فوائد حاصل ہو سکتے تھے، اُن کی تصویر بہت دِلرُبا تھی۔ لہٰذا زمینِ ہندوستان عیسائیت

کے پھیلاؤ کے لیے خاص کشش کا موجب بنی۔

۲ — انگریزی حکومت کے مفادات بھی اِسی امر سے وابستہ تھے کہ ہندوستانی ذہن جلد از جلد اور زیادہ سے زیادہ عیسائی نظریات کے تابع ہو کر حکومتِ برطانیہ کے استحکام میں ممد و معاون ثابت ہو۔

۳ — ہندوستان میں مسلمانوں کے تین صد سالہ سیاسی اقتدار کا خاتمہ ہندومت کے لیے خوش آئند خوابوں کا تحفہ لے کر آیا تھا:-

ا — از سرِ نو ہندو مہاراشٹر کے قیام کا تصوّر ذہنوں میں جنم لینے لگا تھا اور اس کے طبعی نتیجہ کے طور پر غیر قوموں کو شُدھی کے ذریعہ ہندومت میں جذب کرنے کا تصوّر بھی پیدا ہو رہا تھا۔

ب — ہندو تہذیب و تمدّن کے احیاء کے منصوبے بن رہے تھے۔ پس یہ ضروری تھا کہ سابق آقاؤں یعنی مسلمان حکمرانوں کی تہذیب و تمدّن کے نقوش کو مسمار کر کے انہی مقامات پر ہندو تہذیب کی نئی عمارتیں بلند کی جائیں۔

ج — اسلام نے پُر امن تبلیغ کے ذریعہ برِصغیر میں جو وسیع نفوذ کیا تھا اُسے مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کا نتیجہ قرار دیا جانے لگا تھا اور شدید جذبۂ انتقام کے ساتھ ہندومت کی طرف سے اسلام پر یلغار کے منصوبے بنائے جا رہے تھے تاکہ برِصغیر سے اس "بدیشی" مذہب کا مکمل صفایا کر دیا جائے۔

د — ہندو مفکرین کے ذہنوں میں ایسی سیاسی تحریکات جنم لے رہی تھیں جو بعض صورتوں میں کھلّم کھلا مسلم کُش عزائم کی آئینہ دار تھیں اور بغیر کسی تلبیس کے اُن کے سیاسی مقاصد میں یہ بات داخل تھی کہ ہندوستان پر سوائے ہندو کے کسی کو راج کا حق نہیں اور مسلمانوں کو بزورِ شمشیر مغلوب کر لینا اُن کا مذہبی اور پیدائشی حق ہے۔ دوسری قسم کی سیاسی تحریکات تلبیس کا پہلو لیے ہوئے تھیں لیکن انجام کار سب کے مقاصد ایک ہی تھے یعنی مسلمانوں پر ایسا مکمل اور آخری

غلبہ حاصل کرلیتا جو رفتہ رفتہ مذہب اسلام کے نابود ہونے پر منتج ہو اور ہندوستان پر بلا شرکت غیرے صرف ہندومت کا تسلط قائم ہوجائے۔

اس شدید مذہبی کشمکش میں مسلمانوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کی جو کیفیت تھی، اس کا علیحدہ علیحدہ مختصر جائزہ پیش کیا جارہا ہے جس سے یہ بات بالکل عیاں ہوجاتی ہے کہ ان تینوں میں سے سب سے کمزور اور قابلِ رحم حالت مسلمانوں کی تھی۔ مسلمانوں کے کیمپ میں سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ اُن میں ایک قومی مذہبی قیادت کا فقدان تھا وہ اندرونی اختلافات میں اُلجھے ہوئے تھے اس لئے اُن کی مذہبی قیادت پیش آمدہ خطرات سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت نہ رکھتی تھی۔

مسلمانوں کی حالت

غیر منظم اور منتشر ہونے کے باوجود مسلمان عوام میں اپنے مذہب کے ساتھ بے پناہ وابستگی اور عقیدت پائی جاتی تھی۔ لہٰذا اگرچہ اسلام کی طرف سے جارحیت کا اِلّا ماشاء اللہ فقدان تھا، لیکن عامۃ المسلمین اور بعض خدارسیدہ علماء کے سینوں میں اپنی کس مپرسی کا احساس بڑی تیزی سے پیدا ہو کر ہیجانی کیفیت اختیار کر رہا تھا۔

جہاں تک مسلمان علماء کا تعلق ہے وہ اگرچہ اپنی بساط کے مطابق اسلام کے دفاع میں کوشاں تھے، لیکن عیسائیت، ہندومت اور تہذیبِ نو کی سہ طرفہ یلغار کا کماحقہٗ مقابلہ کرنا دراصل ان کے بس کی بات نہیں تھی۔

ان کی کمزوری کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اسلامی مدارس کا نظامِ تعلیم اپنے زمانہ سے صدیوں پیچھے رہ چکا تھا اور نئے علوم اور سائنسی انکشافات کی ہوا تک بھی ان مدارس کو نہیں پہنچی تھی (آج بھی اکثر صورتوں میں یہی دُرست ہے) دنیا و مافیہا کا ایک ایسا فلسفہ ان کو پڑھایا جا رہا تھا جو کئی صدیاں نہیں، کئی ہزار برس پرانا تھا اور حقائق سے اس کا دُور کا بھی تعلق نہ تھا۔

جہاں تک مذہبی تعلیم کا تعلق ہے، یہ مدارس اسلام کے سوا کسی مذہب کی تعلیم سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے جس کے نتیجہ میں ایسے علماء تیار ہوتے تھے جن کو شُنیدہ علم کے سوا غیر مذاہب کی تعلیمات اور کتبِ مُقدّسہ سے کوئی ٹھوس واقفیت نہیں تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں جارحانہ جنگ تو الگ رہی، مدافعانہ جنگ کے لئے بھی ضروری ہتھیار مہیا نہ تھے اور غیر مذاہب کی کتب سے ناواقفیت بار بار اور بُری طرح جوابی کارروائی کی راہ میں حائل ہوتی تھی۔ اس پر مزید وبال یہ تھا کہ عموماً علماء میں اپنے شاندار ماضی میں بسنے کا رجحان اس حد تک پایا جاتا تھا کہ عملاً ان کے نزدیک متقدّمین اور بزرگانِ سلف کے بعد کسی نئی علمی کاوش کی گویا ضرورت ہی باقی نہیں تھی۔ ضرورت تو الگ رہی، ایک طبقۂ علماء کے نزدیک تو متقدّمین کے بعد ہر نئی علمی کاوش گویا دین کو بگاڑنے کے مترادف سمجھی جاتی تھی۔

اسلام پر عائد کئے جانے والے صرف انہی اعتراضات سے انہیں واقفیت تھی جن کا ذکر متقدّمین کی کُتب میں ملتا تھا اور جوابات بھی بس اسی قدر یاد تھے جو متقدّمین کی کتب میں درج تھے۔ بعد میں اُٹھائے

جانے والے جوابی اعتراضات یا مسلمان مفسرین کی تفاسیر کی آڑ لے کر قرآن اور سُنّت پر کئے جانے والے تازہ حملوں کے جوابات تو کُجا ان اعتراضات ہی سے اکثر مسلمان علماء بے بہرہ تھے۔

یہ تو بیشتر اُن علماء کا حال تھا جو اسلام کا درد رکھتے تھے اور خلوصِ نیّت سے یہ چاہتے تھے کہ اسلام کی طرف سے قلمی اور لسانی جہاد میں بھرپور حصہ لیا جائے۔ وہ بے نیاز طبقۂ علماء اس کے علاوہ تھا اور اکثریت میں تھا جسے اس جنگ سے کوئی بھی سروکار نہ تھا۔ ہاں وہ اندرونی فرقہ وارانہ جھگڑوں ہی کو باعثِ نجات سمجھ بیٹھے تھے اور قصّہ وہابی غیر وہابی کا اور جھگڑا شیعہ سُنّی کا اُن کی تمام تر توجہات اور جوش و خروش اور ہیجانات کا محوَر بنا ہوا تھا۔ کہیں تو نظریاتی جنگیں تھیں اور کہیں نُور و بشر کے طوفاں خیز جھگڑے تھے۔ ان کے نزدیک اسلام ہی کی چار دیواری میں اندرونی لہروں کے باہم دِگر ٹکرا ٹکرا کر جھاگ جھاگ ہوتے رہنے کا نام جہاد تھا۔ گریبانوں میں اُلجھے ہوئے اس گروہ کے علاوہ ایک وہ انبوہ بھی علماء کہلانے والوں کا تھا جو نکاح اور فاتحہ خانیوں کی شیرینیوں اور یوسف زلیخا اور ملکۂ سبا کے قصّوں نیز جنّات کی تسخیر کے دعووں سے دیہات کے ماحول کو رنگینیاں عطا کر رہا تھا۔ اسلام اور قرآن پر کیا بیت رہی تھی اور ہمارے آقا و مولا حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلّم پر کیسے کیسے ظالمانہ اور سفّاکانہ حملے ہو رہے تھے؟ —— اِن باتوں کی تو اُن کے جنّات کو بھی خبر نہ تھی جن کی فرضی تسخیر میں وہ ہمہ تن مصروف تھے۔

مذکورہ بالا حالات کے ردّ عمل کے طور پر کئی قسم کے خیالات اور تحریکات کی رَو ئیں مسلمانوں کے درمیان چلنے لگیں۔

شدّت اور وُسعت میں سب سے بڑا ردّ عمل جس نے علماء اور عوام کی بھاری اکثریت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، اُن پیشگوئیوں میں پناہ ڈھونڈنے کی صُورت میں ظاہر ہوا جن میں حضرت بانیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف سے مسلمانوں پر آنے والے اِدبار کی خبروں کے ساتھ ساتھ ایک ایسے نجات دہندہ کی بعثت کی خبر بھی دی گئی تھی جو اس آڑے وقت میں مسلمانوں کے تنزّل کو ترقی اور ان کی شکست کو عظیم الشّان عالمگیر غلبہ میں تبدیل کر دے گا۔

اصل پیشگوئیاں کیا تھیں اور ان کا حقیقی مفہوم کیا تھا؟ —— یہ ایک علیٰحدہ بحث ہے۔ اس وقت ہم مختصراً ان پیشگوئیوں کے اس مفہوم کا ذکر کرتے ہیں جو مسلمان علماء کی طرف سے بکثرت مسلمان عوام میں پھیلا دیا گیا تھا۔ یہ تصوّر حضرت بانیٔ اسلام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی ان پیشگوئیوں سے ماخوذ تھا جن میں ایک طرف تو ایک خوفناک آفت کے خروج کی خبر دی گئی جس کا نام دجّال بتایا گیا تھا اور

دُوسری طرف ایک نجات دہندہ مسیح و مَہدی کی آمد کی بشارت دی گئی تھی۔

مذکورہ بالا پیشگوئیوں کے نتیجہ میں مسلمان عوام اپنے تنزل اور ادبار کے ایّام میں ایک ایسے دجّال کے خروج کے منتظر تھے جس نے ایک دیو ہیکل یک چشمی انسان کی صورت میں ایک طویل و عریض گدھے پر سوار ہو کر دُنیا میں خروج کرنا تھا اور ہر طرف قتل و غارت کا بازار گرم کر دینا تھا۔ اس دجّال کی زد سے دیگر اقوام کی طرح مسلمانوں نے بھی بُری طرح متأثر ہونا تھا' یہاں تک کہ ایک معمولی تعداد کے سوا اکثر و بیشتر مسلمانوں نے دجّال کے غلبہ سے کُلیۃً مغلوب ہو جانا تھا۔ لیکن عین اس وقت جب کہ مسلمان صفحۂ ہستی سے مٹتے ہُوئے نظر آتے' آسمان سے مسلمانوں کے نجات دہندہ مسیح ناصری نے نازل ہو کر دجّال کو اپنی تلوار سے قتل کر دینا تھا اور یُوں بظاہر سر پر منڈلاتی ہُوئی ایک ذلّت آمیز شکست کو ایک عظیم الشان فتح اور غلبہ میں بدل دینا تھا۔۔۔ اس تصوّر کے مطابق قتلِ دجّال سے فارغ ہو کر مسیحِ موعود کے فرائض میں مندرجہ ذیل اُمور شامل تھے :۔

اوّل ۔۔۔ دُنیا بھر کی صلیبوں کو' خواہ وہ لکڑی کی ہوں یا لوہے کی' پیتل تانبے کی ہوں یا سونے چاندی کی' توڑ دینا یہاں تک کہ رُوئے زمین پر کوئی صلیب دیکھنے کو بھی نظر نہ آئے۔

دوم ۔۔۔ تمام دنیا کے سُوروں کا قتلِ عام اور سطحِ ارض کو اس خبیث جانور کے وجُود سے پاک کرنا۔

اسلام کے غلبۂ نَو کا یہ وہ تصوّر ہے جو حضرت پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلّم کے نہایت پاکیزہ اور لطیف پُر استعارہ کلام کو نہ سمجھنے کے نتیجہ میں مسلمان علماء نے پیشگوئیوں کے ظاہری الفاظ کو دیکھ کر باندھا اور مسلمان عوام میں خُوب خُوب اس کا چرچا کیا۔

مذہبی جنگوں کے جس دَور کا ہم جائزہ لے رہے ہیں' اس دَور میں یہ علماء زیادہ تر ایسی ہی خوابوں میں زندگی بسر کر رہے تھے اور حملہ آور قوموں کے خلاف نظریاتی جہاد کرنے کی بجائے اسی یک چشمی دجّال اور اس کے گدھے کی راہ دیکھ رہے تھے کہ اِدھر وہ ظاہر ہو اور اُدھر مسیح ناصریؑ جو تھے آسمان کی بلندیوں سے اُتر کر شاہین کی طرح اس پر جھپٹ پڑیں اور اس کام سے فارغ ہونے کے بعد دُنیا بھر کے ممالک کا دَورہ کر کے تمام صلیبیں توڑ ڈالیں یہاں تک کہ ایک بھی صلیب دنیا میں باقی نہ رہے۔ پھر اس کے فوراً بعد سُوروں کی طرف اپنی توجہ منعطف فرمائیں اور ان کی بیخ کنی کی عالمگیر مہم شروع کر دیں یہاں تک کہ یہ پلید جانور دنیا سے ناپید ہو جائے اور چہار دانگ عالَم میں مسلمانوں کا بول بالا ہو جائے۔

اِدھر مسلمانوں کے تصور کی یہ حالت تھی اُدھر عیسائی اور ہندو عملاً اپنے اپنے مذاہب کو غالب کرنے کیلئے جو منصوبے بنا رہے تھے اور جو ٹھوس اقدام کر رہے تھے' ان کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ان حالات کے ایک سرسری موازنہ سے بھی خوب ظاہر ہو جاتا ہے کہ ہندو اور عیسائی ہر دو کے مقابل پر مسلمانوں کی حالت سخت ناگفتہ بہ اور قابلِ رحم تھی۔یہ خوابوں کی دُنیا میں بس رہے تھے تو وہ عمل کے میدان میں قدم مار رہے تھے۔

غیر مذاہب پر عیسائیت کی عالمگیر یلغار

اور اس کے خطرناک نتائج

پادری عماد الدین صاحب جو کبھی اجمیر شریف کی جامع مسجد کے خطیب ہوا کرتے تھے' اسلام سے انحراف کر کے عیسائی ہو گئے اور اسلام کے خلاف اس درجہ ان کا بُغض بڑھا کہ بعد کی ساری زندگی اسلام کے خلاف جد و جُہد کے لئے وقف ہو گئی اور عیسائیت کے صفِ اوّل کے مجاہدین میں ان کا شمار ہونے لگا — غیر مذاہب پر عیسائیت کی پے در پے فتوحات کے نتیجہ میں عیسائی پادریوں کا فاتحانہ اندازِ فکر اُن کی حسب ذیل تحریر کے لفظ لفظ سے عیاں ہے :۔

"۱۸۰۰ء میں جب ولیم کیری صاحب نے آ کے ملک بنگال کے ایک حصہ میں کام شروع کیا' اس وقت سے بہت آہستہ آہستہ مسیحی دین کا چرچا تمام ملک ہندوستان میں پھیلا ہے اور پنجاب میں قریب ۴۵ برس سے خدا کا دین آیا ہے۔ جس وقت کیری صاحب آئے اس وقت ملک کی ایسی حالت تھی کہ کوئی دنیاوی سمجھ کا آدمی نہ کہہ سکتا تھا کہ مسیح کا دین اس ملک میں پھیلے گا کیونکہ اس وقت کے محمدی اور ہندو اپنے اپنے مذاہب میں بڑے مضبوط اور سرگرم اور تعصب و سختی و ناواقفی سے بھرپور ہو کے ہوا سے باتیں کرتے تھے۔ ہاں اس وقت کیری صاحب کا مسیحی ایمان گواہی دیتا تھا کہ خدا کا دین اس ملک کو بھی ضرور فتح کرے گا' جیسا کہ وہ پیچھے سے فتح مند ہوتا چلا آیا ہے۔ اسی طرح اب ہم مسیحی بھی خدا پر یقین اور بھروسہ کر کے کہتے ہیں کہ کسی وقت یہ مُلک ملکِ انگلستان کی مانند ہونیوالا ہے۔ ہمارے مخالف ہندو و مسلمان و دیانندی و نیچری وغیرہ اگرچہ کیسا ہی زور دکھلا دیں اور زبان درازیاں کریں' وقت چلا آتا ہے کہ پتہ نہ دار رہوں گے۔ صرف مسیحی دینداری یہاں ہوگی یا شرارت نفسانی کے لوگ ملیں گے کیونکہ مُلک مُلک نے اب

ایسی حالت کی طرف رُخ کر لیا ہے اور پیچھے یُوں ہی ہوتا آیا ہے اور تعلیمات کے نتائج یہی ہیں۔" [1]

ہندوستان میں جو عیسائیت کو کامیابی حاصل ہو رہی تھی، اُس کی ایک ادنیٰ سی جھلک پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر چارلس ایچی سن کی ایک تقریر میں پائی جاتی ہے جو انہوں نے ۱۸۸۸ء میں کی تھی۔ انہوں نے کہا :۔

"بعض ایسے لوگوں کو جنہیں اس طرف توجہ کرنے کا موقعہ نہیں ملا، یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ جس رفتار سے ہندوستان کی معمولی آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے اس سے چار پانچ گنا زیادہ تیز رفتار سے عیسائیت اس ملک میں پھیل رہی ہے اور اس وقت ہندوستانی عیسائیوں کی تعداد دس لاکھ کے قریب پہنچ چکی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس عظیم الشّان امر کا سبب کہ ہر جگہ عیسائیوں کی جماعت ایسی تیز رفتاری سے پھیل رہی ہے کہ جتنی قرونِ اولیٰ کے بعد کبھی نہیں پھیلی ـــ میں اور آپ اس کا حقیقی سبب جانتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ خداوند کی رُوح حرکت میں ہے۔ پہلے کی طرح اب بھی خداوند اپنے نام کو عظمت دے رہا ہے اور وہ ہمارے چرچ کو اُن لوگوں سے وُسعت دے رہا ہے جو نجات چاہتے ہیں۔ انجیل کے پیغام کی قدیم طاقت ابھی تک موجود ہے۔ اب بھی رسُولوں کے زمانہ کی طرح خدا کا کلام زبردست نشو و نما کی طاقت رکھتا ہے اور اس کا غلبہ ہو رہا ہے۔" [2]

امریکہ سے مشہور عیسائی منّاد ڈاکٹر جان ہنری بیرّوز کو ہندوستان بلوایا گیا۔ وہ انگریزی زبان کے بڑے فصیح البیان مقرر تھے۔ انہوں نے ۱۸۹۶ء میں برِصغیر کا طوفانی دَورہ کر کے جگہ جگہ لیکچر دیئے اور ان لیکچروں میں عیسائیت کے عالمگیر غلبہ کا وہ ڈھنڈورا پیٹا کہ آسمان سر پر اٹھا لیا۔ انہوں نے اپنے ایک لیکچر میں عیسائیت کے غلبہ و استیلاء کا ذکر کرتے ہوئے بڑے طمطراق سے اعلان کیا :۔

"آسمانی بادشاہت پورے کرّہ ارض پر محیط ہوتی جا رہی ہے۔ آج دنیا بھر میں اخلاقی اور فوجی طاقت، علم و فضل، صنعت و حرفت اور تمام تر تجارت

---

[1] خط شکاگو۔ مرقومہ پادری عماد الدین لاہز، ۸ر فروری ۱۸۹۲ء۔ مطبوعہ نیشنل پریس امرتسر ۱۸۹۲ء

[2] "دی مشنز" مصنفہ آر۔ کلارک، مطبوعہ لنڈن صـ۲۳۴

اِن اقوام کے ہاتھ میں ہے جو آسمانی الوہت اور انسانی اخوت کی مسیحی تعلیم پر ایمان رکھتے ہوئے یسوع مسیح کو (اپنا نجات دہندہ) تسلیم کرتی ہیں۔"[1]

اسی لیکچر میں آگے چل کر انہوں نے ایک برطانوی ادیب کے حوالہ سے عیسائیت کے غلبہ و استیلاء کا نقشہ نہایت درجہ فخریہ انداز اور تعلّی آمیز الفاظ میں کھینچتے ہوئے کہا:۔

"دنیائے عیسائیت کا عروج اس درجہ زندہ حقیقت کی صورت اختیار کر چکا ہے کہ ایسا درجۂ عروج اسے اس سے پہلے کبھی نصیب نہ ہوا تھا۔ ذرا ہماری ملکۂ عالیہ (ملکہ وکٹوریہ) کو دیکھو جو ایک ایسی سلطنت کی سربراہ ہے جس پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا۔ دیکھو وہ ناصرہ کے مصلوب کی خانقاہ پر کمال درجہ تابعداری سے احتراماً جھکتی اور خراجِ عقیدت پیش کرتی ہے!

یا پھر گاؤں کے گرجا میں جا کر نظر دوڑاؤ اور دیکھو کہ وہ سیاسی مدبّر (وزیر اعظم برطانیہ) جس کے ہاتھوں میں ایک عالمگیر سلطنت اور اس کی قسمت کی باگ ڈور ہے۔ جب یسوع مسیح کے نام پر دعا کرتا ہے تو کیسی عاجزی اور انکساری سے اپنا سر جھکاتا ہے!

دیکھو جرمنی کے نوجوان قیصر کو جب وہ خود اپنے لوگوں کے لئے بطور پادری فرائض سرانجام دیتا اور یسوع مسیح کے مذہب یعنی دینِ عیسائیت سے اپنی وفاداری کا اظہار کرتا ہے۔ مشرقی انداز پر ماسکو کے شاہانہ ٹھاٹھ باٹ میں زارِ روس کو دیکھو کہ تاج پوشی کے وقت ابنِ آدم کے طشت میں رکھ کر اسے تاج پیش کیا جاتا ہے۔ یا پھر مغربی جمہوریت (امریکہ) کے ایک صدر کے بعد دوسرے صدر کو دیکھو کہ ان میں سے ہر ایک عبادت کے نسبتاً سادہ لیکن عمیق اسلوب میں ہمارے خداوند کے ساتھ اپنی وفاداری اور تابعداری کا اظہار کرتا چلا جاتا ہے۔

امریکی، برطانوی، جرمن اور روسی سلطنتوں کے حکمران اقرار کرتے ہیں، کیا ان سب کے زیرِ نگیں علاقے مل کر ایک ایسی وسیع و عریض سلطنت کی حیثیت نہیں رکھتے کہ جس کے آگے ازمنۂ قدیم کی بڑی سے بڑی سلطنت

---

[1] بیروز لیکچرز صفحہ ۱۹

بھی سراسر بے حیثیت نظر آنے لگتی ہے ؟" [1]

عیسائی سلطنت کے دبدبہ و حکومت اور ان میں عیسائیت کے غلبہ و استیلاء کا نہایت پُرشکوہ الفاظ میں نقشہ کھینچنے کے بعد ڈاکٹر بیروز نے خاص اسلامی ملکوں میں بھی عیسائیت کی روز افزوں ترقی کا بڑے فاتحانہ انداز میں ذکر کیا اور کہا :-

"اب میں اسلامی ملکوں میں عیسائیت کی روز افزوں ترقی کا ذکر کرتا ہوں :- اس ترقی کے نتیجہ میں صلیب کی چمکار اگر ایک طرف لبنان پر جلوہ فگن ہے تو دوسری طرف فارس کے پہاڑوں کی چوٹیاں اور باسفورس کا پانی اس کے نور سے جگمگ جگمگ کر رہا ہے۔ یہ صورتِ حال اس آنے والے انقلاب کا پیش خیمہ ہے جب قاہرہ، دمشق اور تہران خداوند یسوع مسیح کے خدام سے آباد نظر آئیں گے، حتّٰی کہ صلیب کی چمکار صحرائے عرب کے سکوت کو چیرتی ہوئی خداوند یسوع مسیح کے شاگردوں کے ذریعہ مکہ اور خاص کعبہ کے حرم میں داخل ہوگی اور بالآخر وہاں صداقت کی منادی کی جائے گی کہ ابدی زندگی یہ ہے کہ وہ تجھ حقیقی اور واحد خدا کو اور یسوع مسیح کو جانیں جس کو تُو نے بھیجا ہے۔" [2]

---

[1] بیروز لیکچرز صفحہ ۱۹-۲۰

[2] بیروز لیکچرز صفحہ ۴۲

ہندوستان سے اسلام کو مٹانے کے ہندو منصوبے

شری سمرتھ رامداس سوامی برہمن نے بقول لالہ لاجپت رائے " سیواجی کو بار بار اسلام کے خلاف جنگ کرنے کا اُپدیش کیا۔" [1] اور اسی برہمن دیوتا کے اپدیشوں کا نتیجہ تھا کہ سیواجی اسلام اور اہلِ اسلام کی دشمنی میں انتہائی ترقی کر گیا' جس کا پتہ خود اُس کے ایک خط سے مل جاتا ہے جو اس نے راجہ جے سنگھ کو لکھا تھا۔ تحریر کیا کہ :-

> "میری تلوار مسلمانوں کے خُون کی پیاسی ہے۔ افسوس! صد ہزار افسوس!! کہ یہ تلوار مجھے ایک اور مہم کے لئے میان سے نکالنی پڑی۔ اسے مسلمانوں کے سَروں پر بجلی بن کر گرنا چاہیئے تھا جن کا نہ کوئی مذہب ہے اور نہ جنہیں انصاف کرنا آتا ہے ... میری بادلوں کی طرح گرجنے والی فوجیں مسلمانوں پر تلواروں کا وہ خونی مینہ برسائیں گی کہ دکن کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک سارے مسلمان اس سیلابِ خُون میں بہہ جائیں گے اور ایک مُسلمان کا نشان بھی باقی نہ رہے گا۔"

اس خط کو نقل کرنے کے بعد مسٹر اے۔ کے۔ سوریہ' بی۔ اے۔' ایل۔ ایل۔ بی وکیل خود بھی رقمطراز ہیں کہ :-

> "سیواجی کے یہ الفاظ اسے اپنے اصل رنگ میں ظاہر کر رہے ہیں۔ وہ اسلام کو مٹا کر اس ملک کا عام مذہب ہندو دھرم کو بنانا چاہتا تھا اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہی تھا کہ مسلمانوں کو حوالۂ شمشیر و آتش کر کے ہندوستان سے ان کا نام و نشان مٹا دے۔" [2]

مسلمانوں کے خلاف سیواجی نے جس خطرناک اور انتہائی غضب ناک تحریک کا آغاز کیا تھا' وہ مسلمانوں کو بحیثیتِ قوم مغلوب و مقہور کرنے سے تعلق رکھتی تھی۔ بعد کے زمانوں میں اگرچہ اس کی

---

[1] سیواجی اُردو صہ۴۴

[2] منقول از اخبار الجمعیتہ دہلی' جون ۱۹۲۶ء

شکلیں بدلتی رہیں لیکن عملاً سیواجی کی رُوح ہی ہر اُس ہندو تحریک کے اندر کارفرما نظر آتی ہے جو مسلمانوں کی سیاسی بیخ کنی اور اقتصادی استحصال کا مقصد لیے ہوتے تھی۔

اس سیاسی حملہ کے پہلو بہ پہلو مذہبِ اسلام کی بیخ کنی کا مقصد لیے ایک انتہائی خطرناک مذہبی تحریک بھی جاری ہوتی جسے ہم آریہ سماج کے نام سے جانتے ہیں۔ ان دونوں تحریکوں کا موازنہ کرتے ہوئے مہاشہ فضل حسین صاحب رقمطراز ہیں:-

"سمرتھ رامداس اور سیواجی مرہٹہ کا خواب پورا کرنے کے لئے جس قسم کی تحریک مہاتما تلک نے جاری کی، اُسی طور کی تحریک سوامی دیانندجی نے بھی چلائی۔ ان دونوں کا نصب العین ایک ہی تھا مگر طریق کار میں کسی قدر اختلاف تھا۔ اوّل الذکر تحریک زیادہ تر سیاسی لائنوں پر چلائی گئی، مگر آخر الذکر کو مذہبی رنگ دیا گیا اور یہی وجہ ہے کہ سوامی صاحب کی تحریک زیادہ وسیع، زیادہ منظم، زیادہ مضبوط، زیادہ مؤثر اور زیادہ کامیاب ہوئی۔ سوامی صاحب بھی وہی کچھ چاہتے تھے جو تلک مہودے کا اُپدیش تھا، مگر تلک کی تحریک مہاراشٹرا اور بنگال وغیرہ تک ہی محدود رہی اور سوامی صاحب کی تحریک سارے ملک میں پھیلی اور بارآور ہوئی، کیونکہ اس پر جس قسم کا رنگ چڑھایا گیا تھا وہ جہاں جدید الخیال ہندوؤں کو اپیل کرتی تھی وہاں قدامت پسند ہندو بھی اس سے متاثر ہوتے تھے۔"[1]

خود ہندو مورخین کی رائے میں آریہ سماج کے قیام کا واحد مقصد ہندوستان سے اسلام کو ملیامیٹ کرنا اور مکمل ہندو راج کا قیام تھا۔ چنانچہ لالہ دھنپت رائے بی۔ ایل۔ ٹی لکھتے ہیں:-

"ہندوستان میں سوائے ہندو راج کے دوسرا راج ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتا۔ ایک دن آئے گا کہ ہندوستان کے سب مسلمان شُدھی آدی اندولن کی وجہ سے آریہ سماجی ہو جائیں گے۔ یہ بھی ہندو بھائی ہیں۔ آخر صرف ہندو ہی رہ جائیں گے۔ یہ ہمارا آدرش (نصب العین) ہے۔ یہ ہماری آشا (تمنا) ہے سوامی جی مہاراج نے آریہ سماج کی بنیاد اسی اصول کو لے کر ڈالی تھی"[2]

---

[1] ہندو راج کے منصوبے حصہ اوّل صفحہ ۹۴ [2] اخبار پرکاشس لاہور ۲۶ اپریل ۱۹۲۵ء صفحہ ۱۱

احمدیّت کا مختصر تعارف

اسلام کے لئے فکروں اور رنجوں اور پریشانیوں کا یہ وہ زمانہ تھا جس میں احمدیت کا نُور طلوُع ہوا اور اسلام کے احیائے نَو کی ایک عظیم تحریک منصّۂ شہود پر اُبھری۔ اس تحریک کے بانی حضرت مرزا غلام احمد علیہ السلام ۱۸۳۵ء میں قادیان کی ایک گمنام بستی میں پیدا ہوئے جو مشرقی پنجاب کے ضلع گورداسپور میں بٹالہ سے بارہ میل مشرق میں واقع ہے۔ بچپن ہی سے آپ کو اسلام اور بانیٔ اسلامؐ سے ایک بے پناہ خداداد عشق تھا اور عبادتِ الٰہی کا ذوق دل میں جاگزیں تھا۔ مسجد سے آپ کو ایسی محبت تھی کہ بسا اوقات جب آپ کے والد سے آپ کے متعلق پوچھا جاتا کہ آپ کہاں ہوں گے تو وہ جواب دیتے کہ مسجد میں جا کر دیکھو کسی صف میں لپٹا پڑا ہوگا۔

عبادتِ الٰہی کے ذوق کے علاوہ بنی نوع انسان کی گہری ہمدردی بھی بچپن ہی سے آپ کے کردار کا نمایاں حصہ تھی چنانچہ آپ کے سوانح نگار ہمیں بتاتے ہیں کہ اپنا کھانا اکثر گھر سے باہر لے جاتے اور غرباء اور مساکین کو اس میں شریک کر لیتے' یہاں تک کہ بعض ایّام میں سارا کھانا غرباء کو کھلا کر خود پیسے دو پیسے کے چنے خرید کر اس سے بھوک مٹا لیتے۔ آپ کی بعد کی زندگی میں یہی دو کردار نمایاں ہو کر اُبھرے جو آپ کی زندگی کے عظیم مشن کی حیثیت اختیار کر گئے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں :-

> "میں دو ہی مسئلے لے کر آیا ہوں۔ اوّل خدا کی توحید اختیار کرو۔ دوسرے آپس میں محبّت اور ہمدردی ظاہر کرو۔ وہ نمونہ دکھلاؤ کہ غیروں کے لئے کرامت ہو یہی دلیل تھی جو صحابہؓ میں پیدا ہوئی تھی۔ كُنْتُمْ اَعْدَاءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ یاد رکھو تالیف ایک اعجاز ہے۔" [۱]

آغازِ جوانی ہی میں آپ نے شدّت سے یہ محسوس کیا کہ اسلام چاروں طرف سے دشمن کے نرغے میں گھرا ہوا ہے اور اس کے دفاع کی کوئی مؤثر کوشش اہلِ اسلام کی طرف سے نہیں کی جارہی۔ اس احساس کے نتیجہ میں دو قوی ردِّعمل آپ کے دل میں پیدا ہوتے۔ اوّل یہ کہ آپ پہلے سے بھی زیادہ انہماک اور دردمندی کے ساتھ عبادتِ الٰہی میں مصروف ہو گئے اور بارگاہِ ربّ العزّت میں جُھک کر اسلام کی فتح مندی

---

[۱] ملفوظات جلد دوم صـ ۴۸

اور احیائے نَو کے لئے گریہ وزاری کرنے لگے۔

دوسرا ردِّعمل یہ تھا کہ قرآن کریم کے گہرے اور پُر فکر مطالعہ کے ساتھ ساتھ دیگر مذاہبِ عالَم کا بھی گہری نظر سے مطالعہ فرمانے لگے اور اُن کی طرف سے اسلام پر وارد ہونے والے اعتراضات کا جائزہ لینے لگے۔ اس لمبے اور دقیق موازنہ اور مطالعہ نے آپ کو پہلے سے بھی زیادہ اس یقین پر قائم کر دیا کہ تمام مذاہبِ عالَم میں صرف اسلام ہی ایک زندہ مذہب ہے جو پیروی کے لائق اور جامع کمالاتِ حسنہ ہے اور کُل عالَم اور تمام زمانوں کے لئے ہدایت کا سامان رکھتا ہے جب کہ دیگر مذاہب بھی اگرچہ ابتداً خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے تھے مگر وہ محدود زمانوں کے لئے مخصوص اقوام کی ہدایت کے لئے نازل کئے گئے تھے اور اپنا اپنا مقصدِ وجود پورا کرنے کے بعد اب وہ بے ضرورت اور بے فیض ہو چکے تھے۔ ان کی کتابیں محرّف و مبدّل ہو گئیں، ان کی تعلیمات بگڑ گئیں، ان کا زمانۂ عمل ختم ہوا اور ان کی مثال بچپن کے ایسے بوسیدہ اور ناقابلِ استعمال کپڑوں کی طرح ہے جو بالغ انسان کی ضروریات کسی طرح پُوری نہیں کر سکتے۔ مذاہبِ عالَم کے اس تفصیلی موازنہ کا ماحصل حضرت مرزا صاحب علیہ السلام کی بیسیوں تصانیف میں موقع اور محل کے مطابق پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح آپ کے منظوم کلام میں بھی اس تحقیق کا نچوڑ بڑے دلکش پیرائے میں ملتا ہے۔ جس کے چند نمونے ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں :-

نُورِ فرقاں ہے جو سب نُوروں سے اجلیٰ نکلا — پاک وہ جس سے یہ انوار کا دریا نکلا
حق کی توحید کا مُرجھا ہی چلا تھا پودا — ناگہاں غیب سے یہ چشمۂ اصفیٰ نکلا
یاالٰہی تیرا فرقاں ہے کہ اک عالَم ہے — جو ضروری تھا وہ سب اس میں مہیا نکلا
سب جہاں چھان چکے ساری دُکانیں دیکھیں — مئے عرفاں کا یہی ایک ہی شیشہ نکلا

[1]

ہر طرف فکر کو دوڑا کے تھکایا ہم نے — کوئی دیں دینِ محمدؐ سا نہ پایا ہم نے
کوئی مذہب نہیں ایسا کہ نشاں دکھلائے — یہ ثمر باغِ محمدؐ سے ہی کھایا ہم نے
ہم نے اسلام کو خود تجربہ کرکے دیکھا — نُور ہے نُور اٹھو دیکھو سنایا ہم نے
اور دینوں کو جو دیکھا تو کہیں نُور نہ تھا — کوئی دکھلائے اگر حق کو چھپایا ہم نے
تھک گئے ہم تو انہیں باتوں کو کہتے کہتے — ہر طرف دعوتوں کا تیر چلایا ہم نے

---

[1] براہین احمدیہ حصہ سوم صـ ۲۷۴ مطبوعہ ۱۸۸۲ء

آزمائش کے لئے کوئی نہ آیا ہر چند　　ہر مخالف کو مقابل پہ بلایا ہم نے
آؤ لوگو کہ یہیں نورِ خدا پاؤ گے　　لو تمہیں طورِ تسلّی کا بتایا ہم نے
آج ان نوروں کا اک زور ہے اس عاجز میں　　دل کو ان نوروں کا ہر رنگ دلایا ہم نے
جب سے یہ نور ملا نورِ پیمبر سے ہمیں　　ذات سے حق کی وجود اپنا ملایا ہم نے
مصطفیٰ پر ترا بے حد ہو سلام اور رحمت　　اس سے یہ نور لیا بارِ خدایا ہم نے
ربط ہے جانِ محمد سے مری جاں کو مدام　　دل کو وہ جام لبالب ہے پلایا ہم نے
اس سے بہتر نظر آیا نہ کوئی عالم میں　　لاجرم غیروں سے دل اپنا چھڑایا ہم نے
مَوردِ قہر ہوئے آنکھ میں اغیار کے ہم　　جب سے عشق اس کا تہِ دل میں بٹھایا ہم نے

؎

اس گہرے مطالعہ اور موازنۂ مذاہب کے بعد جس کی بعض جھلکیاں مندرجہ بالا اشعار میں ہمیں نظر آتی ہیں آپ اسلام کے ایک عظیم بطلِ جلیل کی حیثیت سے میدانِ عمل میں نکلے اور ہندومت اور عیسائیت کی طرف سے اسلام پر کئے جانیوالے اعتراضات کے نہایت مدلّل جوابات تحریر فرمانے میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔ آپ نے صرف دفاع پر ہی اکتفا نہ فرمایا بلکہ حملہ آور مذاہب پر شدید جوابی حملے بھی کئے جس کے نتیجہ میں تھوڑے ہی عرصہ میں اسلام کے ایک پہلوان کی حیثیت سے آپکا شہرہ ہندوستان کے طول وعرض میں پھیل گیا اور قادیان کے ایک گوشۂ تنہائی میں رہنے والا یہ نوجوان اُفقِ مذہب پر ایک روشن چمکتے ہوئے ستارے کی طرح طلوع ہوا۔

اسلام کی تائید میں جو عظیم لٹریچر آپ نے پیدا کیا اس کی تعداد ۸۰ ضخیم کتب و رسائل سے تجاوز کر گئی۔ دیگر سینکڑوں اشتہارات اور مضامین ان کے علاوہ ہیں، لیکن اس ضمن میں آپ کی سب سے پہلی اور بنیادی حقائق پر مشتمل تصنیف "براہین احمدیہ" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ ایک معرکۃ الآراء اور انقلاب انگیز تصنیف تھی جس نے یکسر میدانِ جہاد کا نقشہ پلٹ کر رکھ دیا اور مذاہب کے مابین لڑی جانے والی قلمی جنگ میں ایک نئے علمِ کلام کا اضافہ کیا۔

اس تصنیف کا غیر معمولی اثر اپنوں اور غیروں پر پڑا۔ جہاں دشمن سخت ہراساں اور پریشاں ہوا وہاں دوستوں کے دل خوشی سے بلّیوں اُچھلنے لگے کہ اسلام کا ایک بطلِ جلیل میدانِ مبارزت میں نکل آیا ہے۔ مسلمانوں کے بجھتے ہوئے دلوں میں اُمید کی نئی شمعیں روشن ہونے لگیں۔ ملک کے طول وعرض میں براہینِ احمدیہ کے محاسن اور کمالات پر زور دار تبصرے لکھے گئے جن میں مشہور اہلحدیث لیڈر مولوی ابوسعید

؎ آئینہ کمالاتِ اسلام ص ۲۲۴ مطبوعہ ۱۸۹۳ء

محمد حسین صاحب بٹالوی کا تبصرہ بہت شہرت رکھتا ہے اور جماعت احمدیہ کے لٹریچر میں بکثرت اس کا ذکر ملتا ہے۔

اسلام کے قلمی جہاد میں اس کتاب کی غیر معمولی عظمت کے پیش نظر اور اس بنا پر کہ دراصل تحریکِ احمدیت کا بیج اسی کتاب میں بویا گیا' ہم اس کتاب پر کئے جانے والے بعض مشہور تبصروں میں سے چند اقتباسات ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

مولوی ابوسعید محمد حسین صاحب بٹالوی نے اپنے رسالہ اشاعۃ السنہ جلد ہفتم نمبر ۶-۱۱ میں لکھا:

"ہماری رائے میں یہ کتاب اس زمانہ میں اور موجودہ حالت کی نظر سے ایسی کتاب ہے جس کی نظیر آج تک اسلام میں تالیف نہیں ہوئی اور آئندہ کی خبر نہیں۔ لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا - اور اس کا مؤلف بھی اسلام کی مالی وجانی وقلمی ولسانی وحالی وقالی نصرت میں ایسا ثابت قدم نکلا ہے جس کی نظیر پہلے مسلمانوں میں بہت ہی کم پائی گئی ہے۔

ہمارے ان الفاظ کو کوئی ایشیائی مبالغہ سمجھے تو ہم کو کم سے کم ایک ایسی کتاب بتادے جس میں جملہ فرقہ ہائے مخالفینِ اسلام خصوصاً فرقہ آریہ وبرہم سماج سے ایسے زور شور سے مقابلہ پایا جاتا ہو اور دو چار ایسے اشخاص انصارِ اسلام کے نشاندہی کرے جنہوں نے اسلام کی جانی ومالی وقلمی ولسانی نصرت کے علاوہ حالی نصرت کا بھی بیڑہ اٹھالیا ہو اور مخالفینِ اسلام اور منکرینِ الہام کے مقابلہ میں مردانہ تحدی کے ساتھ یہ دعویٰ کیا ہو کہ جس کو وجودِ الہام کا شک ہو وہ ہمارے پاس آکر تجربہ ومشاہدہ کرے اور اس تجربہ ومشاہدہ کا اقوامِ غیر کو مزہ بھی چکھا دیا ہو۔"

---

(۲) براہینِ احمدیہ کے دوسرے تبصرہ نگار لدھیانہ کے مشہور اور باکمال صوفی مرتاض حضرت صوفی احمد جان صاحب رضی اللہ عنہ تھے جو رتڑ چھتڑ (گورداسپور) میں بارہ چودہ برس تک سلوک کی منازل طے

کرنے کے بعد دعوتِ رُشد و ہدایت کی اجازت لے کر لدھیانہ محلہ جدید میں دُھونی رمائے بیٹھے تھے اور جن کے عقیدت مندوں کا حلقہ دُور دُور تک بڑی سُرعت سے پھیل رہا تھا اور ان کے رُوحانی کمالات اور توجہ کی برکات کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ اُن کی دینی عظمت کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ لدھیانہ کے بڑے بڑے علماء مثلاً مولوی محمد صاحب لدھیانوی وغیرہ ان کے خاص ارادتمندوں میں شامل تھے۔

حضرت صوفی صاحب رضی اللہ عنہ نے "اشتہار واجب الاظہار" کے نام سے نہایت والہانہ انداز میں ایک مفصل ریویو شائع کیا جس میں براہین احمدیہ کے متعلق بڑے پُرشوکت اور دلآویز الفاظ میں اپنے تاثرات سپردِ قلم کئے۔ حضرت صوفی صاحب موصوف لکھتے ہیں:-

"اس چودھویں صدی کے زمانہ میں کہ ہر ایک مذہب و ملّت میں ایک طوفانِ بدتمیزی برپا ہے بقول شخصے 'کافر نتے نتے ہیں مسلماں نتے نتے' ایک ایسی کتاب اور ایک ایسے مجدّد کی بے شک ضرورت تھی جیسی کہ براہین احمدیہ اور اس کے مؤلف مخدومنا مولانا میرزا غلام احمد صاحب دام فیوضہٗ ہیں۔ جو ہر طرح سے دعویٰ اسلام کو مخالفین پر ثابت فرمانے کیلئے موجود ہیں۔ جناب موصوف عامی علماء اور فقراء میں سے نہیں، بلکہ خاص اس کام پر منجانب اللہ مامور اور ملہم اور مخاطبِ الٰہی ہیں۔ صدہا سچے الہام اور مخاطبات اور پیشگوئیاں اور رویاء صالحہ اور امرِ الٰہی اور اشارات اور بشارات اجراء کتاب اور فتح و نصرت اور ہدایات امداد کے باب میں زبان عربی، فارسی، اُردو، انگریزی وغیرہ میں ہیں، حالانکہ مصنف صاحب نے ایک لفظ انگریزی کا نہیں پڑھا... صاف ظاہر ہوتا ہے بموجب حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے عن ابی ھریرۃ قال فیما اعلم عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ان اللّٰہ عزّ وجلّ یبعث لھذہ الامۃ علی راس کل مائۃ سنۃ من یجدّد لھا دینھا (رواہ ابو داؤد) مصنف صاحب اس چودھویں صدی کے مجدّد اور مجتہد اور محدّث اور کامل مکمل افرادِ امّت میں سے ہیں۔ اس دوسری حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم یعنی علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل اسی کی تائید میں ہے۔ اس موقعہ پر چند اشعار فارسی اس کتاب کے لکھتا ہوں جن کو پڑھکر ناظرین خود جناب ممدوح کا مرتبہ دریافت فرمالیں گے اور یقین ہے کہ خلوصِ دل

اور صدقِ عقیدت سے یہ شعر زبانِ حال سے فرماویں گے کہ ؎

سب مریضوں کی ہے تمہیں پہ نگاہ
تم مسیحا بنو خدا کے لئے

سن شریف حضرت کا قریباً چالیس یا پنتالیس ہوگا۔ اصل وطن اجداد کا ملک فارس معلوم ہوتا ہے۔ نہایت خلیق، صاحبِ مروّت و حیا، نوجوان رعنا چہرہ سے محبّتِ الٰہی ٹپکتی ہے۔ اے ناظرین! میں سچی نیت اور کمال جوشِ صداقت سے التماس کرتا ہوں کہ بے شک وشبہ جناب میرزا صاحب موصوف مجدّدِ وقت اور طالبانِ سلوک کے لئے کبریتِ احمر اور سنگدلوں کے واسطے آفتاب اور گمراہوں کے لئے خضر اور منکرینِ اسلام کے واسطے سیف قاطع اور حاسدوں کے واسطے حجۃ بالغہ ہیں۔ یقین جانو کہ پھر ایسا وقت ہاتھ نہ آئے گا۔ آگاہ ہو کہ امتحان کا وقت آگیا ہے اور حُجّتِ الٰہی قائم ہو چکی ہے اور آفتاب عالمتاب کی طرح بدلائل قاطعہ ایسا ہادیٔ کامل بھیج دیا ہے کہ سچّوں کو نُور بخشے اور ظلمات و ضلالت سے نکالے اور جھوٹوں پر حجت قائم کرے“

---

(۳) براہین احمدیہ کے تیسرے تبصرہ نگار مولوی محمد شریف صاحب بنگلوری تھے جو مسلمانانِ ہند کے نہایت دیندار اور تقویٰ شعار صحافی اور مشہور مسلم اخبار ”منشورِ محمدیؐ“ بنگلور کے مدیر شہیر تھے۔ مولانا محمد شریف صاحب نے ”جَآءَ الْحَقُّ وَزَھَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَھُوْقًا“ کے عنوان سے اپنے مبسوط اور پُرزور تبصرے میں لکھا:-

”منافقوں اور دشمنوں کے سارے حملے دینِ اسلام پر ہو رہے ہیں۔ اِدھر دَھریہ پن کا زور، اُدھر لامذہبی کا شور۔ کہیں برہمو سماج والے اپنے مذہب کو فیلسوفانہ تقریروں سے دینِ اسلام پر غالب کیا چاہتے ہیں۔ ہمارے عیسائی بھائیوں کی پوری ہمت تو اسلام کے استیصال پر مصروف ہے اور ان کو اس بات کا یقین ہے کہ جب تک آفتابِ اسلام اپنی پُرتاب شعاعیں دنیا میں ڈالتا رہے گا تب تک عیسوی دین کی ساری کوششیں بیکار اور تثلیث تین تیرہ رہے گی۔ غرض سارے مذہب اور تمامی دین والے یہی چاہتے ہیں کہ کسی طرح دینِ اسلام

کا چراغ گل ہو ..... مدت سے ہماری آرزو تھی کہ علمائے اہلِ اسلام سے کوئی حضرت جن کو خدا نے دین کی تائیدانہ حمایت کی توفیق دی ہے کوئی کتاب ایسی تصنیف یا تالیف کریں جو زمانہ موجودہ کی حالت کے موافق ہو اور جس میں دلائل عقلیہ اور براہین نقلیہ قرآن کریم کے کلام اللہ ہونے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی ثبوتِ نبوّت پر قائم ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ آرزو بھی بر آئی۔ یہ وہی کتاب ہے جس کی تالیف یا تصنیف کی مدت سے ہم کو آرزو تھی۔ براہین احمدیہ ملقب بہ "البراھین الاحمدیہ علٰی حقیقۃ کتاب اللّٰہ القرآن ونبوۃ محمّدیہ" جس میں مصنّف زاد قدرہٗ اللّٰھم متع المسلمین بطول حیاتہٖ نے تین سو براہین قطعیہ عقلیہ سے حقیقتِ قرآن اور نبوّتِ محمّدیہ کو ثابت کیا ہے۔ افضل العلماء فاضل جلیل جرنیل فخرِ اہلِ اسلام ہند مقبول بارگاہ صمد جناب مولوی میرزا غلام احمد رئیس اعظم قادیان ضلع گورداسپور کی تصنیف ہے۔ سبحان اللہ! کیا تصنیف منیف ہے کہ جس سے دینِ حق کا لفظ لفظ سے ثبوت ہو رہا ہے۔ ہر ہر لفظ سے حقیقتِ قرآن ظاہر ہو رہی ہے۔ مخالفوں کو کیسے آب و تاب سے دلائلِ قطعیہ سُنائے ہیں! دعویٰ ہی مدلّل و براہینِ ساطعہ ثبوت ہے۔ مثبت بدلائلِ قاطعہ تاب دم زدنی نہیں، اقبال کے سوا چارہ نہیں۔ ہاں انصاف شرط ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔ ایھا الناظرین! یہ وہی کتاب ہے جو فی الحقیقت لاجواب ہے۔"[1]

(۴) دہلی کے نہایت فاضل علومِ شرقیہ سے باخبر عالم اُردو فارسی کے نامور شاعر نواب ضیاء الدین احمد خان صاحب (لوہارو) براہین احمدیہ کو دیکھتے ہی فریفتہ ہو گئے اور یہاں تک وارفتگی کا عالم ہوا کہ ہفتہ عشرہ میں پوری کتاب ختم کر کے دَم لیا اور فرمایا:۔

"نہایت اعلیٰ درجہ کی کتاب ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس کے مصنّف کو یا تو لوگ پاگل کہیں گے یا اس سے اگلی صدی کا مجدّد ہوگا۔"

اور اسی طرح اُن کے نواسے اور ملک کے نامور شاعر ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد صاحب سائل

[1] 'منشور محمدی' بنگلور۔ ۲۵ رجب المرجب ۱۳۰۰ھ صفحہ ۲۱۶ و ۲۱۷

نے اسے بڑی معرکے کی کتاب قرار دیا۔[1]

۵- ایک مشہور سکھ لیڈر ارجن سنگھ صاحب ایڈیٹر "رنگین" امرتسر لکھتے ہیں :-

"اُس وقت . . . گھر گھر براہینِ احمدیہ کا چرچا تھا اور تمام پڑھے لکھے مسلمان اِس کتاب کے مطالعہ کو ضروری سمجھتے تھے کیونکہ مسلمان عالموں کا خیال تھا کہ اس کتاب میں آریہ اور عیسائیوں کے تمام اعتراضوں کا جواب آچکا ہے۔ ہر ایک مسلمان مناظر اِس کتاب کو ایک نظر دیکھ لینا ضروری خیال کرتا تھا۔ الغرض اس کتاب کی تصنیف کی وجہ سے جہاں میرزا صاحب ایک طرف ہندوستان کے مسلمانوں کی آنکھ کا تارا بن گئے وہاں آپ کو عیسائیوں اور آریوں میں بھی کافی شہرت حاصل ہو گئی۔"[2]

---

[1] الحکم ۱۴؍مارچ ۱۹۳۷ء [2] "خلیفہ قادیان" صفحہ ۵ از ارجن سنگھ صاحب مدیر اخبار "رنگین" امرتسر

ماموریت کا دعویٰ اور
جماعتِ احمدیہ کا باقاعدہ قیام

براہینِ احمدیہ کی اشاعت تک حضرت مرزا غلام احمد علیہ السلام کی زندگی کا دَور اگرچہ سراپا خدمتِ اسلام کے لئے وقف تھا، تاہم آپؑ کی یہ خدمت ایک انفرادی حیثیت رکھتی تھی اور نہ تو آپؑ علماء کے کسی گروہ کے نمائندہ تھے نہ کسی مُسلم سوسائٹی کی طرف سے مقرر تھے۔ اسی طرح اگرچہ براہینِ احمدیہ میں آپؑ کے الہامات اور رویاء و کشوف درج ہیں جن سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اللہ تعالیٰ آپؑ کو بحیثیت مامُور خدمتِ اسلام کا فریضہ سونپنے کا ارادہ فرما چکا ہے لیکن اس وقت تک ماموریت کا دعویٰ کرنے اور بیعت لے کر خدمتِ اسلام کے لئے کسی علیحٰدہ جماعت کے قیام کے متعلق کوئی قطعی ارشادِ خُداوندی نازل نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا معتقدین کی خواہش اور بارہا اصرار کے باوجود آپ بیعت لے کر ایک جماعت کے قیام پر آمادہ نہ ہوتے اور خواہش کرنے والوں کو ہمیشہ یہی جواب دیتے رہے کہ ابھی اللہ جلّ شانہٗ کی طرف سے بیعت لینے کا حکم نازل نہیں ہُوا۔ ۱۸۸۹ء میں پہلی بار آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیعت لے کر اسلام کی خدمت پر مامُور مخلصین کی ایک جماعت تیار کرنے کا ارشاد ہُوا۔ چنانچہ مارچ ۱۸۸۹ء میں لُدھیانہ کے مقام پر آپؑ نے بیعت لے کر باقاعدہ جماعتِ احمدیہ کی بنیاد ڈالی۔ اس تاریخی بیعت میں چالیس مخلص معتقدین کو شمولیت کا شرف حاصل ہُوا۔

بیعت کے ذریعہ مسلمانوں میں ایک علیحٰدہ جماعت کے قیام سے حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ علیہ السلام کا جو مقصد تھا اور بیعت کے ذریعہ جماعت میں شامل ہونے والوں سے آپؑ نے جو توقعات وابستہ فرمائیں اُن کی ایک جھلک آپؑ کے حسبِ ذیل الفاظ میں دکھائی دیتی ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:۔

> "وہ ایسے قوم کے ہمدرد ہوں کہ غریبوں کی پناہ ہو جائیں، یتیموں کے لئے بطور باپوں کے بن جائیں اور اسلامی کاموں کے انجام دینے کے لئے عاشق زار کی طرح فِدا ہونے کو تیار ہوں اور تمام تر کوشش اس بات کے لئے کریں کہ ان کی عام برکات دنیا میں پھیلیں اور محبّتِ الٰہی اور ہمدردیٔ بندگانِ خُدا کا پاک چشمہ ہر یک دل سے نکل کر اور ایک جگہ اکٹھا ہو کر ایک دریا کی صُورت

میں بہتا ہوا نظر آوے .... خدا تعالیٰ نے اس گروہ کو اپنا جلال ظاہر کرنے کے لئے اور اپنی قدرت دکھلانے کے لئے پیدا کرنا اور پھر ترقی دینا چاہا ہے تا دنیا میں محبتِ الٰہی اور توبہ نصوح اور پاکیزگی اور حقیقی نیکی اور امن اور صلاحیت اور بنی نوع کی ہمدردی کو پھیلا دے۔ سو یہ گروہ اس کا ایک خالص گروہ ہوگا اور وہ انہیں آپ اپنی رُوح سے قوت دے گا اور انہیں گندی زیست سے صاف کرے گا اور اُن کی زندگی میں ایک پاک تبدیلی بخشے گا اور وہ جیسا کہ اُس نے اپنی پاک پیشین گوئیوں میں وعدہ فرمایا ہے اس گروہ کو بہت بڑھائے گا اور ہزارہا صادقین کو اس میں داخل کرے گا۔ وہ خود اس کی آب پاشی کرے گا اور اس کو نشو و نما دے گا یہاں تک کہ اُن کی کثرت اور برکت نظروں میں عجیب ہو جائے گی۔ اور وہ اس چراغ کی طرح جو اونچی جگہ رکھا جاتا ہے دُنیا کی چاروں طرف اپنی روشنی کو پھیلائیں گے اور اسلامی برکات کے لئے بطور نمونہ کے ٹھہریں گے۔ وہ اس سلسلہ کے کامل متبعین کو ہر یک قسم کی برکت میں دوسرے سلسلہ والوں پر غلبہ دے گا اور ہمیشہ قیامت تک اُن میں سے ایسے لوگ پیدا ہوتے رہیں گے جن کو قبولیت اور نصرت دی جائے گی۔ اس ربِّ جلیل نے یہی چاہا ہے۔ وہ قادر ہے، جو چاہتا ہے کرتا ہے ہر یک طاقت اور قدرت اُسی کو ہے۔"[1]

---

[1] مجموعہ اشتہارات حضرت مسیح موعود علیہ السلام جلد اوّل صفحہ ١٩٧-١٩٨ مطبوعہ ١٩٧١ء ناشر الشرکۃ الاسلامیہ ربوہ

وفاتِ مسیح ناصریؑ کا وَلولہ خیز اعلان

اور مسیحیّت کا دعوےٰ

۱۸۹۰ء کا سال تاریخِ احمدیت میں ایک عظیم سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وہ سال ہے جس میں اللہ تعالیٰ سے خبر پا کر حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ علیہ السلام نے یہ حیرت انگیز انکشاف فرمایا کہ مسیح ناصری علیہ السلام، جن کو اس زمانے کے مسلمان اور عیسائی دونوں ہی آسمان پر زندہ رونق افروز تسلیم کرتے تھے، طبعی موت سے وفات پا چکے ہیں اور وہ مسیح جس کے دوبارہ نازل ہونے کا وعدہ دیا گیا تھا، وہ خود حضرت مرزا غلام احمد علیہ السلام ہی ہیں۔ آپ کا یہ اعلان اس الہامِ الٰہی کے نتیجہ میں تھا کہ:

> "مسیح ابن مریم رسُول اللہ فوت ہو چکا ہے اور اُس کے رنگ میں ہو کر وعدہ کے موافق تُو آیا ہے۔"[۱]

اگرچہ اِس الہام سے قبل بھی آپؑ کو بارہا مسیح ناصری علیہ السلام کی وفات کی مختلف رنگ میں خبر دی جا چکی تھی اور بارہا آپؑ کو مسیح کے لقب سے یاد کیا گیا تھا مگر کچھ تو مسلمانوں کے رائج الوقت عقیدہ کی وجہ سے اور کچھ اپنی طبعی انکساری کے باعث آپؑ اِن الہامات اور القابات کو استعارہ قرار دیتے رہے۔ چنانچہ آپ اس ضمن میں تحریر فرماتے ہیں:۔

> "اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ مجھے اِن باتوں سے نہ کوئی خوشی ہے نہ کچھ غرض کہ میں مسیح موعود کہلاؤں یا مسیح ابنِ مریمؑ سے اپنے تئیں بہتر ٹھہراؤں۔ خدا نے میرے ضمیر کی اپنی اس پاک وحی میں آپ ہی خبر دی ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے قُلْ اُجَرِّدُ نَفْسِیْ مِنْ ضُرُوْبِ الْخِطَابِ۔ یعنی اُن کو کہہ دے کہ میرا تو یہ حال ہے کہ میں کسی خطاب کو اپنے لئے نہیں چاہتا۔ یعنی میرا مقصد اور میری مُراد اِن خیالات سے بَرتر ہے اور کوئی خطاب دینا یہ خدا کا فعل ہے، میرا اس میں دخل نہیں ہے۔ رہی یہ بات کہ ایسا کیوں لکھا گیا اور کلام

---

[۱] تذکرہ صفحہ ۱۸۳ طبع سوم ۱۹۶۹ء

میں تناقض کیوں پیدا ہو گیا۔ سو اس بات کو توجہ کر کے سمجھ لو کہ یہ اُسی قسم کا تناقض ہے کہ جیسے براھینِ احمدیہ میں مَیں نے یہ لکھا تھا کہ مسیح ابن مریمؑ آسمان سے نازل ہو گا، مگر بعد میں یہ لکھا کہ آنے والا مسیح میں ہی ہوں۔ اس تناقض کا بھی یہی سبب تھا کہ اگرچہ خدا تعالیٰ نے براہینِ احمدیہ میں میرا نام عیسیٰ رکھا اور یہ بھی مجھے فرمایا کہ تیرے آنے کی خبر خدا اور رسول نے دی تھی مگر چونکہ ایک گروہ مسلمانوں کا اِس اعتقاد پر جما ہوا تھا اور میرا بھی یہی اعتقاد تھا کہ حضرت عیسیٰؑ آسمان پر سے نازل ہوں گے، اس لئے میں نے خدا کی وحی کو ظاہر پر حمل کرنا نہ چاہا بلکہ اس وحی کی تاویل کی اور اپنا اعتقاد وہی رکھا جو عام مسلمانوں کا تھا اور اسی کو براہینِ احمدیہ میں شائع کیا۔ لیکن بعد اس کے اس بارہ میں بارش کی طرح وحی الٰہی نازل ہوئی کہ وہ مسیح موعود جو آنے والا تھا تُو ہی ہے۔ اور ساتھ اس کے صدہا نشان ظہور میں آئے۔ اور زمین و آسمان دونوں میری تصدیق کے لئے کھڑے ہو گئے۔ اور خدا کے چمکتے ہوئے نشان میرے پر جبر کر کے مجھے اس طرف لے آئے کہ آخری زمانہ میں مسیح آنے والا میں ہی ہوں، ورنہ میرا اعتقاد تو وہی تھا جو میں نے براہینِ احمدیہ میں لکھ دیا تھا۔ اور پھر میں نے اس پر کفایت نہ کر کے اس وحی کو قرآن شریف پر عرض کیا تو آیات قطعیۃ الدلالت سے ثابت ہوا کہ درحقیقت مسیح ابنِ مریم فوت ہو گیا ہے اور آخری خلیفہ مسیح موعود کے نام پر اِسی اُمت میں سے آئے گا اور جیسا کہ جب دن چڑھ جاتا ہے تو کوئی تاریکی باقی نہیں رہتی، اِسی طرح صدہا نشانوں اور آسمانی شہادتوں اور قرآن شریف کی قطعیۃ الدلالت آیات اور نصوصِ صریحہ حدیثیہ نے مجھے اس بات کے لئے مجبور کر دیا کہ مَیں اپنے تئیں مسیح موعود مان لوں۔ میرے لئے یہ کافی تھا کہ وہ میرے پر خوش ہو۔ مجھے اس بات کی ہرگز تمنا نہ تھی۔ میں پوشیدگی کے حُجرہ میں تھا اور کوئی مجھے نہیں جانتا تھا اور نہ مجھے یہ خواہش تھی کہ کوئی مجھے شناخت کرے، اس نے گوشۂ تنہائی سے مجھے جبراً نکالا۔ میں نے چاہا کہ میں پوشیدہ رہوں اور پوشیدہ مَروں مگر اس نے کہا کہ میں تجھے تمام دنیا میں عزت کے ساتھ

شہرت دُوں گا۔ پس یہ اس خدا سے پُوچھو کہ ایسا تُو نے کیوں کیا؟ میرا
اس میں کیا قصور ہے۔ اسی طرح اوائل میں میرا یہی عقیدہ تھا کہ مجھ کو مسیح
ابنِ مریمؑ سے کیا نسبت ہے۔ وہ نبی ہے اور خدا کے بزرگ مقربین میں سے
ہے۔ اور اگر کوئی امر میری فضیلت کی نسبت ظاہر ہوتا تو میں اس کو جزئی
فضیلت قرار دیتا تھا، مگر بعد میں جو خدا تعالیٰ کی وحی بارش کی طرح میرے
اوپر نازل ہوئی اُس نے مجھے اس عقیدہ پر قائم نہ رہنے دیا اور صریح طور پر
نبی کا خطاب مجھے دیا گیا مگر اس طرح سے کہ ایک پہلو سے نبی اور ایک
پہلو سے اُمتی"[1]

حضرت مسیح ناصری علیہ السلام کی وفات اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں ہی کسی اُمتی کے مقامِ مسیحیت پر فائز ہونے کا اعلان ایک عظیم دھماکہ بن کر مسلمان اور عیسائی دنیا میں زلزلہ برپا کر گیا۔ لیکن قبل اس کے کہ اس پہلو پر مزید کچھ روشنی ڈالی جائے، مناسب ہوگا کہ مختصراً اس انقلاب آفریں اعلان کا جائزہ لیا جائے۔ اس دعویٰ کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لینا اس لئے بھی اشد ضروری ہے کہ دراصل احمدیت کی حقیقت اسی دعویٰ کے گرد گھوم رہی ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں کو سمجھے بغیر احمدیت کا مزاج سمجھنا ممکن نہیں۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ احمدیت کا امتیازی نشان اسی عقیدہ میں مضمر ہے کہ:

"مسیح ابنِ مریم رسول اللہ فوت ہو چکے اور
وعدے کے موافق ان کے رنگ میں رنگین ہو
کر حضرت مرزا غلام احمد علیہ السلام مبعوث ہوئے"

اس ضمن میں حسبِ ذیل اہم سوالات چھان بین کے لائق نظر آتے ہیں:۔

(ا) کیا قرآن کریم اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی رُو سے حضرت مسیح ناصری علیہ السلام کا زندہ آسمان پر جانا اور تا حکمِ ثانی اپنے نزول کے انتظار میں وہیں قیام فرمانا ثابت ہے؟ اگر ایسا ہے تو حضرت مرزا صاحب کے مذکورہ بالا دعویٰ کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے؟

(ب) اگر قرآن و حدیث سے حضرت عیسےٰ علیہ السلام کی حیات کی بجائے وفات ثابت ہوتی ہو تو ان احادیثِ نبویہ کے کیا معنے لئے جائیں گے جن کے مطابق آخری

---

[1] رُوحانی خزائن جلد ۲۲ حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۵۲ تا ۱۵۴

زمانہ میں دجّال نے خرُوج کر کے دُنیا میں تباہی پھیلانی تھی اور حضرت مسیح ناصری علیہ السلام نے نازل ہو کر اُسے ہلاک کرنا، صلیب کو توڑنا، سُوٗروں کو قتل کرنا اور مسلمان کے درمیان ایک عادل منصف کے طور پر اُن کے اختلافات کا فیصلہ فرمانا تھا؟

(ج) حضرت مسیح ناصری علیہ السلام کے وصال کی خبر اُمّتِ محمدیّہ کے لئے ایک افسوسناک سانحہ کا حکم رکھتی ہے یا پُرمسرّت نوید کی؟ اور اس کے مخالف یا موافق کیا اثرات ظاہر ہو سکتے ہیں؟

اِن سوالات میں سے جُز الف کا جواب بہت طویل اور تفصیلی ہے۔ حضرت مرزا صاحب علیہ السلام نے قرآن کریم کی تیس آیات سے نیز بکثرت احادیث نبویّہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہایت قوی استدلال کے ساتھ یہ ثابت فرمادیا ہے کہ قرآن کریم اور حدیث نبویّہ کی رُو سے حضرت عیسےٰ علیہ السلام کا نہ صرف یہ کہ زندہ آسمان پر جانا ثابت نہیں بلکہ اس کے برعکس قطعی وفات ثابت ہوتی ہے۔ آپ کی مختلف کتب میں یہ یہ دلائل بکثرت بیان ہوئے ہیں، جن میں سے بالخصوص "نزول المسیح" اور "ازالہ اوہام" اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کرتی ہیں۔ حضرت مرزا صاحب نے صرف نقلی دلائل ہی کو پیش نہیں کیا بلکہ زبردست عقلی دلائل بھی اپنے دعویٰ کی تائید میں پیش فرماتے۔ اسی طرح آپؑ نے صرف اس دعویٰ پر ہی اکتفا نہ فرمائی کہ حضرت مسیحؑ آسمان کی طرف نہیں اٹھائے گئے بلکہ ان کا زیرِ زمین مدفون ہونا بھی ثابت فرمادیا۔ اس سلسلہ میں آپ کی معرکۃ الآرا تحقیق "مسیح ہندوستان میں" اس لائق ہے کہ ہر محقق گہری توجہ سے اس کا مطالعہ کرے۔ یہ تحقیق ایک حیرت انگیز تاریخی انکشاف ہے۔

جُزو 'ب' میں جو سوال اُٹھایا گیا ہے اس کا جواب بھی تفصیل کے ساتھ حضرت مرزا صاحب علیہ السلام نے اپنی مختلف کتب میں بڑے دلچسپ پیرایہ میں بیان فرمایا ہے جس کا خلاصہ قارئین کی دلچسپی کے لئے درج ذیل کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے خبر پاکر آپ نے دجّال کے خروج اور مسیح ابن مریمؑ کے نزول کی گتھیوں کو ایسے حسن پیرایہ میں سلجھایا کہ دِل عش عش کر اٹھتا ہے۔ آپ نے بتایا کہ دجّال کے خروج کی پیشگوئی ہو یا مسیح کے نزول کی، یہ دونوں ہی نہایت لطیف تمثیلات اور استعارات پر مشتمل ہیں جنہیں ظاہر پر محمول کر کے انسان حقیقت سے ہٹ کر بھٹک جاتا ہے۔ چنانچہ آپ کی پیش کردہ وضاحت کے مطابق وہ دجّال جس نے مسیح ابن مریمؑ کے نزول سے قبل خروج کرنا تھا، کوئی ایسا مافوق الفطرت دیو نہیں تھا جیسے ہم بڑی بوڑھی عورتوں کے قصّوں کہانیوں میں سنتے ہیں بلکہ اس سے مراد ایک ایسی قوم تھی جو اپنے انتہائی دجل اور دھوکہ آمیز

سیاست (DIPLOMACY) کے ذریعہ دنیا میں بڑا فتنہ پیدا کرنے والی تھی۔ پس اس تمثیلی انسان کو دیو ہیکل دکھانا اس فتنہ کی شدّت اور ہیبت کو ظاہر کرنے کے لئے تھا اور یہ بتانا مقصود تھا کہ اِس قوم کی طاقت کے سامنے دیگر قومیں پستہ قدبونوں کی طرح بے زور اور بے حیثیت ہوکر رہ جائیں گی۔ تمثیلی زبان میں اس عظیم پیشگوئی کی سب کڑیاں نہایت معنی خیز ہیں۔ مثلاً پیشگوئی کی رُو سے دائیں آنکھ کا بصارت سے محروم دکھایا جانا اور بائیں آنکھ کا بہت بڑی اور روشن دکھانا اس حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے تھا کہ یہ قوم روحانیت سے بالکل عاری ہوگی لیکن دُنیا کے معاملات میں بڑی تیز اور باریک نظر رکھنے والی ہوگی اور مادی قوانین کے مطالعہ سے غیر معمولی استفادہ کرے گی۔ اس طرح اس دجّال کی سواری یعنی عجوبہ روزگار گدھے کی جو تمثیل بیان کی گئی وہ بھی دراصل اس حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے ہے کہ دجّال کی قوم سائنس میں غیر معمولی ترقی کرے گی اور آگ اور پانی سے چلنے والی انتہائی تیز رفتار سواریاں ایجاد کرے گی اور انہی سواریوں کے ذریعے وہ ساری دُنیا پر غلبہ پائے گی۔

اس پہلو سے جب ہم دجّال کے گدھے کی مبیّنہ صفات پر غور کرتے ہیں تو صاف پتہ چل جاتا ہے کہ مغرب کی عیسائی اقوام نے جو سواریاں ایجاد کی ہیں، دجّال کے گدھے کی تصویر بعینہٖ اُن پر صادق آتی ہے مثلاً خوراک کے طور پر آگ اور پانی کا استعمال، انتہائی تیز رفتار ہونا، وسیع و عریض ہونا، سواریوں کا پیٹھ پر بیٹھنے کی بجائے پیٹ میں یعنی اندرونی سیٹوں پر سفر کرنا، روانگی سے قبل بلند آواز نکال کر مسافروں کو متنبہ کر دینا ـــــ یہ تمام علامتیں جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات میں دجّال کے گدھے کی بیان کی گئی تھیں، بتمامِ تفصیل مغرب کی عیسائی قوموں کی ایجاد کردہ سواریوں پر صادق آتی ہیں۔ ریل ہو یا سمندری جہاز دونوں کی خوراک آگ اور پانی، دونوں کی رفتار غیر معمولی تیز، دونوں کے مسافر پیٹ کے اندر، دونوں کا حجم عظیم، پھر مزید لُطف یہ کہ جیسا کہ احادیث نبویّہ میں بیان کیا گیا تھا، دونوں اپنے سفر پر روانہ ہونے سے قبل ایک خاص بلند آواز کے ذریعہ یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم روانہ ہونے والے ہیں۔

پس حضرت مرزا صاحب نے اللہ تعالیٰ سے علم پاکر ان آسمانی مُعمّوں کو حل فرمایا اور دنیا کو بتایا کہ کیا دجّال کی پیشگوئی اور کیا اس کو ہلاک کرنے والے مسیح کی آمد کی پیشگوئی ـــــ یہ سب استعارہ کی زبان تھی۔ پس کوئی منصف مزاج طالبِ حق یہ تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مسیح موعود کے نزول اور دجّال کے خروج سے متعلق حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی پیشگوئیوں کی تشریح فرماکر حضرت مرزا صاحب نے اسلام کی ایک نہایت عظیم الشان خدمت سر انجام دی ہے۔ قارئین کرام! ایک طرف آپ اس ظاہری منظر کو دیکھئے جو محض الفاظ کے ظاہری معنے قبول کرنے سے آنکھوں کے سامنے اُبھرتا ہے، دُوسری طرف اس

باطنی منظر کو دیکھیں جس پر سے حضرت مرزا صاحب نے تمثیل اور استعارہ کے پردے اٹھائے ہیں جہاں پہلے منظر کو دیکھ کر نظر گھبراتی اور عقل اسے حقیقت کے طور پر قبول کرنے سے انکار کرتی ہے وہاں دوسرا منظر کتنا دیدہ زیب اور عقل کے لئے قابلِ قبول ہے! اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کیسی عظمت دل میں بٹھاتا ہے کہ چودہ سو سال قبل ہی آج کے زمانہ کی نو ایجاد سواریوں کا نقشہ ہوبہو کھینچ کر رکھ دیا اور مغربی قوموں کے عالمگیر غلبہ کی خبر دے دی۔

"ج"۔ جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ وفاتِ مسیح کا اعلان اُمّتِ محمدیہ کے لئے مژدۂ جانفزا تھا یا اندوہناک خبر؟ ــــ تو ادنیٰ سے تدبّر سے بھی یہ بات معلوم ہوسکتی ہے کہ مسیح کی مَوت کا اعلان دراصل اسلام کی زندگی کا پیغام تھا۔ یہ خوشی سے اُچھلنے اور کُودنے کا وقت تھا نہ کہ شدّتِ غم سے سر پیٹنے کا۔ عیسائیت کے ہاتھ میں اسلام کے خلاف سب سے کاری حربہ مسلمانوں کا یہی غلط اعتقاد تھا۔ عیسائی پادریوں کے نزدیک حیاتِ مسیح اور رفع الی السّماء کے عقیدہ کے حسب ذیل طبعی نتائج مترتّب ہوتے تھے:

(۱) حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب مطالبہ کیا گیا کہ آسمان پر چڑھ کر اور پھر وہاں سے کتاب لاکر دکھائیں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ جواب دینے کی ہدایت کی: ــــ

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل : ۹۴)

یعنی اُن سے کہہ دے کہ میرا رب (ان بیہودہ باتوں کے اختیار کرنے سے) پاک ہے مَیں تو بشر رسول کے سوا کچھ نہیں گویا آسمان پر جانا بشریّت اور رسالت دونوں سے ارفع تر مقام کا متقاضی تھا۔ چونکہ مسیح نے یہ کام کرکے دکھا دیا لہٰذا آپ بشر اور رسول دونوں سے بلند تر تھے۔

(۲) آپ کی غیر طبعی طویل عمر آپ کی الٰہی صفات کی نشاندہی کرتی ہے۔

(۳) کسی رسُول کو خُدا نے سخت سے سخت تکلیف کے وقت بھی اپنی طرف نہیں اُٹھایا۔

(۴) آخری زمانہ میں اُمّتِ محمدیہ کو نئی زندگی بخشنے کے لئے آخر مسیح کی ضرورت پیش آئے گی پس مسیح محسن ثابت ہُوئے اور اُمّتِ محمدیہ زیرِ احسان۔ افضل وہی ہوگا جو محسن ہو۔

مسیحیوں کو مسلمانوں پر اس عقیدہ کی بناء پر جو منطقی غلبہ نصیب ہوتا ہے وہ مسلمانوں کیلئے شدید مضرات سے خالی نہیں تھا۔ اسی عقیدہ کے طفیل مسلمانوں کا ایک طبقہ تو آمدِ مسیح کی موہوم تمنا لئے خوابوں میں زندگی گزارنے لگا اور دُوسرا طبقہ اس کے ردِّعمل میں اسلام ہی سے بیزار ہوکر دُنیا کی طرف جُھک گیا یا احادیث کا منکر ہوکر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے فیوض کے ایک بڑے حصہ سے محروم ہوگیا۔ پس آخری اور قطعی اور صحیح فیصلہ وہی ہے جو حضرت مرزا صاحب نے فرمایا کہ مسیح کو مَرنے دو کہ اِسی میں اسلام کی زندگی ہے،

مسیح موعود کے نزول کی پیشگوئی اور اس کی لطیف تشریح

اگر مسیح ناصری علیہ السلام کی وفات قرآن وحدیث کی رُو سے نیز تاریخی اور عقلی دلائل کی روشنی میں قطعی طور پر ثابت ہو جائے تو لازماً اس مسیح کے نزول کی پیشگوئی کی کوئی معقول توجیہہ پیش کرنی ہوگی جس کی آمد کی خوشخبری اُمتِ محمدیہ کو دی گئی تھی اور نہ ان بکثرت اور متواتر احادیث کو رَدّ کرنا پڑے گا جن میں یہ پیشگوئیاں مذکور ہیں۔

جماعت احمدیہ کے سوا دیگر مسلمان اس مسئلہ پر دو گروہوں میں بٹے ہوئے ملتے ہیں۔

اوّل وہ سوادِ اعظم جو ان احادیث نبویّہ کو ان کے تواتر اور شہرت اور صحت کے پیشِ نظر رَدّ کرنے پر آمادہ نہیں۔ یہ گروہ جو زیادہ تر علماء اور عوام الناس پر مشتمل ہے حضرت مسیح ناصری علیہ السلام کو زندہ آسمان پر بیٹھا ہوا تسلیم کرنے پر مُصر ہے اور یقین رکھتا ہے کہ وہ ایک دن نازل ہو کر اپنے مفوّضہ فرائض سرانجام دیں گے۔

دُوسرا گروہ اہلِ قرآن، نیچریوں اور مغربی تعلیم سے متاثر ان مسلمانوں پر مشتمل ہے جو عقلاً مسیحِ ناصریؑ کا زندہ آسمان پر بیٹھے رہنا تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں۔ لہٰذا یہ لوگ اُن احادیثِ نبویہ کو ان کے تواتر اور صحت اور شہرت کے باوجود رَدّ کر دیتے ہیں اور کسی آنے والے مصلح کے امکان سے ہی چھٹکارا پا لیتے ہیں۔

پس جہاں اوّل الذکر گروہ (جو بھاری اکثریت میں ہے) ایسی بعید از قیاس امیدوں کی دُنیا میں بس رہا ہے جن کے پورا ہوتے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا، وہاں مؤخر الذکر اقلیت قنوطیت اور مایوسی کا شکار نظر آتی ہے اور کسی آسمانی مصلح کی آمد سے مایوس ہو کر اُمتِ مسلمہ کو اپنی بہبود اور بقاء کے لئے خود ہی ہاتھ پاؤں مارنے کی تلقین کرتی ہے۔ اس مکتبِ خیال کا رجحان زیادہ تر دنیاوی فلاح وبہبود اور سیاسی ترقی کی طرف ہے اور کوئی روحانی پیغام اُن کے پاس نہیں۔

مندرجہ بالا دونوں مکاتبِ خیال کے مابین حضرت مرزا غلام احمد علیہ السلام نے وحی الٰہی کے مطابق جو

مؤقف اختیار فرمایا وہ بیک وقت دِل و دماغ دونوں کو مطمئن کرنے والا ہے اور ایمان کو بھی اسی طرح رضامند کرتا ہے جیسے عقل کو۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ قرآن اور حدیث کے درمیان کوئی تفاوت پیدا نہیں ہونے دیتا بلکہ ایک کو دوسرے کا مؤید قرار دیتا ہے۔ اختصار کے ساتھ یہ مؤقف درج ذیل کیا جاتا ہے:

جس طرح خروجِ دجّال کی پیشگوئی معنی خیز تمثیلات پر مشتمل تھی اسی طرح نزولِ مسیح کی پیشگوئی بھی استعارہ کی زبان میں ہے۔ قتلِ دجّال سے مراد نہ تو کسی ایک دیو قامت مخلوق کا قتل کرنا تھا نہ کسرِ صلیب سے مُراد ظاہری صلیبوں کا توڑنا۔ اسی طرح قتلِ خنزیر سے بھی یہ مُراد نہ تھی کہ نعوذ باللہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نزول کے بعد دُنیا بھر کے سوّر مارتے پھریں گے۔ حتیٰ کہ خود مسیح سے مراد بھی پُرانے مسیح نہیں کیونکہ قرآن کریم واضح طور پر ان کی وفات کی خبر دیتا ہے۔ پس قرآن اور حدیث میں کوئی تناقض نہیں۔ قرآن جس مسیح کے مرنے کی خبر دیتا ہے وہ حقیقی مسیح تھا اور حدیث جس مسیح کے آنے کی خبر دیتی ہے وہ تمثیلاً مسیح کا نام پانے والا موعود مصلح ہے جس نے اُمّتِ محمدیہ ہی میں محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلّم کے غلاموں میں سے پیدا ہونا تھا۔

آپؑ نے مسلمانوں کو خبردار کیا کہ "صلیب توڑنے" کی پیشگوئی کے ظاہری معنے لینا محض جہالت اور پیشگوئی کی عظمت کو گرا دینے کے مترادف ہے۔ صلیب توڑنے کے معانی آپ نے یہ بیان فرمائے کہ آنے والا موعود حقانی دلائل کے ساتھ صلیبی فتنے کی کمر توڑ دے گا اور بگڑے ہوئے عیسائی عقائد کے خلاف ایسے قوی اور کاری براہین پیش کرے گا کہ جو صلیبی عقائد کو پارہ پارہ کر دیں۔ اسی طرح آپ نے وضاحت فرمائی کہ خنزیر کو قتل کرنا بھی کوئی ظاہری فعل نہیں ورنہ ماننا پڑے گا کہ حضرت عیسےٰؑ کی زندگی کے بقیہ دن انتہائی پیرانہ سالی کے عہد میں دنیا بھر کے جنگلوں یا دریا کے بیلوں میں بدمست پھرنے والے سُوروں کی تلاش، تعاقب اور اُن کے شکار میں کٹ جائیں گے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے یہ الفاظ استعارۃً استعمال فرمائے تھے جن کا مطلب صرف یہ تھا کہ آنے والا مسیح ناپاک اور خبیث اخلاق کو مٹائے گا اور دجّال کی گندی تہذیب کا قلع قمع کرے گا۔

اس سوال پر بھی آپ نے سیر حاصل بحث فرمائی کہ آنے والے مصلح کو مسیح کا لقب دینے میں کیا حکمت تھی۔ آپ نے فرمایا کہ آنے والے مسیحِ محمدی اور مسیحِ موسوی کے درمیان چونکہ بہت سی مشابہتیں پائی جانی تھیں، لہٰذا آنے والے کا نام تمثیلاً مسیح ابن مریم رکھ دیا گیا۔ جیسے کسی بہادر کو رُستم یا کسی بہت سخی انسان کو حاتم طائی کہہ دیا جاتا ہے جو مماثلتیں آپ نے بیان فرمائیں، اُن میں سے بعض حسب ذیل ہیں:-

۱ ـــ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام موسوی شریعت کے تابع ہو کر آئے تھے اور خود اُن کے اعتراف کے مطابق وہ تورات کا ایک شعشہ بھی تبدیل کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے، اسی طرح آنیوالے مسیح بھی حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے کامل طور پر تابع ہونگے

۲ ـــ جس طرح حضرت مسیح ابن مریم نے یہودی فرقوں کے اختلافات میں حَکم و عَدل کا کردار ادا کیا اور خدا تعالیٰ کی عطا کردہ روشنی سے حضرت موسےٰ علیہ السلام کی اصل تعلیم کو بعد میں شامل ہونے والے انسانی خیالات سے پاک کر کے پیش کیا۔ اسی طرح حضرت مسیح موعود اُمّتِ محمدیہ میں بعد کے پیدا ہونے والے اختلافات میں حَکم و عَدل کا کردار ادا کریں گے۔

۳ ـــ جس طرح موسوی دَور کے تیز غلبہ کے مقابل پر عیسیٰ بن مریمؑ کے متبعین کو آہستہ آہستہ رونما ہونے والا غلبہ عطا کیا گیا اسی طرح حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے جلد اور برق رفتار غلبہ کے مقابل پر آنے والے مصلح کو مسیح ناصریؑ کی طرح آہستہ آہستہ ظاہر ہونے والا غلبہ عطا کیا جائے گا۔

۴ ـــ جس طرح حضرت مسیحؑ کو تلوار کا جہاد نہیں کرنا پڑا لیکن تبلیغی جہاد کے سلسلہ میں آپ کو اور آپ کے متبعین کو شدید مخالفت اور طرح طرح کی اذیتیں برداشت کرنی پڑیں، اسی طرح مسیح موعود اور آپ کی جماعت کو بھی اسلام کی تبلیغ کے سلسلہ میں ایک لمبا اور قربانیوں سے بھرپُور جہاد کرنا پڑے گا اور طرح طرح کے دُکھوں اور مصائب کا سامنا کرنا ہوگا۔

۵ ـــ آنے والے موعود کو مسیح کا نام دینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آنے والے مسیح نے بگڑی ہوئی عیسائیت کے تصوّر کی پیداوار یعنی مافوق البشر اور ابنُ اللہ (نعوذ باللہ) مسیح کی بجائے حقیقی مسیح کا وجود ان کے سامنے از سرِ نَو پیش کرنا تھا اور اس کی امامت میں انہوں نے بالآخر فوج در فوج اسلام میں داخل ہونا تھا۔

دیگر دعاوی اور آپ کے مِشن کی عالمگیر حیثیّت

حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ علیہ السلام کا یہ دعویٰ کہ آپ کو خود اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدوں کے مطابق دُنیا کی اصلاح کے لئے مبعوث فرمایا ہے' آپ کو دیگر تمام علمائے اسلام اور پیروں فقیروں سے ایک بالکل الگ مقام عطا کرتا ہے۔ آپ کا دعویٰ یہ ہے کہ آپ کو خود اللہ تعالیٰ نے خدمتِ اسلام کا فریضہ ایک مامور کی حیثیت سے سونپا ہے اور آپ وہی وجود ہیں جن کے آنے کی پیشگوئی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی زبان مبارک سے فرمائی تھی۔

اِس دعویٰ کا لازمی نتیجہ دیگر مذاہب پر بھی پڑنا تھا کیونکہ جب آپ نے مسلمانوں کے موعود امام ہونے کا دعویٰ کیا تو یہ دعویٰ اِس اسلامی عقیدہ کے پس منظر میں تھا کہ حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلّم وہ آخری صاحبِ شریعت رسول ہیں جن کا دین اب قیامت تک منسوخ نہیں ہو سکتا۔ اگر اس دعویٰ کو درست تسلیم کیا جائے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ اسلام کے سوا اب کسی اور مذہب میں خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی مصلح مبعوث نہیں ہو سکتا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت میں دیگر مذاہب کی کتبِ مقدسہ میں پائی جانے والی اُن پیشگوئیوں کی کیا حیثیت ہو گی جو اپنے مذہبی رہنماؤں کے بارہ میں یہ مُژدہ سناتی ہیں کہ وہ آخری زمانہ میں ایک دفعہ پھر نازل ہو کر یا تجسّم اختیار کر کے دُنیا کو اپنے اپنے مذہب پر اکٹھا کریں گے ؟ کیا اُن پیشگوئیوں کو اصلاً بے بُنیاد اور قابلِ ردّ تسلیم کیا جائے یا ان میں سے کسی ایک کو سچا اور باقی تمام کو جھوٹا سمجھا جائے ؟ ــــ ظاہر ہے کہ اگر ان کے باہمی تصادم کو دُور کرنے کی معقول توجیہہ پیش نہ کی جا سکے تو ان سب کو بیک وقت صحیح تسلیم کرنا عقلاً محال ہے۔

حضرت مرزا صاحب نے اِن پیشگوئیوں کی اصلیت کو تسلیم کرتے ہُوئے اس ظاہری تضاد کو دُور کرنے کی ایک معقول توجیہہ پیش فرمائی۔ آپ کے نزدیک یہ مختلف پیشگوئیاں آنے والے موعود کے لئے جو وقت معیّن کرتی ہیں' وہ ایک ہی ہے اور سب ایک ہی زمانہ کی علامتیں بیان کرتی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آخری زمانہ میں ہندوؤں کا کرشن دُنیا کو ہندو مت کی طرف بلانے کے لئے

اَوتار بن کر آئے گا اور عیسائیوں کا مسیح خدا کے بیٹے کی حیثیت سے تجسّم اختیار کرکے تثلیث پر ایمان لانے کو ذریعۂ نجات بتائے گا' یا بدھ اس لئے جنم لے گا کہ دُنیا کو ایک دفعہ پھر بدھ مت کی تعلیم دے اور زرتشت اس لئے نزول فرمائے گا کہ آتش پرستی کی طرف دُنیا کو دعوت دے ـــــ یہ تصوّر مضحکہ خیز اور محال ہے کہ بیک وقت کئی سچے اور خُدا کے پیارے رِشی یا اوتار دُنیا میں ظاہر ہوکر اہلِ دُنیا کو متضاد اور متصادم تعلیمات کی طرف بُلائیں۔ کوئی توحید کو ذریعۂ نجات بتلاتا ہو تو کوئی بُت پرستی کو' کوئی عقیدۂ تثلیث کو مدارِ نجات قرار دے رہا ہو تو کوئی آگ کی پُوجا کو۔

واقعہ یُوں ہے کہ یہ سب اپنے اپنے وقت میں دراصل ایک ہی خدا کے خلیفہ اور مظہر تھے' گو مختلف اوقات میں مختلف ناموں سے مختلف شخصیتیں ظاہر ہُوئیں لیکن اس پہلو سے اُن میں کوئی فرق نہیں کہ سب ایک ہی بالا ہستی کے پیغامبر تھے۔ پس ان کے دوبارہ آنے کا بھی صرف یہی مطلب ہے کہ جب ان کی قومیں بگڑ جائیں گی اور اِن کی حقیقی تعلیم کو مسخ کر دیں گی تو خدا کی طرف سے ایک ایسا مصلح ظاہر ہوگا جس کا آنا گویا خود اُن ہی کا آنا ہے۔ پس آخری زمانہ میں ظاہر ہونے والا امام تو ایک ہی ہوگا لیکن مختلف مذاہب کی طرف سے اُسے مختلف تمثیلی نام دیئے جائیں گے ـــ کہیں اسے کرشن کے نام سے پکارا جائے گا تو کہیں بُدھ کے لقب سے' کہیں مسیح ابنِ مریم ظاہر کیا جائے گا تو کہیں زرتشت۔ اور یہ مختلف تمثیلی نام رکھنے کا مقصد یہ ہوگا کہ جملہ مذاہب کے پَیرو خود اپنی اپنی کتبِ مقدسہ میں بیان کردہ علامتوں سے آنے والے مصلح کو پہچان کر اس کی اس طرح اطاعت کریں جیسے وہ اپنے مذہب کے نہایت قابلِ تعظیم اور واجب الاطاعت امام کی کرتے تھے' گویا اس کا آنا خود اُن کے اپنے امام کا آنا قرار پائے۔

چنانچہ خدا تعالیٰ کی طرف سے اِذن پاکر آپ نے یہ دعویٰ کیا کہ چونکہ آخری شریعت اور آخری رُوحانی سلطنت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ہے لہٰذا اس حیثیت سے میں ہی آپؐ کا وہ رُوحانی فرزند اور غلامِ کامل ہوں جو اسلام کے احیائے نَو کے لئے مبعوث کیا جانا تھا اور جسے جملہ مذاہبِ عالَم کے موعود مصلحین کی نمائندگی بھی سونپی جانی تھی۔ پس مَیں ہندوؤں کا آنے والا کرشن بھی ہوں اور عیسائیوں کا موعود مسیح بھی' اور تمام دیگر مذاہب کے اُن اَئمّہ کا نمائندہ بھی ہوں جن کا صدیوں سے انتظار کیا جارہا تھا۔ چنانچہ الہامِ الٰہی میں بھی آپ کو اُن تمام نبیوں کا نمائندہ قرار دیا گیا جن کی مختلف قوموں کو انتظار تھی۔ جیسا کہ فرمایا: "جَرِیُّ اللّٰہِ فِیْ حُلَلِ الْاَنْبِیَآءِ"

یعنی ـــ خدا کا پہلوان سب نبیوں کے لباس میں (تذکرہ طبع سوم صـ۷۹)

اس کے علاوہ بعض ایسے نبیوں کا نام دے کر بھی آپ کو مخاطب کیا گیا جن کی آمدِ ثانی کے بعض دیگر مذاہب کے پیرو کار منتظر تھے۔ چنانچہ ایک الہام میں آپ کو اس طرح مخاطب کیا گیا:۔

"ہے کرشن رُودر گوپال تیری مہما گیتا میں لکھی گئی ہے" [۱]

---

[۱] تذکرہ (مجموعہ الہامات و رویا و کشوف حضرت مسیح موعود علیہ السلام) طبع سوم صفحہ ۳۹

اَحمدیّت مخالفت کی بھٹّی میں[۲]

حضرت مرزا غلام احمد علیہ السلام کی شخصیت، آپ کے طرزِ فکر اور دعاوی کے مختصر تعارف کے بعد اب ہم ایک نظر اُن نتائج پر بھی ڈالتے ہیں جو اس صورتِ حال کو بہر حال لازم تھے۔

مسلمان علماء اور مسلمان عوام کے سوادِ اعظم پر آپ کے طرزِ فکر اور دعاوی کا شدید معاندانہ ردِّ عمل ہوا اور راس کماری سے لے کر درۂ خیبر تک مخالفت کی ایک ہولناک تُند خو آگ بھڑک اُٹھی۔ آپ کو کافر اور ملحد اور دجّال قرار دیا گیا اور "قتل" آپ کی اور آپ کے متبعین کی ادنیٰ سزا تجویز کی گئی۔ مخالفت کے جوش میں بعض علماء تو اس قدر آگے بڑھ گئے کہ آپ کے بارہ میں عجیب و غریب من گھڑت قصّے عوام میں مشہور کرکے یہ تاثر دینے لگے کہ گویا نعوذ باللہ آپ وہ دجّال ہیں جس کے فتنہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے تیرہ سو سال قبل ڈرایا تھا۔ مثال کے طور پر آپ کے بارہ میں یہ مشہور کر دیا گیا کہ آپ (نعوذ باللہ) دائیں آنکھ سے عاری ہیں، تاکہ ذہن اس دجّال کی طرف منتقل ہو جائے جس کا ذکر پہلے کسی قدر تفصیل سے گزر چکا ہے۔ لیکن اس مذموم کوشش کے وقت انہوں نے یہ نہ سوچا کہ اس افتراء کے بعد اس عجیب و غریب گدھے کو کہاں سے پیدا کریں گے جس پر سفر کرکے دجّال نے دنیا فتح کرنی تھی۔ نیز یہ خیال بھی ان کے دل میں نہ گزرا کہ اگر نعوذ باللہ یہ وہی دجّال ہے تو پھر تاوقتیکہ مسیح ابن مریم آسمان سے نہ اتریں، کسی ماں نے وہ عالِم پیدا نہیں کیا جو اس کا مقابلہ کر سکے۔

قصہ مختصر —— صداقت اور خلوص کی جو سزا پہلے راستبازوں کو ملتی آئی ہے، وہ نہایت بھیانک صورت لئے ہوئے آپ کے حِصّے میں بھی آئی۔ لیکن اس کا سب سے زیادہ تکلیف دہ پہلو یہ تھا کہ اپنوں نے غیروں سے بڑھ کر ایذا رسانی میں حصہ لیا اور آپ کے لئے فی ذاتہٖ یہ دکھ دوسرے تمام دکھوں سے سوا تھا کہ مسلمان علماء اپنی مخالفت میں پادریوں اور پنڈتوں سے بھی بازی لے گئے۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں:-

کافر و ملحد و دجّال ہمیں کہتے ہیں
نام کیا کیا غمِ ملّت میں رکھایا ہم نے
تِرے منہ ہی کی قسم مِرے پیارے احمدؐ
تیری خاطر سے یہ سب بار اٹھایا ہم نے

وہ انتہائی سنگین جرائم جن کی پاداش میں مسلمان علماء کا غضب آپ پر نازل ہوا' یہ تھے :-

۱ ـــــ آپ کا دعویٰ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں۔

۲ ـــــ آپ کا یہ دعویٰ کہ آنے والا مصلح اُمتِ محمدیہ میں پیدا ہونا تھا "مسیح" اس کا صفاتی نام ہے جو بطور استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔

۳ ـــــ آپ کا دعویٰ کہ آپ ہی خدا تعالیٰ کی طرف سے اس مشن پر مامور کئے گئے ہیں جو مسیحِ موعود کا مشن تھا اور آپ ہی کا صفاتی نام "مسیح" ہے۔ لہٰذا اب مزید کسی نئے آنیوالے کا انتظار بے سود ہے۔

۴ ـــــ آپ کا دعویٰ کہ خدا تعالیٰ آج بھی اپنے بندوں سے اسی طرح ہمکلام ہوتا ہے جس طرح پہلے ہوتا تھا۔ اُسکی کوئی صفت معطل نہیں ہوئی۔ اور عقلاً بھی انسان کسی ایسے تاریخی خدا پر ایمان نہیں لا سکتا جو اگلے وقتوں کے انسانوں سے تو بولتا آیا ہو لیکن ایک وقت کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے چُپ رہنے کی قسم کھالے۔ آپ نے یہ دعویٰ کیا کہ واقعات بھی اس لغو تصور کو جھٹلا رہے ہیں کہ خدا اپنے بندوں سے وحی والہام کا تعلق توڑ بیٹھا ہے۔ چنانچہ سینکڑوں مسلمان اولیاء اور اقطاب سے اللہ تعالیٰ کا ہمکلام ہونا ثابت ہے اور اس زمانہ میں خود آپ سے (حضرت مرزا صاحب علیہ السلام سے خدا تعالیٰ بکثرت ہمکلام ہوتا ہے اور وحی والہام اور کشوف ورویاء کے ذریعے بالواسطہ اور بلاواسطہ دونوں طریق پر آپ کو اپنے ارشادات سے نوازتا ہے۔ جو بکثرت غیب کی خبروں پر مشتمل ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی غیر معمولی معجزانہ تائید کی بشارتیں لے کر آتے ہیں اور ایسے امور کا انکشاف کرتے ہیں جو کسی منجم یا اٹکل پچو مارنے والے پیشین گو کی حدِ استعداد سے باہر ہوتے ہیں۔ غرضیکہ کسی عاجز انسان کی مجال نہیں کہ الہامِ الٰہی کی مدد کے بغیر اُن پر قدرت پا سکے۔

۵ ـــــ مندرجہ بالا وجوہِ مخالفت کے علاوہ آپ کا یہ دعویٰ بھی علماء کی شدید ناراضگی کا موجب بنا کہ جیسا کہ احادیث نبوی میں آنے والے مصلح یعنی مسیح موعود کو نبی اللہ کہا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بارہا "نبی اللہ" کے نام سے مخاطب فرمایا۔ مگر یہ نبوّت کوئی مستقل اور اور آزاد نبوّت نہیں' بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے عطا ہونے والی ظِلّی نبوّت ہے۔ یہ نبوّت چونکہ کامل طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں داخل ہے

لہٰذا ہرگز آپ کے خاتم النبیّین ہونے کے مخالف نہیں اور آخری صاحبِ شریعت نبی جن کے فرمان کا سکّہ تا قیامت جاری رہے گا، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم خاتم النبیّین ہی ہیں اور کوئی نبی یا غیر نبی ایسا پیدا نہیں ہو سکتا جو آپ کے کسی ارشاد کا ایک شعشہ بھی تبدیل کر سکے یا نعوذ باللہ آپ کی شریعت سے سرِ مُو انحراف کرنے کا واہمہ بھی دل میں لا سکے۔

مندرجہ بالا پانچوں دعاوی چونکہ مسلمان علماء کی اکثریت کے مروّجہ عقائد کے خلاف تھے اس لئے حضرت مرزا غلام احمد صاحب پر ان کی شدید ناراضگی ایک لازمی امر تھا اور چونکہ حضرت مرزا صاحب اپنے دعاوی کی تمام تر بنیاد قرآن و سنّت پر رکھتے تھے لہٰذا آپ کے اور دیگر مسلمان علماء کے درمیان ان اُمور پر ایک شدید مذہبی جنگ شروع ہوگئی کہ کس حد تک قرآن و سُنّت آپ کے دعاوی کو اسلامی یا غیر اسلامی ثابت کرتے ہیں۔ یہ جنگ جو ابھی تک جاری ہے اور فیصلہ کن ہونے تک آئندہ بھی جاری رہے گی ایک قطعی رجحان ضرور ظاہر کر چکی ہے کہ اس دن سے لے کر کہ جب حضرت مرزا صاحب اکیلے تھے اور آپ کے مقابل پر ہندوستان بھر کے علماء ایڑی چوٹی کا زور آپ کی مخالفت میں لگا رہے تھے آج تک ایک دن بھی ایسا نہیں چڑھا جس میں آپ کے مشن کا قدم ترقی کی جانب نہ اُٹھا ہو۔ سینکڑوں علماء اور بزرگانِ اسلام جو کبھی کافر کہنے والوں کے زُمرہ میں شامل تھے قرآن و سنّت کے پیش کردہ دلائل سے گھائل ہو کر آپ کی صداقت اور شمائل کے قائل ہوتے چلے گئے اور لاکھوں مسلمان عوام بھی آپ کے سلسلہ میں داخل ہو کر آپ کے قافلہ میں آملے اور ملتے چلے جاتے ہیں۔ کبھی آپ اکیلے تھے، اور آج لکھوکھا آپ کے ماننے والے ہیں ـــــ کبھی آپ کی آواز مشرقی پنجاب کے ایک گمنام گاؤں قادیان سے تنہا اٹھی تھی اور ہندوستان کے وسیع و عریض نقار خانے کے شور تلے دبتی دکھائی دیتی تھی۔ وہ آواز جسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش کر دینے کی خاطر ہندوستان کے طول و عرض میں ایک تہلکہ مچ گیا تھا اور ایک ایسا غلغلہ ہاؤ ہُو بلند ہو رہا تھا کہ جس کی بازگشت ہمالہ کی شمالی چوٹیوں سے ٹکرا کر ہندوستان کے جنوبی ساحل تک سنائی دیتی تھی، ہاں وہی تنہا آواز ـــــ پھر تنہا نہ رہی۔ کوئی فصیل اس کا حصر نہ کر سکی ـــ ہزاروں لاکھوں صدائیں اس کی تصدیق میں ہندوستان کے گوشے گوشے سے بلند ہونے لگیں، جیسے گھُپ اندھیری رات میں نیم شبانہ عبادت کرنے والے عابد اپنے اپنے عبادت خانوں میں چراغ جلاتے ہیں ـــ تعداد میں کم، خال خال اور دُور دُور، لیکن بایں ہمہ شبِ ظلمات میں نُور کے احیاء اور بقاء کی یقینی علامت لئے ہُوئے ویسے ہی آپؑ کی صداقت کا نُور لئے ہوتے بے شمار چراغ ہندوستان کی دیگر بستیوں میں متعدد دوسرے سینوں کو منوّر کرنے لگے۔ مخالفت کا شور بھی بلند ہوتا چلا گیا اور عصبیّت کے اندھیرے

بھی پھیلتے رہے، لیکن تصدیق کی آوازیں بھی ہر لحہ تعداد اور قوت میں پہلے سے بڑھ کر اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا ، اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا ! کے راگ الاپنے لگیں اور ایمان کی شمعیں بھی مقدس سینوں کے راہب خانوں میں ہر شب پہلے سے بڑھ کر روشن ہوتی رہیں۔ یہ مذہبی جنگ ہندوستان کی سرحدیں پھلانگ کر مشرقِ وسطےٰ کے عرب ممالک میں بھی جا پہنچی اور کفر کے فتووں کا ایک کان پھاڑ دینے والا شور وہاں سے بھی بلند ہوا۔ لیکن وہاں بھی تائید اور تصدیق کی آوازیں ساتھ ساتھ بلند ہونے لگیں۔ غرضیکہ مخالفت کا کوئی شور خطۂ ارض پر ایسا نہ اُٹھا جس کے بطن سے تصدیق کی آوازیں بھی بلند نہ ہوئی ہوں۔

یہ سب مخالفت مسلمانوں کی طرف سے تھی اور اس مخالفت کی وجوہات کا مختصر تذکرہ اوپر گزر چکا ہے بڑی اور بنیادی وجہ اس کی یہی تھی کہ اُس مسیح ناصریؑ کی موت کا آپ نے اعلان کیا تھا جس کے زندہ آسمان سے اُترنے کا خواب مسلمان علماء اور عامۃ الناس صدیوں سے دیکھ رہے تھے۔ صدیاں بیت گئی تھیں۔ تنزل کی جھونپڑیوں میں سسکتی ہوئی اس قوم کو جو کبھی اَوجِ ثریا پر قدم رکھتی تھی اور ایک کے بعد عروج کے دوسرے ستارے پر کمندیں ڈال رہی تھی، گرتے گرتے یہ آخر ایسی گری کہ سطحِ زمین سے بھی نیچے اُتر گئی اور تحت الثریٰ سے ورے اس کے قدم نہ جمے۔ غرضیکہ دُنیا کی ادنیٰ ادنیٰ قوموں کو بھی آج ہر شعبۂ زندگی میں اِن سے فزوں تر مقام حاصل ہو گیا اور زندگی کی سب قدروں میں وہ ان پر بازی لے گئیں۔ ہلاکت اور ادبار کے اس سخت دردناک دَور میں ایک اور صِرف ایک اُمید تھی جو چرخِ چہارم سے وابستہ تھی۔ نکبت کے سفلی میدانوں میں چاروں شانے چت گرے ہوئے مسلمان مسیحِ ناصری کے آسمان سے اترنے کی راہ دیکھ رہے تھے گویا وہ اُن عظیم الشان برکتوں کی راہ دیکھ رہے تھے جو نعوذ باللہ اُمتِ محمدیہ کے لئے مسیحِ موسوی کے قدموں سے وابستہ ہو چکی تھیں۔ وہ راہ دیکھ رہے تھے جاہ و حشمت کے اُن محلات کی جن کے ابواب مسیحِ ناصری کی جنبشِ لب سے وا ہوتے تھے۔ وہ راہ دیکھ رہے تھے اُن طلسماتی فلک بوس قلعوں کی جن کی تعمیر کا الٰہ دینی چراغ مسیحِ ناصری کے دستِ راست میں تھا۔

پھر حضرت مرزا صاحبؑ کا یہ جرم کیا کم تھا کہ اس آسمانی منجی کی موت کے اعلان کی ایک ہی ضرب کے ساتھ حسین خوابوں کا یہ حسین طلسم پارہ پارہ کر دیا گیا ۔ لیکن کاش مسلمان علماء یہ سوچتے کہ اگر ایک خیالی مسیح اُن کے ہاتھ سے چھینا گیا تھا تو ایک حقیقی مسیح انہیں عطا بھی تو ہوا تھا۔ وہ مسیح جس نے محمد ﷺ کی غلامی ہی میں اُمتِ محمدیہ میں پیدا ہونا تھا اور محمد ﷺ کی غلامی ہی میں اُمتِ محمدیہ میں مرنا تھا۔ جس نے اُمتِ محمدیہ کو خوابوں کی بے عمل زندگی سے نکال کر حقائق، جدوجہد، ایثار اور قربانیوں سے بھرپور ایک نئی زندگی عطا کرنی تھی۔ جس نے اُمتِ محمدیہ کو پھولوں کی سیج پر لِٹا کر لوریاں نہیں دینی

تھیں بلکہ کانٹوں سے بھرے ہوئے دکھوں اور مصائب کے ان سنگلاخ راستوں سے گزرتا تھا جن پر سے گزرے بغیر قومیں کبھی بھی ترقیات کی بلند و بالا جنتوں میں داخل نہیں ہوا کرتیں۔ یہ وہی راستہ تھا جو مکہ کی پتھریلی گلیوں اور جلتے جھلستے ریگزاروں پر سے گزرتا تھا جہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کو گھسیٹا جاتا اور بلالؓ کی چھاتی پر سلگتے ہوئے پتھر کی سلیں رکھی جاتی تھیں۔ یہ وہی راستہ تھا جو طائف کو جاتا تھا اور جس کی ایک منزل شعب ابی طالب میں واقع تھی۔ یہ راستہ وہی راستہ تھا جو بدر' احد اور حنین کے مقاتل سے ہو کر گزرتا تھا۔

بہرحال قصہ مختصر' جب مسلمان علماء اور عامۃ الناس کا یہ حال تھا کہ باوجود اس کے کہ ایک مسیح کے بدلے دوسرے مسیح کی آمد کی خبر اُن کو دی جا رہی تھی' وہ سخت غضب ناک اور برافروختہ تھے۔ پھر ادھر عیسائیوں سے تحمل اور بردباری کی توقع بھلا کیا ہو سکتی تھی کہ جن کا نقصان مسلمانوں کے "نقصان" سے بہت بڑھ کر تھا۔ مسلمانوں کا تو صرف ایک نبی فوت ہو رہا تھا جس سے پہلے اور بعد کے دوسرے سب نبی بھی گزر چکے تھے مگر عیسائیوں کے لئے تو یہ اُن کے ایک خدا کی موت کا اعلان تھا اور ان کے لئے یہ صدمہ اپنی نوعیت کا پہلا صدمہ تھا۔ پس عیسائیوں کی طرف سے مخالفت کا جو شور برپا ہوا وہ ہندوستان اور مشرقِ وسطیٰ کی حدود سے بہت آگے نکل گیا اور یورپ اور امریکہ کے کلیساؤں میں بھی سنائی دینے لگا۔ حیرت ہے کہ اس زمانے میں ہندوستان جیسے غلام اور پسماندہ ملک کے ایک پسماندہ صوبے کی ایک چھوٹی سی گمنام بستی کے ایک غیر معروف اور گوشہ نشین دعویدار کے ایک ہی اعلان نے وہ عالمگیر زلزلہ برپا کر دیا کہ جس کے زبردست جھٹکے یورپ اور امریکہ کے کلیساؤں نے بھی شدت سے محسوس کئے۔ یہ ایک دلچسپ داستان ہے کہ امریکہ کی عظیم الشان اور منقطع دنیا نے بھی قادیان کے اس دعویدار کا کس قدر سنجیدگی اور فکر کے ساتھ نوٹس لیا اور وہاں کے بعض مشہور بابایانِ کلیسا کے ساتھ آپ کی کیسی فیصلہ کن جنگیں ہوئیں!

مقصودِ کلام اس وقت صرف اتنا ہے کہ حضرت مرزا صاحب مسیح ناصریؑ کی وفات کے اعلان سے جہاں مسلمانوں میں بہت مقہور ہوئے وہاں اسی اعلان کی بدولت کُل عالم کی عیسائی دنیا بھی آپ سے شدید نفرت کرنے لگی اور آپ کو نیست و نابود کرنے اور آپ کے پیغام کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لئے ہر حربہ بروئے کار لانے لگی۔ لیکن آپؑ کے قدموں میں ایک ذرہ بھر لغزش نہ آئی' اور آپ اپنے اس مؤقف پر نہایت مضبوطی کے ساتھ آخری سانس تک قائم رہے کہ خدا تعالیٰ کی دی ہوئی خبر کے مطابق مسیح ناصریؑ جو بنی اسرائیل کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے تھے ہر دوسرے بشر رسول کی طرح وفات پا چکے ہیں اور مسیح ناصریؑ کی زندگی سے نہیں بلکہ اُن کی موت سے اسلام کا احیائے نو مقدر اور وابستہ ہو چکا ہے

چنانچہ آپ نے نہایت واشگاف الفاظ میں یہ اعلان فرمایا کہ :

"تم عیسےٰ کو مرنے دو کہ اس میں اسلام کی حیات ہے۔ ایسا ہی عیسیٰ موسوی کی بجائے عیسیٰ محمدی کو آنے دو کہ اس میں اسلام کی عظمت ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر اسلام میں وحی والہام کا سلسلہ نہیں تو اسلام مرگیا" [1]

اسی طرح آپ فرماتے ہیں :-

"پس مسیح کو مرنے دو کہ اسلام کی زندگی اسی میں ہے" [2]

---

[1] ملفوظات جلد دہم حاشیہ صـــ ۴۵۸ [2] ملفوظات جلد دہم صـــ ۲۵۷

دیگر مذاہب کی طرف سے مخالفت

اور آریہ سماج سے مقابلہ

اگر حضرت مرزا صاحب کا دعویٰ یہیں تک رہتا کہ مسیح ناصریؑ فوت ہو چکے ہیں اور اُن کی بجائے خداتعالیٰ نے آپ کو اُن کے رنگ میں مبعوث فرمایا ہے' تب تو بات مسلمانوں اور عیسائیوں کے غیظ و غضب تک محدود رہتی۔ مگر آپ کا یہ دعویٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن چونکہ عالمی مشن تھا لہٰذا آپ کی غلامی میں مبعوث ہونے والے امامِ زمانہ کا مشن بھی لازماً عالمی ہونا تھا۔ اور آپ کا یہ دعویٰ کہ آپ صرف عیسائیوں کے مسیح اور مسلمانوں کے مہدی ہی نہیں بلکہ یہودیوں کے لئے داؤد اور ہندوؤں کے کرشن بھی ہیں' بلا استثناء تمام مذاہبِ عالَم کے پیرو کاران کو آپ کا دشمن بنا گیا۔ مسلمان اور عیسائی تو نالاں تھے ہی' ہندو بھی سخت سیخ پا ہوئے کہ ہمارا کرشن اور محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے غلاموں میں پیدا ہو؟ ... اس سے زیادہ دُکھ اُن کے لئے ممکن نہ تھا۔ ہندوؤں کے نزدیک یہ ہندو مذہب اور کرشن جی مہاراج کی ایسی تذلیل تھی کہ حضرت مرزا صاحب کے خلاف اس دعویٰ کی بناپر ہندو سوسائٹی کی نس نس میں بُغض' تعصب اور نفرت کا زہر سرایت کر گیا۔ اس زہر کا جسمانی مظہر لیکھرام کی صُورت میں ظاہر ہُوا (جس کا ذکر آگے چل کر آئے گا) یہ وہ آریہ لیڈر تھا جس کی کچلیاں حضرت بانیٔ اسلام محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف زہر سے ایسی بھرپور تھیں کہ ہزار بار ڈسنے کے باوجود وہ کبھی اس زہر سے خالی نہ ہو سکیں۔

ایک قوم سکھ باقی تھی جس کا مسکن زیادہ تر پنجاب ہے اور خصوصاً قادیان کے اردگرد بھاری تعداد میں آباد ہے' اس قوم کے ہاتھ میں بھی آپؑ نے دشمنی کا ایک زبردست بہانہ تھما دیا۔ آپ نے دعویٰ کیا کہ سکھ مت کے بانی حضرت باوا گورو نانک صاحب دراصل کسی نئے مذہب کے بانی نہیں تھے' بلکہ نوعمری میں ہی آپ نے بُت پرستی سے متنفر ہو کر دینِ اسلام کو دِل سے قبول کر لیا تھا اور آخری سانس تک دینِ اسلام کے پیرو رہے۔ آپ ایک معمولی مسلمان نہ تھے بلکہ نہایت اعلےٰ پایہ کے بزرگ مسلمان اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشقِ صادق تھے اور قرآن و سُنّت کے دل وجان سے پابند

تھے۔ چونکہ آپ نے زیادہ تر ہندوؤں میں توحید کے قیام کے لئے جہاد کیا اور ہندو نومسلم ہی زیادہ تر آپ کے مسلک کے مرید ہوئے لہذا مرورِ زمانہ سے آہستہ آہستہ اسلام کے اس صوفی فرقہ کو ایک الگ مذہب تصور کر لیا گیا۔

اپنے اس دعویٰ کے ثبوت کے طور پر خدا تعالیٰ سے خبر پا کر آپ نے یہ حیرت انگیز انکشاف بھی فرمایا کہ حضرت باوا گورو نانک صاحب کے مقدس چولے پر مبیّنہ طور پر جو نامعلوم الہامی زبان درج ہے وہ سورۃ فاتحہ اور بعض دیگر قرآنی آیات کے سوا اور کچھ نہیں۔ نہ صرف آپ نے یہ اعلان فرمایا بلکہ اپنے بعض رفقاء کے ساتھ خود بنفسِ نفیس یہ چولہ ملاحظہ فرمانے کے لئے ڈیرہ بابا نانک صاحب تشریف لے گئے اور اس چولے کی تصاویر بھی اتروائیں جنہیں بعد میں بکثرت شائع کروا کر دنیا پر خوب روشن کر دیا کہ مندرجہ عبارت کوئی نئی الہامی زبان نہیں جیسا کہ سکھوں کا عقیدہ تھا' بلکہ اس پر تو محض سورۃ فاتحہ' کلمہ طیبہ اور قرآن کریم کی بعض دیگر آیات درج ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ سکھ مت کی علیحدہ مذہبی حیثیت پر ایک کاری ضرب لگاتا ہے اس لئے سکھوں کا اس انکشاف پر سخت ناراض اور سیخ پا ہونا ایک طبعی امر تھا۔ چنانچہ پنجاب بھر کی سکھ آبادی بھی آپ کو ناراضگی کی آنکھ سے دیکھنے لگی۔

مندرجہ بالا حقائق پر نظر ڈال کر تعجب نہیں رہتا کہ کیوں حضرت مرزا صاحب اپنے زمانہ کے ابنائے آدم کی نظروں میں بلا استثناء سب سے زیادہ مقہور و مغضوب ٹھہرے یہاں تک کہ جو پہلے اپنے تھے وہ بھی ایسے دشمن ہوئے کہ شرافت اور نجابت کے سارے دستور بالائے طاق رکھ کر سخت اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئے۔ صرف اس زبان ہی کو دیکھ لیجئے جو اس وقت معاند مسلمان علماء نے حضرت مرزا صاحب کے خلاف استعمال کی۔ اس قدر غلیظ اور ناپاک گالیاں سن کر عقل باور نہیں کرتی کہ ایک مسلمان عالم کی لغت گالیوں کے مضمون میں اتنی وسیع ہو سکتی ہے۔ فتاویٰ کفر کی کوئی انتہاء نہ رہی اور جہنم کی بشارتیں تو روزمرہ کا معمول ہو گئیں اور برسرِ عام دی جانے لگیں۔

سب سے بڑا ظلم یہ ہوا کہ وہ دعاوی جو آپ نے کئے تھے' ان کو اشتعال انگیزی کے لئے ناکافی سمجھ کر آئے دن من گھڑت اور خود ایجاد دعاوی آپ کی طرف منسوب کئے جانے لگے۔ اور آپ کی پاکیزہ تحریرات کے ظروف میں وہ خیالی گند بھرے جانے لگے جن کا وہم بھی حضرت مرزا صاحب کے نزدیک حرام اور کفر تھا۔ مثلاً آپ کے متعلق کہا گیا کہ نعوذ باللہ آپ خدا یا خدا کا بیٹا ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں یا نعوذ باللہ آپ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل اور بالمقابل نبی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں یا نعوذ باللہ آپ

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین نہیں مانتے اور اُمہات المومنین کی سخت توہین کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ

اِدھر اپنے یعنی مسلمان کہلانے والے آپ سے یہ سلوک کر رہے تھے' اُدھر غیر بھی بڑی شدت اور تُندی کے ساتھ آپ پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب مسلمان ایک غیر قوم کے نبی کی موت کا دعویٰ بھی برداشت نہیں کر سکے تو عیسائی خود نچلے کیسے بیٹھ سکتے تھے جب کہ اُن کے اپنے خدا کا اکلوتا بیٹا مارا جا رہا تھا۔ چنانچہ بڑے بڑے عیسائی پادری للکارتے ہوئے آپ کے مقابل پر مبارزت کے لئے نکلے جن میں لاہور کے بشپ لیفرائے' امرتسر کے عبداللہ آتھم اور امریکہ کے ڈوئی جیسے نامی گرامی پہلوان شامل تھے۔

ہندوؤں میں اس وقت آریہ سماج ہندو مت کا ایک شدید جارحیت پسند فرقہ تھا۔ اس فرقہ نے ہندو مت کی نمائندگی میں حضرت مرزا صاحب اور اسلام کو نیچا دکھلانے کے لئے شدید جنگ لڑی۔ اگرچہ عیسائی پادری بھی بانیٔ اسلام حضرت اقدس محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی مطہر ازواج اور مقدس اہلِ بیت پر نہایت کمینے اور رکیک حملے کرنے سے کبھی نہیں چُوکتے تھے' لیکن اس بارہ میں جو ناپاک مظاہرہ آریہ سماج نے کیا اُس کی مثال نظر نہیں آتی۔

حضرت مرزا صاحب کے خلاف آریہ مت کے بُغض و عناد کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ اس فرقہ کی نمائندگی میں سب سے پیش پیش پنڈت لیکھرام تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنے اور سخت بے باکی سے گند اُچھالنے اور استہزاء کرنے میں یہ سب دوسرے کینہ توز اور گندہ دہن مخالفین پر سبقت لے جا چکے تھے۔ حضرت مرزا صاحب نے ان پنڈت صاحب کو بھی نہایت پُر شوکت الفاظ میں للکارا اور اسلام پر ان کے حملوں کے جواب میں پے در پے نہایت شدید جوابی حملے آریہ مت پر کئے۔

جن ایام کا ہم ذکر کر رہے ہیں یہ مذہبی جنگوں کا وہ دَور تھا جب کہ نظریاتی بحثیں اپنے کمال کو پہنچ چکی تھیں اور مخالفت یا موافقت میں کوئی ایسی دلیل باقی نہیں رہی تھی جسے فریقین نے استعمال نہ کیا ہو۔ حضرت مرزا صاحب نے اس طویل بحث کو فیصلہ کُن صورت دینے کے لئے اپنے مخالفین کو اس طرف توجہ دلائی کہ حق اور باطل کا فیصلہ منقولی دلائل کی بجائے اس طریق سے کیا جائے کہ جس مذہب کے ماننے والوں کا اللہ تعالیٰ سے سچا اور زندہ تعلق قائم ہو اور اس کا مشاہدہ کیا جا سکے' اُسے سچا تسلیم کر لیا جائے اور جہاں محض زبانی جمع خرچ ہو اور تعلق باللہ کی عملاً کوئی نشانی نہ ملتی ہو اسے رد کر دیا جائے۔ آپ نے دعویٰ کیا کہ اسلام کا خدا ایک زندہ خدا ہے اور اسلام کا رسول ایک زندہ رسول ہے جس کی قوتِ قدسیہ آج بھی خاک کی ایک چٹکی کو خُدا نما انسان بنا سکتی ہے' اسی طرح اسلام کی کتاب بھی ایک زندہ

کتاب ہے جو آج بھی ہر مخلص حق جُو کا تزکیۂ نفس کرکے اُسے اس قابل بنا سکتی ہے کہ اُس کا اپنے ربّ سے ایک زندہ اور ٹھوس تعلق قائم ہو جائے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص دینِ اسلام اور بانیٔ اسلام اور صحیفۂ اسلام کی صداقت کو پرکھنا چاہتا ہے تو وہ آئے اور اللہ تعالیٰ کے اس انتہائی مشفقانہ اور کریمانہ سلوک کو دیکھے جو پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلّم کی کامل غلامی کے نتیجہ میں اس نے مجھ سے فرمایا ہے۔ وہ مجھ سے ہمکلام ہوتا ہے۔ وہ مجھے فتح اور نصرت کی بشارتیں دیتا ہے' میری دعاؤں کو سُنتا ہے اور اُن کی قبولیت کی ایسی خوشخبریاں مجھے دیتا ہے جو اپنے وقت پر نہایت صفائی سے پُوری ہوتی ہیں۔ وہ ہر قدم پر میری نصرت فرماتا ہے اور میرے مخالفین کو نیچا دِکھاتا ہے۔ میں دُنیا میں تنہا تھا اور ساری دُنیا میری مخالفت میں یک جان و کمربستہ تھی' پھر بھی اس نے ہر مخالف کے شر سے مجھے محفوظ رکھا اور دِن بدن مجھے برکت پر برکت دیتا چلا گیا اور زمین میرے لئے غیر کے مقابل پر ہمیشہ بڑھتی رہی' آج بھی اسی طرح وہ میری دعاؤں کو سُنتا اور میری حفاظت کی ضمانت دیتا ہے اور میرے لئے غیرت دکھاتا ہے یہاں تک کہ رُوئے زمین کی تمام طاقتیں اور تمام مذاہب کے ماننے والے بھی ایڑی چوٹی کا زور لگائیں تو بھی مجھے ہلاک نہیں کر سکتے۔ اس ضمن میں آپ نے پنڈت لیکھرام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا :۔

الا! اے دشمنِ نادان و بے راہ
بترس از تیغِ بُرّانِ محمدؐ
کرامت گرچہ بے نام و نشاں است
بیا بنگر ز غلمانِ محمدؐ

(آئینۂ کمالات اسلام)

یعنی اگرچہ کرامات اور معجزات عملاً دنیا سے ناپید ہو چکے ہیں' لیکن ! اے شکوک میں بھٹکنے والے آ اور محمد صلّی اللہ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے غلاموں کے ہاتھوں نمودار ہوتے والے معجزات اور کرامات کا مشاہدہ کر' اور اے نادان اور گمراہ دشمنِ اسلام' محمد صلّی اللہ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی کاٹ دینے والی تیز تلوار سے ڈر۔

آپ نے تمام دُنیا کے مذاہب کے رہنماؤں کو بار بار چیلنج دیا کہ اگر واقعی تم سمجھتے ہو کہ خدا تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے' تو اسی ایک نکتے پر سب لڑائی کا فیصلہ ہُوا چاہتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی تائید کی لازماً کچھ علامتیں ہوتی ہیں' ان علامتوں کی کسوٹی پر رکھ کر دیکھ لو کہ سچائی کس کے ساتھ ہے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر کوئی دوسرا مذہبی رہنما اس مقابلے کے لئے آمادہ نہ بھی ہو تو میری طرف سے یہ دعوت پھر بھی قائم رہتی ہے اور وہ شخص جو صدقِ دل سے صداقت کا متلاشی ہے اس کے لئے میرے گھر کے دروازے کھلے رہیں گے۔ وہ

شوق سے آئے اور قادیان میں کچھ عرصہ میرے پاس قیام کرے۔ اس عرصۂ قیام کے دوران اگر خدا تعالیٰ اسے کوئی واضح اور غیر مبہم نشان میری صداقت کا نہ دکھا دے، تو وہ شخص بے شک مجھے جھوٹا قرار دے۔ آپ نے فرمایا کہ ہر سچائی روشن آفتاب کی طرح خود اپنی دلیل ہوتی ہے، اسے کسی مصنوعی سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر خدا تعالیٰ کسی کے ساتھ ہے تو اس کے لئے اس سے بڑھ کر صداقت کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے؟ خدا کا قرب بذاتِ خود اپنی صداقت کی آپ دلیل ہے۔

حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ کی اِس صلائے عام کے نتیجہ میں قادیان کے آریوں نے ایک محضر نامہ آپ کی خدمت میں اس مضمون کا پیش کیا کہ آپ جو دُور دراز کے بسنے والے متلاشیانِ حق کو بھی قادیان آکر نشان دیکھنے کی دعوت دیتے ہیں، تو ہم جو آپ کے ہمسایہ میں رہتے ہیں، ہمیں کیوں اس سے محروم رکھا جائے۔ اس خیرات کو گھر سے شروع کیجئے اور پہلے ہمیں خدا تعالیٰ کے قرب اور رحمت کا نشان دکھایئے۔ حضرت مرزا صاحب کی زندگی میں، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اسلام کے احیائے نَو کی عظیم الشان جدوجہد کی تاریخ میں یہ موقع ایک بلند اور عظیم سنگِ میل کی حیثیت رکھتا تھا۔ آپ کا قلبِ سلیم اس یقین سے پُر تھا کہ اسلام کی صداقت اور زندگی بخش قوت کو پرکھنے کے لئے، بلکہ ایک زندہ اور صاحبِ قدرت خدا کے وجود کا ثبوت طلب کرنے کے لئے آریہ مت نے اسلام کو جو چیلنج دیا ہے، اللہ تعالیٰ کی غیرت ضرور اس موقع پر جوش مارے گی اور آپ کی گریہ وزاری کو قبول فرماتے ہوئے وہ اپنی غیر معمولی قدرت اور رحمت کا نشان دکھلائے گا۔

اب سوال یہ تھا کہ اس موقع پر کس نوعیت کا نشان طلب کیا جائے ـــ کیا معجزہ کے عامی تصوّر کے پیشِ نظر آگ پر چل کر یا پانی میں سے گزر کر دکھایا جائے یا بے ثمر درختوں سے پھل توڑا جائے، یا چند مادر زاد اندھوں کو بینائی عطا کی جائے۔ لیکن یہ سب شعبدے تو عارضی نوعیت کے تماشے تھے جن سے بنی نوع انسان کی خدمت اور اسلام کی برتری کا مستقل سامان پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر یہ اس قسم کے شعبدے تھے کہ دنیا کے بہت سے بازاری مداری بھی ان سے ملتے جلتے تماشے دکھا کر نظر کے دھوکے کا سامان کرتے رہے ہیں۔ علمی روشنی اور سائنسی ترقی کے اس زمانہ میں خدا تعالیٰ سے اس قسم کا نشان طلب کرنا ایک ایسا ہی فعل تھا جیسے ایک عظیم الشان شہنشاہ کی خاص رضامندی کے لمحات میں کوئی بدنصیب اس سے دو چار پیسے، روٹی کے ایک ٹکڑے یا پھٹے پُرانے کپڑے کا سوال کر دے!

چونکہ حضرت مرزا صاحب کا مشن عالمگیر تھا اِس لئے آپ کو ایک نشان چاہیئے تھا جو عالمگیر حیثیت کا حامل ہو اور سُورج کی طرح مشرق و مغرب پر چمکے، اور آپ کے مشن میں براہِ راست مدد و معاون ہو۔

اور اسلام کو تمام اَدیان پر غالب کرنے کا باعث بنے اور اُس کی برکتوں سے رُوئے زمین پر بسنے والی تمام قومیں حِصّہ پائیں۔ اُس وقت آپ کی عمر پچاس برس سے متجاوز ہو چکی تھی اور ظاہراً زندگی کے بیشتر ایّام گزر چکے تھے۔ دِن بدن آپ کا یہ احساس شدّت اختیار کرتا چلا جا رہا تھا کہ خدمت کے دِن تو تھوڑے رہتے جاتے ہیں اور اسلام کی فتح کا دِن ابھی دُور نظر آتا ہے۔ اِس درد میں کتنی بے قراری تھی اور یہ کرب آپ کو کیسے کیسے تڑپاتا تھا۔۔۔ اس کا کچھ اندازہ آپ کے بعض اشعار سے لگایا جا سکتا ہے جن میں سے چند ایک مثال کے طور پر پیش ہیں:-

پھر بہارِ دیں کو دکھلا اے مِرے پیارے قدیر　　کب تلک دیکھیں گے ہم لوگوں کے بہکانے کے دن
دِن چڑھا ہے دُشمنانِ دیں کا ہم پر رات ہے　　اے مِرے سُورج دِکھا اِس دیں کے چمکانے کے دن
دل گھٹا جاتا ہے ہر دم جاں بھی ہے زیر و زبر　　اِک نظر فرما کہ جلد آئیں ترے آنے کے دن
چہرہ دکھلا کر مجھے کر دیجئے غم سے رِہا　　کب تلک لمبے چلے جائیں گے ترسانے کے دن
کچھ خبر لے تیرے کُوچہ میں یہ کس کا شور ہے　　کیا مرے دِلدار تُو آئے گا مرجانے کے دن[1]

دینِ اسلام کو سرخرو اور کامران دیکھنے کی یہ سخت بے قرار تمنا لئے آپ اپنے ربّ سے اُس کی رحمت اور قربت کا نشان مانگنے کی طرف متوجہ ہُوئے اور اس غرض سے آپ نے ہوشیارپور کے قصبہ میں ایک مکان میں تنہا چالیس دن کے لئے گوشہ نشینی اختیار کی۔ چالیس دن شب و روز عبادت اور گریہ وزاری کرتے ہوتے آپ نے اپنے ربّ سے ایک ایسے باکمال فرزند کی ولادت کی التجا کی جو دینِ اسلام کی فضیلت اور کلام اللہ کا مرتبہ دنیا پر ظاہر کرنے کے لئے ہر ضروری صفت سے متصف ہو اور اسے دینِ اسلام کی کامیاب خدمت کی بھرپُور توفیق عطا ہو۔

آپ نے چالیس روز کے بعد اِس چِلّہ کے اختتام پر بذریعہ اشتہار یہ اعلان فرمایا کہ جو کچھ مَیں نے خُدا سے مانگا تھا، وہ اس نے اپنی بے پایاں رحمت اور کمال شفقت کے نتیجہ میں مجھے عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا ہے اور ایک ایسے متّصف بہ صفاتِ حسنہ ذی شان بیٹے کی ولادت باسعادت کی خوشخبری دی ہے جو اپنی غیر معمولی صفات اور عظیم الشان خدمتِ اسلام کے ذریعہ زمین کے کناروں تک شہرت پائے گا۔ آپ نے نشان کی طالب دُنیا کو بتایا کہ:

"بالہام اللہ تعالیٰ و اعلامہ عزّ و جلّ خدائے رحیم و کریم بزرگ و برتر نے جو ہر چیز پر قادر ہے جلّ شانہٗ

[1] خاتمہ حقیقۃ الوحی، صفحہ آخر مطبوعہ ۱۹۰۷ء

و عزّ اسمہٗ مجھ کو اپنے الہام سے مخاطب کرکے فرمایا :-

"مَیں تجھے ایک رحمت کا نشان دیتا ہوں اُسی کے موافق جو تُو نے مجھ سے مانگا۔ سو مَیں نے تیری تضرعات کو سُنا اور تیری دعاؤں کو اپنی رحمت سے بہ پایہ قبولیت جگہ دی اور تیرے سفر کو (جو ہوشیارپور اور لودھیانہ کا سفر ہے) تیرے لئے مبارک کردیا۔ سو قدرت اور رحمت اور قربت کا نشان تجھے دیا جاتا ہے۔ فضل اور احسان کا نشان تجھے عطا ہوتا ہے اور فتح و ظفر کی کلید تجھے ملتی ہے۔ اے مظفر تجھ پر سلام! خدا نے یہ کہا تا وہ جو زندگی کے خواہاں ہیں موت کے پنجے سے نجات پاویں اور وہ جو قبروں میں دبے پڑے ہیں باہر آویں۔ اور تا دینِ اسلام کا شرف اور کلام اللہ کا مرتبہ لوگوں پر ظاہر ہو اور تا حق اپنی تمام برکتوں کے ساتھ آجائے اور باطل اپنی تمام نحوستوں کے ساتھ بھاگ جائے اور تا لوگ سمجھیں کہ میں قادر ہوں جو چاہتا ہوں سو کرتا ہوں۔ اور تا وہ یقین لائیں کہ میں تیرے ساتھ ہوں اور تا انہیں جو خدا کے وجود پر ایمان نہیں لاتے اور خدا اور خدا کے دین اور اس کی کتاب اور پاک رسول محمد <u>مصطفٰے</u> کو انکار اور تکذیب کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ایک کھلی نشانی ملے۔ اور مجرموں کی راہ ظاہر ہوجائے۔ سو تجھے بشارت ہو کہ ایک وجیہہ اور پاک لڑکا تجھے دیا جائے گا۔ ایک زکی غلام (لڑکا) تجھے ملے گا۔ وہ لڑکا تمہارا مہمان آتا ہے۔ اس کا نام عنموائیل اور بشیر بھی ہے۔ اس کو مقدس روح دی گئی ہے اور وہ رِجس سے پاک ہے اور وہ نور اللہ ہے۔ مبارک وہ جو آسمان سے آتا ہے۔ اس کے ساتھ فضل ہے جو اس کے آنے کے ساتھ آئے گا۔ وہ صاحبِ شکوہ اور عظمت اور دولت ہوگا۔ وہ دنیا میں آئے گا اور اپنے مسیحی نفس اور رُوح الحق کی برکت سے بہتوں کو بیماریوں سے صاف کرے گا۔ وہ کلمۃ اللہ ہے کیونکہ خُدا کی رحمت و غیوری نے اُسے کلمہ تمجید سے بھیجا ہے۔ وہ سخت ذہین و فہیم ہوگا۔ اور دِل کا حلیم اور علومِ ظاہری و باطنی سے پُر کیا جائے گا۔ اور وہ

تین کو چار کرنے والا ہوگا (اس کے معنے سمجھ میں نہیں آئے) دوشنبہ ہے مبارک دوشنبہ۔ فرزند دلبند گرامی ارجمند۔ مظہر الاوّل والآخر، مظہر الحق والعلاء۔ کانّ اللہ نزل من السماء۔ جس کا نزول بہت مبارک اور جلالِ الٰہی کے ظہور کا موجب ہوگا۔ نُور آتا ہے نُور جس کو خدا نے اپنی رضامندی کے عطر سے ممسوح کیا۔ ہم اس میں اپنی روح ڈالیں گے اور خدا کا سایہ اس کے سَر پر ہوگا۔ وہ جلد جلد بڑھے گا اور اسیروں کی رُستگاری کا مُوجب ہوگا اور زمین کے کناروں تک شہرت پائے گا اور قومیں اس سے بَرکت پائیں گی۔ تب اپنے نفسی نقطہ آسمان کی طرف اٹھایا جائے گا۔ وَكَانَ اَمْـرًا مَّقْضِيًّا "[1]

اس پیشگوئی کے شائع ہونے پر ہندوستان کے مذہبی دنگل میں جو ہنگامہ برپا ہوا اس کی تفصیل ایک الگ کتاب کی متقاضی ہے اور اس موضوع پر متعدد رسالہ جات اور کتب شائع ہو چکی ہیں۔ اس جگہ ہم نہایت اختصار کے ساتھ محض پس منظر کو واضح کرنے کے لئے اُس ملک گیر ردِّ عمل کا خلاصہ درج کرتے ہیں جو اس پیشگوئی کے نتیجہ میں ظاہر ہوا:۔

۱۔ بعض مخالفین جو نسبتاً زیادہ سنجیدہ تھے اس فکر میں مبتلا ہوئے کہ بیٹا تو اتفاقاً بھی ہو سکتا ہے لہٰذا یہ پیشگوئی اگر پوری بھی ہو جائے تو اسے کوئی خاص نشان قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۲۔ حضرت مرزا صاحب کی بڑی عمر اور کمزور صحت کو دیکھ کر اور اس وہم میں مبتلا ہو کر کہ چونکہ آپ نے نعوذ باللہ خدا پر بہتان باندھا ہے، مخالفین یہ یقین کر بیٹھے کہ بیٹا تو الگ رہا بیٹی بھی ان کو نصیب نہ ہوگی اور نعوذ باللہ یہ نامراد اور بعد از پیشگوئی بے اولاد اس دنیا سے اٹھ جائیں گے۔

آیئے ہم اوّل الذکر فریق کے ردّ عمل کا تجزیہ کرتے ہیں کیا واقعی پچاس سال سے متجاوز عمر کا ایک انسان جس کی تمام زندگی ایک مقصد کے حصول میں صرف ہوئی ہو اور جس نے اپنی زندگی کے بیشتر ایام اور راتیں اس مقصد کی پیروی میں انتہائی جسمانی، ذہنی اور روحانی مشقت کے ساتھ بسر کی ہوں، جس نے بکمال اپنے مال اور جان اور وقت اور عزت اور جذبات کو اس مقصد کی قربان گاہ کی بھینٹ چڑھا دیا ہو، کیا وہ اپنے عزیز ترین مقصد کو محض موہوم تمنا کی نذر کر سکتا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک

---

[1] اشتہار ۲۰ فروری ۱۸۸۶ء، مندرجہ تبلیغ رسالت جلد اوّل صفحہ ۵۸ تا ۶۰ و مجموعہ اشتہارات جلد اوّل صفحہ ۱۰۱ تا ۱۰۲

ایسا شخص جس کی اپنی زندگی ہر آن خطرے میں ہو اور جو چاروں طرف سے دشمن کے نرغے میں گھرا ہُوا ہو، کیا ہندو اور کیا عیسائی کیا سکھ اور کیا دیگر مذاہب کے پیروکار ہر مذہب وملّت کے ماننے والے اس کے خون کے پیاسے ہوں حتیٰ کہ خود اپنے ہم مذہب اسکے خون کی پیاس میں کسی دوسرے سے پیچھے نہ رہے ہوں۔ غیر تو غیر خود اپنے آبائی گھروں میں بسنے والے اپنے ہی خاندان کے افراد اِس مذہبی عداوت میں غیروں پر بازی لے جا رہے ہوں۔ کون ہے جو ان حالات میں ایک ایسی من گھڑت پیشگوئی کرنے کی جرأت کرے جس کے پورا ہونے کا انحصار دوسرے اتفاقات کے علاوہ لازماً اس اتفاق پر بھی مبنی ہو کہ پیشین گو پیشگوئی کے بعد ایک معقول مدّت تک زندہ رہے گا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کی رفیقہ حیات کی زندگی کی ضمانت بھی اسوقت تک اس میں شامل ہو جب تک خدا تعالیٰ اس کی گود ایک موعود بیٹے سے ہری نہیں کر دیتا۔ ظاہر ہے کہ اگر صرف یہی اتفاقات پیش نظر ہوتے تو بھی کسی شخص کو اپنی صداقت اور کذب کا انحصار ان اتفاقات پر رکھنے کی جرأت نہ ہوتی لیکن اتفاقات کا یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ پیشگوئی صرف ایک بیٹے کی پیدائش کی نہیں بلکہ ایک ایسے عظیم الشان فرزند کی ولادت کی ہے جس کے آنے سے ایک روحانی انقلاب کی داغ بیل ڈالی جانے والی ہے۔ اس ضمن میں خود حضرت مرزا صاحب نے اپنے معترضین کو جو جواب دیا ہے، وہ آپ کے اپنے الفاظ ہی میں پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:-

> "اس جگہ آنکھیں کھول کر دیکھ لینا چاہیئے کہ یہ صرف پیشگوئی ہی نہیں بلکہ ایک عظیم الشان نشانِ آسمانی ہے جس کو خدائے کریم جلّ شانہٗ نے ہمارے نبیؐ کریم رؤف و رحیم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلّم کی صداقت و عظمت ظاہر کرنے کے لئے ظاہر فرمایا ہے اور درحقیقت یہ نشان ایک مُردہ کے زندہ کرنے سے صدہا درجہ اعلیٰ و اولیٰ و اکمل و افضل و اَتم ہے کیونکہ مُردہ کے زندہ کرنے کی حقیقت یہی ہے کہ جنابِ الٰہی میں دُعا کر کے ایک رُوح واپس منگوایا جاوے اور ایسا مُردہ زندہ کرنا حضرت مسیح اور بعض دیگر انبیاءؑ علیہم السلام کی نسبت بائیبل میں لکھا گیا ہے، جس کے ثبوت میں معترضین کو بہت سی کلام ہے اور پھر باوصف ان سب عقلی و نقلی جرح و قدح کے یہ بھی منقول ہے کہ ایسا مُردہ صرف چند منٹ کے لئے زندہ رہتا تھا اور پھر دوبارہ اپنے عزیزوں کو دُوہرے ماتم میں ڈال کر اس جہان سے رخصت

ہو جاتا جس کے دُنیا میں آنے سے نہ دنیا کو کچھ فائدہ پہنچتا تھا نہ خود اس کو آرام ملتا تھا اور نہ اس کے عزیزوں کو کوئی سچی خوشی حاصل ہوتی تھی، سو اگر حضرت مسیح علیہ السلام کی دعا سے بھی کوئی رُوح دنیا میں آتی تو درحقیقت اس کا آنا نہ آنا برابر تھا اور بفرضِ محال اگر ایسی رُوح کئی سال جسم میں باقی بھی رہتی، تب بھی ایک ناقص رُوح کسی رذیل یا دُنیا پرست کی جو احد من الناس ہے دُنیا کو کیا فائدہ پہنچا سکتی تھی؟ مگر اس جگہ بفضلہ تعالیٰ واحسانہ وببرکت حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، خداوند کریم نے اس عاجز کی دُعا کو قبول کر کے ایسی بابرکت رُوح بھیجنے کا وعدہ فرمایا جس کی ظاہری وباطنی برکتیں تمام زمین پر پھیلیں گی۔ سو اگرچہ بظاہر یہ نشان احیائے موتیٰ کے برابر معلوم ہوتا ہے مگر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ نشان مُردوں کے زندہ کرنے سے صدہا درجہ بہتر ہے۔ مُردہ کی بھی رُوح ہی دُعا سے واپس آتی ہے اور اس جگہ بھی دُعا سے ایک رُوح ہی منگائی گئی ہے۔ مگر اُن رُوحوں اور اس رُوح میں لاکھوں کوسوں کا فرق ہے۔ جو لوگ مسلمانوں میں چھپے ہوئے مُرتد ہیں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کا ظہور دیکھ کر خوش نہیں ہوتے بلکہ اُن کو بڑا رنج پہنچتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟"[1]

پس یہ امر خوب ذہن نشین رہے کہ محض ایک بیٹے کی ولادت کی پیشگوئی نہیں کی گئی، ایک ایسے فرزندِ جلیل کی پیشگوئی کی گئی ہے جو عمر پانے والا ہوگا، نہایت ذکی اور فہیم ہوگا۔ صاحب شکوہ اور عظمت اور دولت ہوگا۔ قومیں اس سے برکت پائیں گی۔ وہ علومِ ظاہری و باطنی سے پُر کیا جائے گا۔ کلام اللہ یعنی قرآن کریم کا نہایت گہرا فہم اس کو عطا ہوگا اور اس خداداد فہم سے کام لے کر وہ قرآن کی ایسی عظیم الشان خدمت کی توفیق پائے گا کہ کلام اللہ کا مرتبہ دنیا پر ظاہر ہو۔ وہ اسیروں کی رستگاری کا موجب ہوگا۔ وہ عالم کباب ہوگا یعنی اس کے دورِ حیات میں ایسی عالمگیر تباہیاں آئیں گی جو سب دُنیا کو بھون کر رکھ دیں گی۔ وہ زمین کے کناروں تک شہرت پائے گا۔

کیا یہ تمام صفات اور ان کے علاوہ اور بہت سی خصوصیات جو اس موعود بیٹے کی بیان کی گئی ہیں، محض ایک کے بعد دوسرے رونما ہونے والے اتفاق پر آس لگا کر بیان کی جا سکتی ہیں؟

وہ شخص جس کی اپنی زندگی خطرے میں ہو جس کی اپنی شہرت اور اس کے سلسلہ کی بقاء دُنیا کی نظر

---

[1] تبلیغ رسالت جلد اوّل صفحہ ۷۳-۷۴، و اشتہار ۲۰ مارچ ۱۸۸۶ء مندرجہ مجموعہ اشتہارات جلد اوّل صفحہ ۱۱۴-۱۱۵

میں چند دن کا کھیل ہو جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جا رہا ہو کہ خدا پر افترا کرنے والا ہے اور اس جرم کی پاداشں میں خدا کا قہری ہاتھ اُسے آج یا کل اس طرح نیست و نابود کرنے والا ہے کہ صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لئے اُس کا نشان مٹ جائے گا۔ اگر وہ مرد صادق نہ ہوتا تو کیسے ممکن تھا کہ ان حالات میں وہ ایسے عظیم الشان اور بے نظیر، صاحب عظمت و شکوہ بیٹے کی ولادت کی پیشگوئی کرنے کی جرأت کرتا جس کے پورا نہ ہونے کے ظاہری امکانات پورا ہونے کے امکانات سے ہزاروں گنا بڑھ کر تھے۔

اس حقیقت سے آنکھیں بند کرنا انصاف کا خون کرنا ہے کہ جس بیٹے کی ولادت کی خبر دی جا رہی ہے، وہ ہزاروں میں سے ایک — نہیں، لاکھوں میں سے ایک — نہیں، کروڑوں اور اربوں میں سے ایک ہے۔

صرف یہی نہیں کہ مجموعی طور پر اس پیشگوئی کو پورا کر دکھانا کسی انسان کے بس کی بات نہیں، بلکہ اس پیشگوئی کے بہت سے اجزاء ایسے ہیں جن میں سے کسی ایک کو پورا کرنے کی بھی کسی انسان کو قدرت نہیں۔ کون ایسا مسلمان ہے جو سخت جرأت اور بے باکی دکھاتے ہوئے اپنے اس دعویٰ کو خدا کی طرف منسوب کر سکتا ہے کہ اسے ایک ایسا بیٹا عطا ہو گا جو کلام اللہ کا مرتبہ اور شرف تمام دنیا پر ظاہر کر دے گا۔ کون عیسائی ایسا ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ اس کے بیٹے کو بائبل کا ایسا علم عطا ہو گا کہ تمام دنیا پر بائبل کی فضیلت ثابت کر دکھائے گا۔ اور کون ہندو ہے جو ویدوں کے بارہ میں اور کون سکھ ہے جو گرنتھ کے متعلق اپنے پیدا ہونے والے بیٹے کی طرف یہ خدمت منسوب کر سکے —؟

بیٹے ایسے دعویٰ کے بعد پیدا ہوں بھی تو مر جاتے ہیں اور اگر زندہ بھی رہیں تو سو طرح کی بیماریاں اور ناگہانی آفات ان کی راہ روکے کھڑی رہتی ہیں۔ ان سب آفات سے بچ بھی نکلیں تو وہ ذہنی قابلیتیں پیدا کرنا ان کے بس کی بات نہیں ہوتی جو علمی نشوونما کا موجب بنتی ہیں۔ ایسی قابلیتیں پیدا ہو بھی جائیں تو اُن کے ضائع ہونے یا غلط راستوں پر بھٹک جانے کے خطرات، صحیح راستوں پر گامزن ہونے کے امکانات کی نسبت زیادہ ہوتے ہیں اور اگر وہ صحیح راستوں کی طرف چل بھی پڑیں تو کوئی نہیں جو اُن کی دلچسپی کا رُخ خاص سمت میں موڑ سکے، کوئی نہیں جو یہ تعیین کر سکے کہ علم کی بے شمار شاخوں میں سے کون سی شاخ ان کو مرغوب ہو گی۔ اگر رجحان مذہبی بھی ہو تو کون ضمانت دے سکتا ہے کہ باپ کا مذہب ہی بیٹے کو مرغوب ہو گا۔ اگر حُسنِ اتفاق سے ایسا بھی ہو جائے تو اس مذہب کی کتابِ مقدس سے مالا مال ہو جانا اور غیر مذاہب کی کتب پر اس کی فضیلت ثابت کرنے کی توفیق پا جانا یہ بھلا کس کس کو نصیب ہوتا ہے۔ یہ بحث تو آگے آئے گی کہ کس حد تک حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب کو یہ توفیق نصیب ہوئی۔ یہاں ذکر صرف اتنا ہے کہ کون باپ

اپنے بیٹے کے حق میں جو ابھی پیدا بھی نہ ہوا ہو۔ یہ دعویٰ کرنے کی جرأت کر سکتا ہے اور اپنی سچائی کا دارومدار اِس دعویٰ کے پورا ہونے پر رکھ سکتا ہے۔ پھر اگر یہ توفیق میسّر آ بھی جائے کہ اپنے مذہب کے مقدّس صحیفہ کے اسرار و معارف پر اس قدر دسترس حاصل کرے تو وہ ذرائع میسّر آنے کی ضمانت کیا ہے جن سے کام لے کر وہ اپنے خداداد انکشافات کو مختلف زبانوں کے تراجم میں ڈھال کر دنیا کے کونے کونے تک پہنچانے کا انتظام کر سکے۔ انتہائی ناسمجھی اور سخت تعصّب سے کام لئے بغیر کون یہ کہہ سکتا ہے کہ ایسی عظیم الشان پیشگوئی کرنا اور پھر اس کا پُورا ہو جانا نعوذ باللہ ایک مُفتری کا کام بھی ہو سکتا ہے اور اتفاقاً بھی یہ واقعہ ظہور پذیر ہو سکتا ہے اور خدا تعالیٰ کی قُربت اور محبّت کا اس میں کوئی نشان نہیں۔

اگر ایسا ممکن ہوتا تو کیوں اِس نوعیّت کی پیشگوئی کسی مخالف نے عملاً کر کے نہ دکھا دی؟ اس واقعہ کو تو ستاسّی برس گزر چکے ہیں، گویا ایک صدی تمام ہوا چاہتی ہے۔ کیا آج بھی کوئی ہے جو ایسا کرنے کی جرأت کر سکے یا کل کوئی ہو گا؟ چیلنج کا یہ ابد تک پھیلا ہوا راستہ ہے، کون ہے جو اس پر قدم مارنے کی جرأت کرے گا؟

اللہ تعالیٰ کے اِذن کے بغیر ایسی پیشگوئی نہ کوئی کر سکتا تھا نہ کر سکے گا۔ سوائے اس کے کہ خود اپنے ہی ہاتھوں اپنی ابدی ذلّت اور رُسوائی کا سامان کرنا چاہے۔ ہم یہ دعویٰ کسی اندھے عقیدہ کی وجہ سے نہیں کر رہے بلکہ ہر منصف مزاج اسی شدّت کے ساتھ اس دعویٰ کی تصدیق کرے گا اور اگر خدا تعالیٰ کا کوئی وجود ہے اور وہ ہمارے افعال پر نظر رکھتا ہے اور کارخانۂ قدرت کے سیاہ و سفید میں اس کا کوئی عمل دخل ہے تو گو یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ کوئی شخص اپنے پاگل پن میں یا ازراہِ افترا کوئی ایسی بڑ ہانک دے جس کا تعلق آئندہ تین چوتھائی صدی پر پھیلے ہُوئے واقعات سے ہو۔ لیکن یہ بہر حال باور نہیں کیا جا سکتا کہ ایک زندہ اور فعّال ربّ جو تمام قوانینِ قدرت کی باگ ڈور سنبھالے ہوتے ہو، وہ اس جھوٹے دعویدار کے مُنہ سے نکلی ہوئی ایک ایک بات کو پُورا کر دکھائے اور اسے غیب کے اُن اَن گنت مخفی در مخفی اسباب پر غلبہ عطا کرے جن پر ایک خاص شکل اور خاص ترتیب سے خاص وقتوں پر ہی مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات کا انحصار ہوتا۔ انہی اشکالِ ضروریہ کی وجہ سے گذشتہ ایک صدی میں حضرت مرزا صاحب کے سوا کوئی اور شخص ایسا دعویٰ نہ کر سکا۔ ہاں صرف ایک بدقسمت کو یہ جرأت ہوئی کہ اس پیشگوئی کے بالمقابل اور برعکس ایک منفی نوعیت کی پیشگوئی کرے۔ اس پیشگوئی کرنے والے کا حال چونکہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ آگے بیان کیا جائے گا، لہٰذا فی الحال ہم اس مضمون کو چھوڑ کر موخر الذکر مخالف طبقہ کے ردّعمل کو لیتے ہیں:-

مؤخر الذکر طبقہ جو دراصل اس پیشگوئی میں دلچسپی رکھنے والوں کی اکثریت پر مشتمل تھا اور جس میں بکثرت مولوی بھی شامل تھے اور پادری بھی اور پنڈت بھی اور مہنت اور پیر فقیر بھی پیشگوئی کے شائع ہوتے ہی اس کی نامرادی کا انتظار کرنے لگے۔ بعض تو ان میں سے ایسے تھے کہ وقت سے قبل ہی تمسخر اور استہزاء میں مصروف ہوگئے۔ اور بعض بڑی بے صبری سے موقع کے انتظار میں دن کاٹنے لگے۔ اس پیشگوئی کے بعد پہلی ولادت میں حضرت مرزا صاحب کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی۔ ۱۵ اپریل ۱۸۸۶ء کو بچی کا پیدا ہونا تھا کہ اس طبقہ کی طرف سے ہنسی ٹھٹھے کا ایک شور بلند ہوا اور مخالف اخبارات میں پے در پے اعلانات ہوئے کہ "مرزا کی پیشگوئی جھوٹی نکلی"۔

حضرت مرزا صاحب نے ان مخالفین کو بار بار توجہ دلائی کہ پیشگوئی میں یہ خبر تو دی ہی نہیں گئی کہ اس پیشگوئی کے بعد پہلا بچہ لڑکا ہی ہوگا۔ بلکہ واضح طور پر اس موعود بچے کے نو سال کے عرصہ میں پیدا ہونے کا ذکر تھا۔ لیکن باوجود اس حقیقت سے آگاہ ہونے کے مخالفین ایک مدت تک انجان بنے رہے اور تمسخر اور استہزاء سے دل بہلا کر اپنے اپنے دینوں کی بزعم خود بھاری خدمت سرانجام دیتے رہے۔

بلاشبہ تاریخ اَبنائے عالم کسی دوسرے ابنِ آدم کی پیدائش سے قبل ایسے ہنگامہ کا منظر پیش نہیں کرتی اور اس کی کوئی نظیر مذہبی یا غیر مذہبی دُنیا میں بھی نہیں ملتی کہ ایک بچہ جو ابھی پیدا بھی نہ ہُوا ہو، محلِ نزاع بن جائے اور اس کا امکانی وجود کروڑوں انسانوں کی بحث کا موضوع ہو جائے اور مختلف مذاہب کے ہزار ہا رہنما اس کی پیدائش سے قبل دل کی گہرائیوں سے یہ آرزو کریں کہ کاش وہ پیدا ہی نہ ہو۔ اور اگر وہ پیدا ہو بھی جائے تو خدا کرے کہ لُولا لنگڑا یا مفلوج اور ہزار قسم کے عیوب لئے دنیا میں آئے تا کہ ان کے جذبۂ بغض و عناد کو تسکین ملے اور حاسدوں کے دلوں کو ٹھنڈک نصیب ہو۔ پھر جس کے متعلق لاکھوں دلوں میں یہ تمنائیں مچلتی ہوں کہ اگر وہ صحت مند ہی پیدا ہو جائے تو کاش ایسا ہو کہ وہ اُن کی آنکھوں کے سامنے پروان چڑھنے سے پہلے ہی مَر جائے یا بہت سے ایسے وبال اُس پر آ پڑیں کہ کسی کام کے قابل نہ رہے۔ یعنی زندہ رہے بھی تو اپنے چاہنے والوں کے دلوں کا ناسُور بن کر زندہ رہے۔

یہ وہ منفرد بچہ تھا جس کی پیدائش سے قبل مذہبی دنیا نے ایک ایسا دلچسپ واقعاتی ڈرامہ دیکھا جس میں وہ تمام عناصر جمع ہوگئے تھے جو ایک ڈرامہ کی روحِ رواں ہوتے ہیں۔ آیئے! دیکھیں کہ مستقبل پر پڑا ہُوا غیب کا تاریک پردہ کب اٹھتا اور ہمیں کیا دکھاتا ہے؟

جب حاسدین اور مخالفین کے اس مؤخر الذکر گروہ میں، جس کا ذکر چل رہا ہے، آریہ مت کا نامور پہلوان لیکھرام بھی دندناتا ہُوا آن کُودا۔ حضرت مرزا صاحب کے مدمقابل تمام مذہبی رہنماؤں میں وہ واحد

شخص تھا جس نے یہاں تک بے باکی سے کام لیا کہ حضرت مرزا صاحب کے جھوٹے ہونے کا صرف دعویٰ ہی نہیں کیا بلکہ آپ کی پیشگوئی کے مقابل پر ایک اپنی پیشگوئی بھی خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرکے شائع کر دی۔ اس پیشگوئی نے ایک نیا اور نہایت ہی دلچسپ عنصر اس مقابلہ میں شامل کر دیا یعنی عملاً اس دعویٰ کا ثبوت پیش کرنے کی کوشش کی گئی کہ خدا تعالیٰ کی طرف جھوٹی پیشگوئیاں منسوب کرنا کس قدر آسان ہے!

لیکھرام کی یہ پیشگوئی منفی پہلو رکھتی تھی یعنی ہر وہ خوشخبری جو حضرت مرزا صاحب نے خدا تعالیٰ کی طرف سے اپنے حق میں بیان فرمائی' لیکھرام کی پیشگوئی میں خدا تعالیٰ ہی کی طرف منسوب کرکے اس کا ردّ کیا گیا اور ہر اچھی خبر کے مقابل پر ایک بُری اور منحوس خبر رکھ دی گئی' اور اس طرح یہ انتہائی دلچسپ مذہبی مقابلہ اپنے معراج کو پہنچا جبکہ وہ بچہ جس کے بارہ میں شرق و غرب کا بُعد رکھنے والی متقابل پیشگوئیاں کی جا رہی تھیں' ابھی نیست سے وجود میں نہیں آیا تھا۔

بغرض موازنہ لیکھرام کی پیشگوئی بھی غیر معمولی اہمیّت کی حامل اور اس لائق ہے کہ اس کا نہایت غور سے مطالعہ کیا جائے' کیونکہ:

۱ —— اس کے مطالعہ سے رات اور دن' ظلمت اور نُور کا فرق بڑا کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ ایک طرف حضرت مرزا صاحب کی مثبت پیشگوئی رکھیے' دوسری طرف پنڈت لیکھرام کی منفی پیشگوئی اور یہ حقیقت نہ بھولیے کہ یہ دونوں ہی خدائے واحد کی طرف منسوب کی جا رہی ہیں' یہ ایک نہایت دلچسپ اور بصیرت افروز موازنہ ہے۔

۲ —— پیشگوئی کا مطالعہ اس لئے بھی اہم ہے کہ اس پیشگوئی کے نتیجہ میں ہمیں اپنے ہی زمانہ میں عملاً یہ موقع نصیب ہو گیا کہ خدا تعالیٰ پر جھوٹ بولنے والوں سے خدا تعالیٰ کے سلوک کا مشاہدہ کر سکیں۔ ایک خدا کی طرف دو مختلف مذاہب کے رہنماؤں کی طرف سے دو متضاد اور متخالف پیشگوئیوں کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دونوں میں سے ایک ضرور جھوٹی ہے۔

۳ —— پیشگوئی کا مطالعہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس میں مخالفین کے جذبات کی ساری روح سمٹ کر آگئی ہے۔ اگرچہ لیکھرام بحیثیت آریہ لیڈر ہونے کے عیسائی یا مسلمان مخالفین کی نمائندگی نہیں کر سکتا تھا لیکن مرزا صاحب سے خدا تعالیٰ کے جس سلوک کی بے قرار تمنّا سب مخالفین کے دلوں میں شدّت سے مچل رہی تھی'

اُس کی اِس سے زیادہ صحیح اور مکمل تصویر نہیں کھینچی جا سکتی تھی۔

یہ مسئلہ کہ خدا تعالیٰ کی فعلی شہادت نے ہمیں کیا دکھایا — ؟ ناظرین آئندہ صفحات کے مطالعہ سے بآسانی معلوم کر سکیں گے۔

لیکھرام کی پیشگوئی کے اہم نکات حسب ذیل ہیں۔ یہ تمام پیشگوئی لکھنے سے ہم اس لئے قاصر ہیں کہ اس کی زبان نہایت دِلآزار ہے جسے دُہرانے کے ہم متحمل نہیں ہو سکتے۔ پس بامر مجبوری اس میں سے صرف وہ مخالفانہ دعاوی پیش کئے جا رہے ہیں جو حضرت مرزا صاحب کی پیشگوئی کے کسی حصہ کی تردید یا نفی میں کئے گئے ہیں۔ الفاظ من و عن پنڈت لیکھرام کے اپنے ہیں:

تقابلی نقشہ

پیشگوئی حضرت مرزا غلام احمد صاحبؑ بہ نسبت مصلح موعود	مخالفانہ پیشگوئی پنڈت لیکھرام بہ نسبت پسرِ موعود (نقلِ کُفر کُفر نہ باشد)
ـــ "خدا نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ مَیں تجھے ایک رَحمت کا نشان دیتا ہوں"	"رَحمت کا نہیں زحمت کا کہا ہوگا' آپ تو ہر بات کو اُلٹی سمجھتے ہیں اور "ر' ز" میں امتیاز نہیں رکھتے۔"
ـــ "تیرے سفر کو (جو ہوشیارپُور اور لُدھیانہ کا سفر ہے) تیرے لئے مبارک کر دیا"	"خُدا اس سفر کو نہایت منحوس بتلاتا ہے آپ نے شاید لودہانہ میں بنّا کنجر کی سرائے میں جیل خانہ کے متصل فروکش ہونے کو مبارک سمجھا ہوگا۔"
ـــ "سو قدرت اور رَحمت کا نشان تجھے دیا جاتا ہے۔"	"خُدا کہتا ہے مَیں نے قہر کا نشان دیا ہے۔ رحمت کا نشان تو صرف بنّا کنجر کی سرائے تھی اور بس"
ـــ "اے مظفر! تجھ پر سلام" "خُدا نے کہا تا وہ جو زندگی کے خواہاں ہیں	"اے منکر و مکّار تجھ پر آلام"۔ "خُدا کہتا ہے کہ میں جلد مصنوعی کو فی النار

موت کے پنجہ سے نجات پاویں اور وہ
جو قبروں میں دبے پڑے ہیں باہر آویں"
"تا دینِ اسلام کا شرف اور کلام اللہ کا
مرتبہ لوگوں پر ظاہر ہو۔"

• ـــ "اور تا حق اپنی تمام برکتوں کے ساتھ
آجائے اور باطل اپنی تمام نحوستوں
کے ساتھ بھاگ جائے"

• ـــ "میں تیرے ساتھ ہوں"

• ـــ "سو تجھے بشارت ہو کہ ایک وجیہہ اور
پاک لڑکا تجھے دیا جائے گا۔ ایک ذکی
غلام لڑکا تجھے ملے گا۔ وہ لڑکا تیرے
ہی تخم سے ہوگا۔"

کروں گا۔ اور قبر سے نکال کر جہنم میں
ڈالوں گا"

"آج تک گویا جس کا نام اسلام ہے وہ
محض خیالِ خام تھا اور جس کا نام قرآن
تھا، وہ شرف کے مرتبہ سے برکسران تھا
اب مرزا کی بدولت شرف و مرتبہ لوگوں پر
ظاہر ہوگا اور قرآن و اسلام کا نام باہر ہوگا"

مرزا ہی کے منہ سے ثابت ہوا کہ اب تک
دینِ اسلام میں باطل اپنی تمام نحوستوں
کے ساتھ موجود تھا اور حق مع اپنی برکتوں
کے مفقود۔ اب ساحرِ قادیانی کے وجود
سے حق آوے گا اور باطل جاوے گا"

"پہلے پیشوایان کے ساتھ کون تھا؟ کیا
شیطان بے عنوان تھا۔ البتہ خدا کا یہ
فرمان تھا کہ مرزا کا ساتھی نہیں، اس کا
مددگار شیطان ہے"

"خدا نے یہ فقرہ سن کر مسکرا کر فرمایا کہ
تو اس فریب کو سمجھا؟ عرض کیا کہ میں
تو دو کوس کے فاصلے پر رہتا ہوں، مجھے
کیا معلوم ہے ... کیا واقعی لڑکا ہوگا؟
فرمایا، نہیں لڑکی۔ مگر اپنا الہام سچا کرنے
کو مرزا اس وقت ضرور فریب کھیلے گا
اور اسی وقت ہم تجھ کو اطلاع دیں گے

مرزا صاحب! اب میرا سوال ہے کہ آپ کے یہ لڑکا اب کی دفعہ ہوگا یا دوسری نوبت الہام میں؟ تاہم عبارت اصل لکھی ہے کہ اگر اب کی دفعہ لڑکا ہوگیا تو الہام سچا ثابت، ورنہ دوسری دفعہ کی تاریکی بتا دیں گے۔ کیوں صاحب! اب خُدا نے آپ کو پاک اور ذکی لڑکا دینے کی بشارت دی ہے۔ کیا پہلے لڑکے دو تو کریہ منظر، ناپاک ترغیبی ہیں اور کیا اپنی ذرّیت سے ہونے میں کچھ شبہ بھی ہے؟ مرزا صاحب! واقعی اب آپ کے کمالات پیغمبروں کے ساتھ خوب مشابہ ہو چلے ...

■— "اُس کا نام عنموائل اور بشیر بھی ہے"

■— "مبارک وہ جو آسمان سے آتا ہے"۔

■— "وہ صاحبِ شکوہ اور عظمت اور دولت ہوگا"

■— "وہ دُنیا میں آئے گا اور اپنے مسیحی نفس

"ہم نے سُنا خُدا کہتا ہے اس کا نام عزرائیل اور شریر بھی ہے"۔

"خدا کہتا ہے وہ آسمانی گولا نہایت منحوس ہے جو پاتال کو جاتا ہے"

"شاید صاحبِ ذلّت و نحوست و نکبت ہوگا"۔

"خدا کہتا ہے وہ مرزا کی طرح دُنیا میں

اور رُوح الحق کی برکت سے بہتوں کو بیماریوں سے صاف کرے گا۔"	آکر اعزازِ شیطانی نفس اور رُوح منحوس کی نحوست سے بہتوں کو دائم المریض کرکے واصل فی النار کرے گا اور آخر کو خود بھی اس میں پڑے گا اور اس کا خر دجّال ہوگا۔"
مـــ "وہ سخت ذہین و فہیم ہوگا۔"	"وہ نہایت غبی اور کودن ہوگا۔"
مـــ "اور دِل کا حلیم اور علومِ ظاہری و باطنی سے پُر کیا جائے گا۔"	"خدا کہتا ہے وہ نہایت غلیظ القلب ہوگا اور علومِ صوری و معنوی سے قطعی محروم ہوگا"
مـــ "نُور آتا ہے نُور جس کو خُدا نے اپنی رضا مندی کے عطر سے ممسُوح کیا۔"	"آیا آپ اور آپ کے دونوں لختِ جگر ظلم محض تھے جن کو خُدا نے اپنے قہر غضب کے قطران سے متعفّن اور گندہ کیا' اس کو بھی خدا اِسی تھیلی کا بٹا بتاتا ہے"
مـــ "اور اسیروں کی رستگاری کا مُوجب ہوگا۔"	"کیا پہلا ثلاثہ امیروں فقیروں کی قید کا باعث ہُوا۔اب خُدا کہتا ہے کہ وہ دائم الحبس ہوگا۔"
مـــ "اور زمین کے کناروں تک شہرت پائے گا"	"پہلا ثلاثہ کیوں گمنام رہا؟ اب کہتا ہے محض خلاف ہے۔اس رذیل کا نام قادیان میں بھی بہت سے نہ جانیں گے"
مـــ "میں تیری ذُرّیت کو بہت بڑھاؤں گا اور برکت دُوں گا۔"	"شاید خدا کہتا ہے میں مرزا کی ذُرّیت کو منقطع کروں گا اور نحوست دوں گا۔ مرزا صاحب! آپ ہر ایک بات کو الٹی ہی سمجھتے ہیں ؎ نہ ہو کیونکر تمہارا کار اُلٹا تم اُلٹے بات اُلٹی یار اُلٹا "
مـــ "مگر بعض اُن میں سے کم عُمری میں فوت ہوں گے۔"	"بعض قادیانی ہے اصل میں کلّھم حکمِ ربّانی ہے۔"
مـــ "تیری ذرّیت منقطع نہ ہوگی اور آخری	"آپ کی ذُرّیت بہت جلد منقطع ہو جائے گی۔

دِنوں تک سرسبز رہے گی"۔ | ۔غایت درجہ تین سال تک شہرت رہے گی"۔ [1]

پنڈت لیکھرام کے طرزِ کلام کو دیکھ کر مبادا کسی کو شبہ گزرے کہ یہ شخص آریہ لیڈر نہیں بلکہ یوں ہی کوئی غیر معروف ناقابلِ التفات شخص تھا۔ آریہ وَرت میں پنڈت لیکھرام کے مقام اور شخصیت کے بارہ میں مختصر تعارف کُلیات آریہ مسافر کے دیباچہ سے پیش خدمت ہے :۔

= "آریہ سماج کے دائرہ میں پنڈت لیکھرام کا نام بچے سے لے کر بوڑھے تک جانتا ہے اور جب تک آریہ سماج کا وجود ہے، پنڈت جی کی شہادت کسی کو نہیں بھول سکتی" [2]

= "سوائے پنڈت لیکھرام کے اور کوئی شخص اس کام کے لائق نہ سمجھا گیا۔ اس وقت سے برابر ویشا تنتروں میں ویدک دھرم کا پرچار کرتے ہوئے آریہ مسافر نے وہ شہرت حاصل کی جو شاید ہی کسی موجودہ مذہبی واعظ کے نصیب ہوتی ہو گی" [3]

= "آریہ سماج کے لٹریچر میں سے شری سوامی دیانند جی کی تصانیف کے بعد اگر کسی لٹریچر کی زیادہ مانگ ہے تو وہ آریہ مسافر (پنڈت لیکھرام) کی تصانیف ہیں" [4]

= "پنڈت لیکھرام کا شمار گو اس جماعت میں نہیں ہو سکتا جس میں بُدھ اور شنکر نانک اور دیانند وغیرہ اپنے چندر رُوپ سے سنسار کو روشن کرتے ہوئے شانتی کی برشا کر رہے ہیں۔ لیکن اس میں سندیہ نہیں کہ وہ (پنڈت لیکھرام) اُن چمکتے ہُوئے ستاروں میں سے ایک تھے جو کہ ایسے چندرماؤں کی شوبھا کو دوبالا کر رہے ہیں" [5]

آیئے اب ہم کچھ دیر کے لئے لیکھرام کو اس کے حال پر رہنے دیں۔ مستقبل کے وہ پردے ایک ایک کرکے اُٹھ چکے ہیں جن کے پیچھے اس مقابلے کے سچ اور جھوٹ کا فیصلہ چُھپا ہوا تھا۔ زمانے کا نہ رُکنے والا پہیہ ہمیں چھیاسی برس آگے لے آیا ہے اور ہمارے لئے اس مقابلے کا نتیجہ مستقبل پر

---

[1] کُلیاتِ آریہ مسافر حصہ سوم صفحہ ۴۹۶ تا ۴۹۸ [2] آریہ مسافر شہید نمبر مارچ ۱۹۲۳ء صفحہ ۴
[3] آریہ مسافر شہید نمبر مارچ ۱۹۲۳ء صفحہ ۳۴ [4]، [5] کلیاتِ آریہ مسافر دیباچہ صفحہ ۱، ج

نہیں بلکہ ماضی کے پردوں پر مُرتسم ہوچکا ہے۔ لیکھرام سے خدا کی غیرت نے کیا سلوک کیا اور حضرت مرزا صاحب کو دی گئی آسمانی بشارتیں کس صفائی سے پوری ہوئیں اور کس طرح وہ بچہ ناموافق حالات کے باوجود اور دشمن کی قہری نگاہوں کے علی الرغم بڑھتا اور پھُولتا اور پھَلتا رہا۔ حتّٰی کہ اُس مقامِ محمود تک جا پہنچا جس کی اس کے حق میں خوشخبری دی گئی تھی۔

یہ سب امور اس کتاب کے آئندہ صفحات میں اپنے اپنے مقام پر درج کئے جائیں گے۔ لیکن پیشتر اس کے کہ اس تمہید کو ختم کیا جائے یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ اس بچّہ کی ولادت کی شان لیکھرام کے وجود یا عدم وجود سے بے نیاز ہے لیکھرام کی بے باک دخل اندازی سے گو ایک موازنہ کا دلچسپ موقع تو ضرور میسّر آیا لیکن یہ پیشگوئی اپنی عظمت اور شان میں ایک منفرد اور عالمگیر حیثیت رکھتی ہے۔

مسیح موعود کے صاحبِ اولاد ہونے کے متعلق حضرت سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلّم کی عظیم الشان خوشخبری اور بعض دیگر بزرگانِ اُمّت کی بشارات

بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود میں حضرت مرزا محمود احمد صاحب نے جو کردار ادا کرنا تھا اس کی اہمیت کا اندازہ کچھ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ خدا سے علم پا کر دُنیا کو آپ کی ولادت کی خبر دینے میں حضرت مرزا صاحب منفرد نہیں بلکہ اس پیدائش کے تذکرے آپ سے قبل بھی دُور دُور تک تاریخ کے مختلف اوراق میں پھیلے پڑے ہیں۔ سب سے زیادہ قابلِ فخر اور سب سے اعلیٰ و اَولیٰ ان پیشگوئیوں میں وہ پیشگوئی ہے جو ہمارے آقا و مولیٰ سب نبیوں کے سردار حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارہ میں فرمائی۔

چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے روایت کرتے ہیں :-

"یَنْزِلُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ اِلَی الْاَرْضِ یَتَزَوَّجُ
وَیُوْلَدُ لَهٗ" [1]

"حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں تشریف لائیں گے اور شادی کریں گے اور
اُن کو اولاد دی جائے گی"

اس حدیث کی تشریح فرماتے ہوئے حضرت مرزا صاحب (مسیح موعود علیہ السلام) فرماتے ہیں :-

"قَدْ اَخْبَرَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّ
الْمَسِیْحَ الْمَوْعُوْدَ یَتَزَوَّجُ وَیُوْلَدُ لَهٗ فَفِیْ ھٰذَا اِشَارَۃٌ
اِلٰی اَنَّ اللّٰہَ یُعْطِیْہِ وَلَدًا صَالِحًا یُّشَابِہُ اَبَاہُ وَلَا
یَأْبَاہُ وَیَکُوْنُ مِنْ عِبَادِ اللّٰہِ الْمُکْرَمِیْنَ" [2]

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالےٰ سے خبر پا کر فرمایا کہ مسیح موعود

---

[1] مشکوٰۃ مجتبائی صفحہ ۴۸۰ باب نزول عیسیٰ علیہ السلام ، [2] آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۵۷۸

شادی کریں گے اور اُن کے ہاں اولاد ہوگی۔ اس میں اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ایسا نیک بیٹا عطا کرے گا جو نیکی کے لحاظ سے اپنے باپ کے مشابہ ہوگا نہ کہ مخالف' اور وہ اللہ تعالیٰ کے معزز بندوں میں سے ہوگا۔"

ایک اور مقام پر اسی پیشگوئی پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

"یہ پیشگوئی کہ مسیح موعود کی اولاد ہوگی یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا اُسکی نسل سے ایک شخص کو پیدا کرے گا جو اس کا جانشین ہوگا اور دینِ اسلام کی حمایت کرے گا جیسا کہ میری بعض پیشگوئیوں میں خبر آچکی ہے"[۱]

اس موعود فرزند کے متعلق حضرت سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلّم کی اس پیشگوئی کے علاوہ قدیم روحانی صحیفوں میں بھی خبر دی گئی ہے۔ چنانچہ حضرت مسیح علیہ السلام کی آمد ثانی کی پیشگوئی کے تذکرہ میں یہود کی شریعت کی بُنیادی کتاب "طالمود" میں لکھا ہے:۔

"یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ (یعنی مسیح) وفات پا جائے گا اور اس کی سلطنت اس کے بیٹے اور پوتے کو ملے گی۔ اس رائے کے ثبوت میں یسعیاہ باب ۴۲ آیت ۴ کو پیش کیا جاتا ہے جس میں کہا گیا ہے وہ ماندہ نہ ہوگا اور ہمت نہ ہارے گا جب تک کہ عدالت کو زمین پر قائم نہ کرے"[۲]

طالمود کی اس پیشگوئی کے بعد ہم زرتشت علیہ السلام (جو مسیح علیہ السلام سے ایک ہزار سال قبل ایران میں گزرے ہیں) کی بڑی واضح پیشگوئی درج کرتے ہیں۔ یہ پیشگوئی زرتشتی مذہب کے صحیفہ دساتیر میں دینِ زرتشت کے مجدّد ساسانِ اوّل نے تحریر کی ہے۔ اصل پیشگوئی پہلوی زبان میں ہے جس کو زرتشتی اصحاب نے فارسی زبان میں ڈھالا ہے:۔

"چوں ہزار سال تازی آئین راگذرد چناں شود آں آئین از جدائی ہا کہ اگر بآئین گر نمائند نداندش ... در افتد درہم وکنند خاک پرستی و روز بروز جدائی و دشمنی در آنہا افزوں شود ...... پس شما یابید خوبی راگر ماند یکدم از ہمیں خروج انگیزم از کسانِ تو وکے و آئین و آب تو بہ تو رسانم و پیغمبری و پیشوائی از فرزندان تو برنگیرم"[۳]

۱؎ حقیقۃ الوحی ص۳۱۲ ۲؎ طالمود۔ مرتبہ جوزف برکلے باب پنجم مطبوعہ لندن ۱۸۷۸ء ۳؎ سفرنگ دساتیر ص۱۹۰ ملفوظ حضرت زرتشت مطبوعہ ۱۲۸۰ھ مطبع سراجی دہلی

ترجمہ : جب شریعت عربی پر ہزار سال گزر جائیں گے تو
تفرقوں سے دین ایسا ہو جائے گا کہ اگر خود شارع (صلے اللہ علیہ وسلم)
کے سامنے پیش کیا جائے تو وہ بھی اسے پہچان نہ سکے گا ... اور ان
کے اندر انشقاق اور اختلاف پیدا ہو جائے گا اور روز بروز اختلاف اور
باہمی دشمنی میں بڑھتے چلے جائیں گے ...... جب ایسا ہو گا تو تمہیں خوشخبری
ہو کہ اگر زمانہ میں ایک دن بھی باقی رہ جائے تو تیرے لوگوں سے (فارسی
الاصل) ایک شخص کو کھڑا کروں گا جو تیری گمشدہ عزت و آبرو واپس لائے گا
اور اسے دوبارہ قائم کرے گا ۔ میں پیغمبری و پیشوائی (نبوت و خلافت) تیری
نسل سے نہیں اٹھاؤں گا"۔

پیشگوئی مندرجہ بالا کے آخری فقرہ "پیغمبری و پیشوائی از فرزندان تو برانگیزم" میں یہ اشارہ ہے کہ آخری زمانہ کا موعود جب آئے گا تو اس کی اولاد میں سے کوئی اس کا جانشین ہو گا۔

حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب ولی نے بھی اس آخری زمانے کے مامور کے بارہ میں پیشگوئی فرمائی ہے۔ آپ اُمت مسلمہ کے مشہور صاحب کشف و الہام بزرگ تھے۔ آپ نے آخری زمانہ میں مسیح کی آمد ثانی کی پیشگوئی منظوم کلام میں فرمائی۔ آپ فرماتے ہیں :۔

قدرت کردگار مے بینم ‖ حالت روزگار مے بینم
از نجوم ایں سخن نمی گویم ‖ بلکہ از کردگار مے بینم
غین[١٢٠٠] رے سال چوں گذشت از سال ‖ بوالعجب کاروبار مے بینم
گرد در آئینہ ضمیر جہاں ‖ گرد و زنگ و غبار مے بینم
ظلمت ظلم ظالمانِ دیار ‖ بے حدّ و بے شمار مے بینم
جنگ و آشوب و فتنہ و بے داد ‖ درمیان و کنار مے بینم
بندہ را خواجہ وش ہمے یابم ‖ خواجہ را بندہ وار مے بینم
سکہ نو زنند بر رُخ زر ‖ درہمش کم عیار مے بینم
بعضے اشجار بوستانِ جہاں ‖ بے بہار و ثمار مے بینم
غم مخور زانکہ من دریں تشویش ‖ خرمی وصل یار مے بینم
چُوں زمستان بے چمن بگذشت ‖ شمس خوش بہار مے بینم

ان اشعار میں حضرت مسیح موعود اور مہدی مسعود کے ظہور سے قبل کے انقلابات کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ پھر مسیح موعود کے زمانہ اور نام کی تعیین کی گئی ہے :-

ا ح م و دال مے خوانم ! = نام آں نامدار مے بینم
احمد

پھر فرماتے ہیں :-

دَورِ اُو چوں شود تمام بکام
پسرش یادگار مے بینم ـــــ [1]

یعنی جب اس کا زمانہ کامیابی کے ساتھ گزر جائے گا تو اُس کے نمونہ پر اس کا بیٹا یادگار رہ جائے گا۔

---

[1] "الاربعین فی احوال المہدیین" از حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ مطبوعہ نومبر ۱۸۵۱ء مصری گنج کلکتہ۔

باب دوم

موعود بیٹے کی ولادت

بچپن، تعلیم و تربیت

عنفوانِ شباب

- موعود بیٹے کی ولادت۔
- آپ کی والدہ حضرت سیّدہ نصرت جہاں بیگم رضؓ۔
- بچپن کے ابتدائی ایّام اور تربیتِ والدین۔
- آپ کی تربیت میں آپ کی بزرگ والدہ کا حصّہ۔
- تربیت قبول کرنے کی اہلیت۔
- خود اپنی تربیت کی اہلیت۔
- تعلیم۔
- تقریر و تحریر۔
- بچپن کی دلچسپیاں، تفریحات اور کھیلیں۔
- تعلّقات کے دائرے۔
- پہلی شادی۔
- اپنے عظیم باپ کی صداقت پر آپ کا ایمان اور اس کے نتائج۔
- پُر ہَول اور پُرخطر فضاؤں تلے۔
- حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت پر آپ کا روز و شب بڑھتا ہُوا ایمان۔

موعود بیٹے کی ولادت

اس پیشگوئی کے تقریباً تین سال بعد (جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے) وہ بچہ جس کے ذکر نے برصغیر پاک و ہند کی مذہبی فضا میں تہلکہ مچائے رکھا بالآخر ۱۲ جنوری ۱۸۸۹ء (بمطابق ۹ جمادی الاوّل ۱۳۰۶ھ) کو جمعہ اور ہفتہ کی درمیانی رات قادیان میں پیدا ہوا۔ اور تفاؤل کے طور پر اس قوی اُمید کے ساتھ کہ یہ وہی بچہ ثابت ہوگا جس کا وعدہ دیا گیا تھا، اس کا نام بشیر الدین محمود احمد رکھا گیا۔ جُوں جُوں مستقبل نے اپنے ورق اُلٹے یہ امر گمان سے یقین میں بدلتا چلا گیا کہ یہ وہی موعود بچہ ہے جس کے وجود کے ساتھ رُوئے زمین پر بسنے والی تمام قوموں کی تقدیر وابستہ ہونے والی ہے اور جس نے دینِ اسلام کا شرف اور کلام اللہ کا مرتبہ لوگوں پر ظاہر کرتے ہوئے زمین کے کناروں تک شہرت پائی ہے آپ کے والد حضرت مرزا غلام احمد مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کسی قدر تعارف پہلے گزر چکا ہے۔ لہٰذا بے محل نہ ہوگا کہ آپ کی بزرگ والدہ کا بھی کچھ تعارف اس موقع پر کروایا جائے۔

آپ کی والدہ حضرت سیدہ نصرت جہاں بیگمؓ

آپ کی والدہ ماجدہ حضرت سیدہ نصرت جہاں بیگم رضی اللہ تعالےٰ عنہا دہلی کے ایک قدیم اور معزز سید خاندان سے تعلق رکھتی تھیں جو اپنی بزرگی اور سیادت میں کئی سو سال سے دہلی میں مشہور چلا آرہا تھا۔ اس خاندان کی ہندوستان میں سکونت کی تاریخ حضرت خواجہ سید میر محمد ناصر رحمۃ اللہ علیہ سے شروع ہوتی ہے جن کا زمانہ سترھویں صدی عیسوی بتایا جاتا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ آیا یہ خاندان پہلی مرتبہ سترھویں صدی ہی میں یا اس سے قبل دہلی میں آکر آباد ہُوا، اس میں شک نہیں کہ حضرت خواجہ صاحب کی غیر معمولی بزرگی اور بلند مقام کے باعث ہندوستان میں آپ ہی اس خاندان کے جدّ امجد تسلیم کئے جاتے ہیں۔ آپ ایک صاحبِ کشف و رویا باخدا بزرگ تھے۔ اور آپ کو خاندان کا جد امجد قرار دینے کی اصل وجہ یہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس خاندان کا بانی قرار دیا ہے۔ یہ کشف اس لحاظ سے نہایت اہم اور قابلِ ذکر ہے کہ اس

کی رُو سے بالآخر اس خاندان کا تعلق اس مہدی کے ساتھ ہونا مقدّر تھا جس کی خوشخبری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمّت کو دی تھی۔ اس کشف کے مطابق آپ کو عالمِ بیداری میں حضرت حَسن رضی اللہ عنہ نظر آئے اور فرمایا کہ ناناجان نے مجھے خاص اس لئے تیرے پاس بھیجا ہے کہ میں تجھے معرفت اور ولایت سے مالامال کردوں۔ یہ ایک خاص نعمت تھی جو خانوادہ نبوّت میں تیرے واسطے محفوظ رکھی گئی۔ اس کی ابتداء تجھ پر ہوئی اور انجام اس کا مہدی معہود علیہ السلام پر ہوگا۔[1]

ہماری طرف سے اپنے ایسے تمام قارئین سے جو سلسلہ احمدیہ سے تعلق نہیں رکھتے، یہ گذارش بے جا نہ ہوگی کہ یہ کس قدر عجیب اور دلچسپ واقعہ ہے کہ سترھویں صدی کے ایک بزرگ کی اس پیشگوئی کے تقریباً دو سو سال بعد آپ کے خاندان کی ایک سیّد زادی کی شادی خاندانی روایات کے سراسر خلاف پنجاب کے ایک اجنبی خاندان کے ایک ایسے فرد سے قرار پاتی ہے جو امام مہدی ہونے کا دعویدار ہے اور مزید تعجب اس پر یہ ہے کہ اسی دعویدار کے زمانہ میں چاند اور سُورج کو رمضان کے مہینے میں انہی تاریخوں میں گرہن لگ جاتا ہے جن تاریخوں کے متعلق حضرت نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے پیشگوئی[2] فرمائی تھی کہ ہمارے مہدی کے زمانہ میں چاند اور سُورج کو رمضان کے مہینے میں ان ان تاریخوں میں گرہن لگے گا۔

بہرحال یہ نجیب الطرفین بچہ وعدہ کے مطابق ۱۲ جنوری ۱۸۸۹ء کو قادیان میں پیدا ہُوا۔ اور جیسا کہ پیدائش سے قبل آپ کا وجود ہندوستان کی مذہبی دنیا میں موضوعِ بحث بنا ہُوا تھا، اسی طرح پیدائش کے بعد بھی ایک عرصہ تک آپ دوست اور دشمن کی نگاہوں کا مرکز بنے رہے۔

---

[1] میخانہ درد صفحہ ۲۵ سید ناصر نظیر صاحب فراق دہلوی۔

[2] "اِنَّ لِمَھْدِیِّنَا اٰیَتَیْنِ لَمْ تَکُوْنَا مُنْذُ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یَنْکَسِفُ الْقَمَرُ لِاَوَّلِ لَیْلَۃٍ مِّنْ رَمَضَانَ وَتَنْکَسِفُ الشَّمْسُ فِی النِّصْفِ مِنْہُ وَلَمْ تَکُوْنَا مُنْذُ خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ" (دار قطنی جلد اوّل صفحہ ۱۸۸ مطبع انصاری دلّی)

ترجمہ: ہمارے مہدی کے دو نشان ہیں۔ یہ نشان آسمان و زمین کی پیدائش کے وقت سے لے کر اب تک کبھی ظاہر نہیں ہوئے۔ ایک تو یہ کہ قمر (چاند) کو رمضان میں پہلی رات میں گرہن لگے گا اور دوسرا یہ کہ سورج کو اسی رمضان کی درمیانی تاریخ میں گرہن لگے گا اور یہ دونوں باتیں آسمان و زمین کی پیدائش کے وقت سے نہیں ہوئیں۔

دوست کی نگاہِ محبت آپ پر پڑتی تھی کہ آپ ہی وہ پسرِ موعود ہیں جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ دینِ اسلام کی خدمت اور سربلندی کے لئے وقف ہوگا اور دشمن کی نظر یہ موہوم تمنا لئے ہوئے تھی کہ کاش یہ بچہ اُن کی آنکھوں کے سامنے ہلاک ہوکر ایک مرتبہ پھر اُن کو تمسخر اور استہزاء کا موقع بہم پہنچائے۔ اگر نگاہوں میں کھا جانے کی طاقت ہوتی اور اگر دشمن کی تمنائیں خدا کی نظر میں ایک ادنیٰ سا درجہ بھی رکھتیں تو اس بچے کے زندہ رہنے یا پنپنے کا کوئی بھی امکان نہ تھا۔ لیکن خدا تعالیٰ کو یہی منظور تھا کہ یہ بچہ اس کی رحمت کے سایہ تلے پرورش پائے اور جلد جلد بڑھے اور زمین کے کناروں تک شہرت پائے۔

تقریباً تین سال قبل پنڈت لیکھرام پشاوری نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سلسلہ کے نیست و نابود ہونے اور آپ کی نسل کے کاٹے جانے کے بارہ میں جو پیشگوئی کی تھی اس میں بیان کردہ مدت کے پورا ہونے میں بمشکل دو ماہ باقی تھے کہ وہ بچہ پیدا ہوا۔ پس اس دو ماہ کے بقیہ عرصہ میں پنڈت لیکھرام کے دل پر جو بیتی ہوگی اس کا حال اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ کس طرح اس نے اس بچے کی موت کی توقعات میں دن کاٹے اور راتیں بسر کی ہوں گی۔ اور کیسی کیسی اس کے دل میں حسرتیں مچلتی ہوں گی کہ کاش یہ لڑکا بھی میری آنکھوں کے سامنے ہلاک ہوکر میرے سینے کی آگ کو ٹھنڈا کردے۔ یقیناً پہلے دونوں بچوں کا نو عمری میں ہی فوت ہوجانا لیکھرام کی ان امیدوں کے لئے ایک قوی بنیاد مہیا کر رہا تھا اور اُس کی اِس خواہش کا پورا ہونا بظاہر بعید نظر نہیں آتا تھا کہ یہ بچہ بھی تھوڑی مدت زندہ رہ کر پہلے دونوں بچوں کی طرح ہی اپنی ماں کی گود خالی کر جائے گا۔ مگر یقیناً اللہ تعالیٰ کو کچھ اور منظور تھا۔ آسمان پر کچھ اور ہی فیصلے ہوچکے تھے اور اِس تقدیر کو کوئی ٹال نہیں سکتا تھا کہ حضرت مرزا صاحب نے نہیں بلکہ خود لیکھرام نے نہایت خائب و خاسر اور نامراد ہوکر بڑی حسرت کے ساتھ اس دنیا سے اُٹھ جانا تھا۔

پس ایسا ہی ہُوا۔ دنوں پر دن گزرتے چلے گئے اور ایک رات کے بعد دُوسری رات آئی لیکن نہ تو لیکھرام کی قہر آلود نظریں اس بچے کو ہلاک کر سکیں، نہ اس کی بد دعائیں اور دشنام طرازیاں اس کا کچھ بگاڑ سکیں۔ دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں اور سالوں میں تبدیل ہوئے لیکن لیکھرام کی پیشگوئی کے پورا ہونے کے کوئی آثار پیدا نہ ہوئے۔ یہاں تک کہ خود لیکھرام کی نہایت ذلت آمیز اور عبرتناک موت کا وقت آپہنچا اور بعینہٖ اُسی طرح جس طرح حضرت مرزا صاحب نے چار سال قبل ۱۸۹۳ء میں اس کی موت کی واضح پیشگوئی فرمائی تھی، عید کے دوسرے روز لیکھرام ایک نامعلوم شخص کے

ہاتھوں اس طرح مارا گیا کہ اس نے چھری کے پے در پے وار کر کے پیٹ چاک کر دیا اور انتڑیاں باہر نکل پڑیں ۔ چنانچہ چند گھنٹے نہایت اذیّت ناک عذاب میں مبتلا رہ کر ڈاکٹروں کی ہر کوشش کو ناکام بناتے ہوئے لیکھرام ۶؍ مارچ ۱۸۹۷ء کو خائب و خاسر اس دنیا سے اٹھ گیا ۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اس عرصہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مرزا صاحب علیہ السلام کو دو اَور بھی بیٹے عطا فرمائے اور یہ دونوں بھی بشارات کے مطابق پیدا ہوئے ۔ پس لیکھرام کی موت کے وقت حضرت مرزا صاحب کو ایک ہی نہیں تین مبشّر بیٹے عطا ہو چکے تھے جو تینوں کے تینوں اپنے اپنے رنگ میں عظمت کے نشاں لئے ہوئے تھے ۔

یہ ذکر گزر چکا ہے کہ حضرت مرزا صاحب علیہ السلام کی مذکورہ پیشگوئی کے مقابل پر لیکھرام کی پیشگوئی بھی اس لئے خاص اہمیت رکھتی تھی کہ چونکہ یہ دونوں پیشگوئیاں ایک ہی خدا کی طرف منسُوب کی جا رہی تھیں اور بیک وقت ایک دوسرے کی ضد بھی تھیں اس لئے یہ امر بہرحال قطعی طور پر ثابت تھا کہ ایک اُن میں سے یقیناً جھُوٹی ہے ۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب قطعی طور پر ایک جھُوٹی پیشگوئی خدا کی طرف منسُوب کی جا رہی ہو تو خدا کا سلُوک ایسے بے باک انسانوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے ؟ اس نہایت اہم سوال کے جواب کے طور پر ہم نے یہاں پنڈت لیکھرام کی نامراد موت کا ذکر کیا ہے ۔ اگرچہ منطقی امکان اس بات کا موجود تھا کہ دونوں پیشگوئیاں غلط ہوتیں لیکن خدا تعالیٰ کے اس مختلف سلوک نے جو بعد میں ظاہر ہُوا قطعی طور پر یہ ثابت کر دیا کہ پنڈت لیکھرام کی پیشگوئی جھُوٹی تھی اور حضرت مرزا صاحب کی پیشگوئی سچی تھی ۔

بچپن کے ابتدائی ایّام اور تربیتِ والدین

عربی کا ایک محاورہ ہے "اَلصَّبِیُّ صَبِیٌّ وَلَوکَانَ نَبِیّاً" کہ بچّہ بچّہ ہی ہوتا ہے خواہ اسس نے نبی ہی کیوں نہ بننا ہو۔ اسس کے ساتھ اگر اردو کے اس محاورے کو ملا لیا جائے :

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات ——— !

تو یہ ایک مکمل صداقت بن جاتی ہے۔ ہر چند کہ بچّہ اپنی جبلّی طاقتوں کے لحاظ سے کتنے ہی بڑے مقام پر پہنچنے والا کیوں نہ ہو' اسس کے بچپن کی معصومیّت اور بے ساختہ پن بھی اپنی جگہ قائم رہتے ہیں اور اسس کے ساتھ ہی بچپن ہی میں اس کے شاندار مستقبل کی جھلکیاں بھی وقتاً فوقتاً نظر آتی رہتی ہیں۔ صاحبِ فراست لوگ ایسے بچّے کو دیکھ کر بخوبی پا جاتے ہیں کہ

بالائے سرش ز ہوشمندی ═ مے تافت ستارۂ بلندی

اگر خدا کا فضل شاملِ حال رہے تو یہ بچّہ ایک دن عظیم انسان بننے والا ہے۔ حضرت مرزا بشیرالدین محمود احمد صاحب رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے بچپن میں ان دونوں صداقتوں کا ایک حسین امتزاج نظر آتا ہے۔

اسس امتزاج کے نمونے کے طور پر آپ کے بہت بچپن کا ایک واقعہ حضرت مرزا صاحب علیہ السلام کے ایک بزرگ صحابی حضرت مولوی عبدالکریم صاحب رضی اللہ تعالےٰ عنہ ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں :۔

"ایک دفعہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام لدھیانہ میں قیام فرما تھے۔ میں بھی وہیں تھا۔ محمود کوئی تین برسس کا ہوگا۔ گرمی کا موسم تھا۔ مردانہ اور زنانہ میں دیوار حائل تھی۔ آدھی رات کا وقت تھا جو میں جاگا اور مجھے محمود کے رونے اور حضرتؑ کے اِدھر اُدھر کی باتوں میں بہلانے کی آواز آئی۔ حضرتؑ اسے گود میں لئے پھرتے تھے اور وہ کسی طرح چپ نہیں ہوتا تھا۔ آخر آپ نے کہا دیکھو محمود! وہ کیسا تارا ہے !!

بچہ نے نئے مشغلہ کی طرف دیکھا اور ذرا چُپ ہو کر پھر وہی رونا اور چلاّنا
اور یہ کہنا شروع کر دیا "ابّا تارے جانا" (یعنی ابّا میں ستارے پر جاؤں
گا۔ناقل) کیا مجھے مزا آیا اور پیارا معلوم ہُوا! آپؑ کا اپنے ساتھ یوں گفتگو
کرنا یہ اچھا معلوم ہُوا۔"ہم نے ایک راہ نکالی تھی اُس نے اس میں بھی
اپنی ضد کی راہ نکال لی"۔آخر بچّہ روتا روتا خود ہی جب تھک گیا چُپ ہو
گیا۔مگر اس سارے عرصہ میں ایک لفظ بھی سختی کا یا شکایت کا آپ
کی زبان سے نہ نکلا"۔[1]

اس بچّے کی بعد کی زندگی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے ستاروں پر جانے کی یہ تمنّا یقیناً ان بلند عزائم کی غماز تھی جو تمام عمر اس کی بے پناہ قوّتِ عمل کے لئے مہمیز کا کام دیتے رہے

علاوہ ازیں اس روایت سے حضرت مرزا صاحب علیہ السلام کی طبیعت کے اس پہلو پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ آپ کے دل میں بچوں کے لئے کس قدر شفقت پائی جاتی تھی اور آپ کس درجہ حلیم تھے۔ایک ایسے مصروف الاوقات شخص کے لئے جس کا بال بال اہم ترین مصروفیات میں بندھا ہوا ہو اور بمشکل رات کو پہلے پہر تھوڑا سا آرام کا وقت میسّر آتا ہو' ایک روتے ہوئے بچے کو خود گود میں اُٹھا کر دلاسا دیتے ہوئے اس وقت تک پھرتے رہنا جب تک وہ خود ہی تھک کر سو جائے' آپ کے اعلیٰ اور حسین اخلاق کی ایک پیاری مثال ہے۔

یہ تو بہت بچپن کا واقعہ معلوم ہوتا ہے۔اسی قسم کا ایک اَور واقعہ نسبتاً بڑی عمر میں بھی پیش آیا جو اپنی نوعیّت کے لحاظ سے اس سے بھی زیادہ صبر آزما تھا لیکن حضرت مرزا صاحب علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی حلم اور صبر کا مادہ عطا فرمایا تھا اور طبیعت میں نرمی اتنی زیادہ تھی کہ بچوں پر ناراض ہونا آپ کے لئے ایک مشکل امر تھا۔وجہ خواہ کچھ بھی ہو یہ بات بہر حال قطعی ہے کہ اس بچے سے باپ کا سلوک غیر معمولی نرمی اور درگذر کا حامل تھا۔

دوسری روایت بھی حضرت مولوی عبد الکریم رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کی بیان کردہ ہے اور حسب ذیل ہے:

"محمود چار ایک برس کا تھا۔حضرتؑ معمولاً اندر بیٹھے لکھ رہے تھے
میاں محمود دیا سلائی لے کر وہاں آئے اور آپ کے ساتھ بچوں کا ایک

---

[1] سیرت حضرت مسیح موعودؑ" مصنفہ حضرت مولانا عبد الکریمؓ صفحہ ۳۱-۳۰ بار دوم

غول تھا۔ پہلے کچھ دیر آپس میں کھیلتے جھگڑتے رہے پھر جو کچھ دِل میں آئی حضرت صاحبؑ کے لکھے ہوئے مسوّدات کو آگ لگا دی ۔ اور آپ لگے خوش ہونے اور تالیاں بجانے ۔ اور حضرتؑ لکھنے میں مصروف ہیں، سر اٹھاکر دیکھتے بھی نہیں کہ کیا ہو رہا ہے ۔ اتنے میں آگ بجھ گئی اور قیمتی مسوّدات راکھ کا ڈھیر ہو گئے اور بچوں کو کسی اور مشغلے نے اپنی طرف کھینچ لیا ۔ حضرت کو سیاقِ عبارت ملانے کے لئے کسی گذشتہ کاغذ کے دیکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی ۔ اس سے پوچھتے ہیں، خاموش دبکا جاتا ہے ۔ آخر ایک بچہ بول اُٹھا کہ میاں صاحب نے کاغذ جلا دیئے ہیں ۔ عورتیں اور بچے اور گھر کے سب لوگ انگشت بدنداں، اب کیا ہوگا اور درحقیقت عادتاً ان سب کو علیٰ قدر مراتب بُری حالت اور مکروہ نظارہ کے پیش آنے کا گمان اور انتظار تھا اور ہونا بھی چاہیئے تھا ۔ مگر حضرتؑ مُسکراکر فرماتے ہیں ۔ خُوب ہُوا، اس میں اللہ تعالےٰ کی کوئی بڑی مصلحت ہوگی اور اب خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس سے بہتر مضمون ہمیں سمجھائے"۔[1]

اس حِلم اور بُردباری کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ نعوذ باللہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام تربیتِ اولاد کی حکمت سے ناواقف تھے یا ایسی ماؤں کی طرح جو اپنے حد سے بڑھے ہوئے پیار پر اختیار نہیں رکھتیں، تربیت کے فرض سے بے نیاز ہوکر اپنے بچوں کی محبت سے مغلوب ہوجاتے تھے ۔

دراصل آپ کی تربیت کا انداز بالکل منفرد اور نہایت لطیف تھا ۔ اور جیسا کہ آگے چل کر بیان ہونے والے واقعات سے ظاہر ہوگا بعض مواقع پر آپ اپنے بچوں سے سختی سے بھی پیش آتے رہے ۔ فرق صرف یہ ہے کہ جہاں تک ایسے امور کا تعلق ہے جن کے اثر کا دائرہ آپ کی ذات تک محدود تھا، آپ نے حضرت صاحبزادہ مرزا محمود احمد صاحبؓ پر کبھی سختی نہیں کی خواہ ان کے کسی فعل سے آپ کو کیسی ہی ذاتی تکلیف پہنچی ہو ۔ مگر جہاں تک امورِ دینیہ کا تعلق ہے یا ایسی غلطیوں کا سوال ہے جن کے نتیجہ میں اخلاق پر بُرا اثر پڑنے کا خطرہ ہوسکتا تھا وہاں آپ نے موقع و محل کے مطابق کبھی نرمی سے اور کبھی سختی سے آپ کو اس طرف توجہ ضرور دلائی ۔ یہ فرق

---

[1] سیرت حضرت مسیح موعودؑ مصنفہ حضرت مولانا عبدالکریمؓ صہ ۱۲-۱۳

بہت اہم ہے اور تربیت کرنے والوں کے لئے اس میں بڑا گہرا سبق ہے کہ حلم کی حدود کہاں جا کر ختم ہوتی ہیں اور سختی کے تقاضے کہاں سے شروع ہوتے ہیں۔

دو چھوٹے چھوٹے واقعات اس فرق کو ظاہر کرنے کے لئے پیش کئے جاتے ہیں:۔

اوّلاً حضرت صاحبزادہ صاحب کا اپنا بیان ہے کہ ایک دفعہ ایک کتا ہمارے دروازے پر آیا۔ میں وہاں کھڑا تھا۔ اندر کمرے میں صرف حضرت صاحبؑ تھے۔ میں نے اس کتے کو اشارہ کیا اور کہا ٹیپو! ٹیپو!! ٹیپو!!! حضرت صاحب بڑے غصے سے باہر نکلے اور فرمایا "تمہیں شرم نہیں آتی کہ انگریز نے تو دشمنی کی وجہ سے اپنے کتوں کا نام ایک صادق مسلمان کے نام پر ٹیپو رکھ دیا ہے اور تم اُن کی نقل کرکے کتے کو ٹیپو کہتے ہو۔ خبردار! آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا"۔ میری عمر شاید آٹھ، نو سال کی تھی۔ وہ پہلا دن تھا جب سے میرے دل کے اندر سلطان ٹیپو کی محبت قائم ہو گئی۔[۱]

اس واقعہ سے جہاں ایک طرف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بچے کے ہر فعل کو بلا امتیاز برداشت کرنا حلم کی تعریف میں داخل نہیں، وہاں حضرت مرزا صاحبؑ کی بے پناہ دینی اور قومی حمیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ وہ بچہ جو آپ کے نہایت محنت سے لکھے ہوئے قیمتی مسوّدات کو جن پر خدا جانے کتنے گھنٹوں یا راتوں کی محنت آپ نے صرف فرمائی ہو گی، آنِ واحد میں تیلی دکھا کر خاکستر کر دیتا ہے، اس کا یہ فعل تو آپ برداشت فرما لیتے ہیں اور اس تکلیف کا کوئی خیال نہیں کرتے جو اس کے نتیجہ میں آپ کو دوبارہ اٹھانی پڑی۔ لیکن ایک مسلمان سلطان جو قومی حمیت میں شہید ہوا اور جس کے ساتھ آپ کا اسلام کے سوا کوئی اور رشتہ نہ تھا اس کے نام کو ایک بچہ کا لاعلمی کی بنا پر بھی اِس رنگ میں لینا جس سے اس کی تحقیر ہوتی ہو آپ سے برداشت نہ ہو سکا۔

اس واقعہ میں ان لوگوں کے لئے بھی سبق ہے جو حضرت مرزا صاحب پر انگریز کا ایجنٹ ہونے کا الزام لگانے کی جسارت کرتے ہیں۔ قومی حمیت سے لبریز وہ دل جو سلطان فتح علی ٹیپو کی محض اس لئے انتہائی عزت کرتا تھا کہ انگریز کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کی بجائے اس نے اپنی زندگی مردانہ وار نثار کر دی۔ کیسے ممکن ہے کہ ایسے غیوّر انسان کے متعلق کسی غیر قوم کا ایجنٹ ہونے کا واہمہ تک بھی دل میں لایا جائے۔

---

[۱] الفضل یکم اپریل ۱۹۵۶ء صفحہ ۳

نہایت شفیق اور مہربان ہونے کے باوجود حضرت مسیح موعود علیہ السلام کبھی یہ پسند نہ فرماتے تھے کہ بچّے دینی فرائض کی سرانجام دہی میں غفلت برتتے اور آپ بغیر سرزنش یا اظہارِ ناراضگی کے اسے چھوڑ دیں۔ اسی قسم کے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے حضرت صاحبزادہ صاحب فرماتے ہیں :

"ایک دفعہ حضرت صاحب کچھ بیمار تھے۔ اس لئے جمعہ کے لئے مسجد میں نہ جا سکے۔ میں اس وقت بالغ نہیں تھا کہ بلوغت والے احکام مجھ پر جاری ہوں۔ تاہم میں جمعہ پڑھنے کے لئے مسجد کو آرہا تھا کہ ایک شخص مجھے ملا۔ اس وقت کی عمر کے لحاظ سے تو شکل اس وقت تک یاد نہیں رہ سکتی تھی مگر اس واقعہ کا اثر مجھ پر ایسا ہوا کہ اب تک مجھے اس شخص کی صورت یاد ہے۔ محمد بخش اُن کا نام ہے ... میں نے اُن سے پوچھا۔ آپ واپس آرہے ہیں، کیا نماز ہو گئی ہے ؟ انہوں نے کہا "آدمی بہت ہیں، مسجد میں جگہ نہیں تھی، میں واپس آگیا"۔ میں بھی یہ جواب سُن کر واپس آگیا اور گھر میں آکر نماز پڑھ لی۔ حضرت صاحبؑ نے یہ دیکھ کر مجھ سے پُوچھا "مسجد میں نماز پڑھنے کیوں نہیں گئے ؟" خدا تعالیٰ کا فضل ہے کہ میں بچپن سے ہی حضرت صاحب کا ادب اُن کے نبی ہونے کی حیثیت سے کرتا تھا۔ میں نے دیکھا آپؑ کے پوچھنے میں ایک سختی تھی اور آپ کے چہرہ سے غصّہ ظاہر ہوتا تھا۔ آپ کے اس رنگ میں پوچھنے کا مجھ پر بہت ہی اثر ہوا۔ جواب میں مَیں نے کہا کہ میں گیا تو تھا لیکن جگہ نہ ہونے کی وجہ سے واپس آگیا۔ آپ یہ سُن کر خاموش ہو گئے۔ لیکن اب جس وقت جمعہ پڑھ کر مولوی عبدالکریم صاحبؓ آپ کی طبیعت کا حال پوچھنے کے لئے آئے تو سب سے پہلی بات جو حضرت مسیح موعودؑ نے آپ سے دریافت کی، وہ یہ تھی کہ آج لوگ مسجد میں زیادہ تھے ؟ اس وقت میرے دل میں سخت گھبراہٹ پیدا ہوئی کیونکہ میں خود تو گیا ہی نہیں تھا۔ معلوم نہیں بتانے والے کو غلطی لگی یا مجھے اس کی بات سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ان کی بات سے یہ سمجھا تھا کہ مسجد میں جگہ نہیں ہے۔

مجھے فکر یہ ہوئی کہ اگر مجھے غلط فہمی ہوئی ہے یا بتانے والے کو ہوئی ہے، دونوں صورتوں میں الزام مجھ پر آئے گا کہ میں نے جھوٹ بولا مولوی عبدالکریم صاحبؓ نے جواب دیا۔ "ہاں حضور! آج واقعہ میں بہت لوگ تھے۔ میں اب بھی نہیں جانتا کہ اصلیت کیا تھی۔ خدا نے میری بریّت کے لئے یہ سامان کر دیا کہ مولوی صاحب کی زبان سے بھی تصدیق کرا دی کہ فی الواقعہ اس دن غیر معمولی طور پر لوگ آئے تھے۔ بہرحال یہ ایک واقعہ ہے جس کا آج تک میرے قلب پر گہرا اثر ہے۔"[1]

بچوں کو عموماً یہ خداداد ملکہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کے دلی رجحانات سے کم عمری کے باوجود بخوبی واقف ہو جاتے ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ وہ دراصل کن کن اقدار کو اوّلیت دیتے ہیں۔ یہ عمومی تأثر جو بچوں کے دل پر اپنے ماں باپ کے بارہ میں پڑتا ہے، وہ اُن کی عادات و اطوار کو ڈھالنے میں ایک بڑا بھاری کردار ادا کرتا ہے۔ پس مندرجہ بالا ہردو واقعات کے نتیجے میں حضرت مرزا محمود احمد صاحبؓ کے دل میں قومی حمیّت اور فرائض کی ادائیگی کی اہمیّت اتنے گہرے طور پر جاگزیں ہو گئی کہ مستقلاً آپ کے مزاج کا ایک نمایاں وصف بن گئی۔

حضرت مرزا صاحب علیہ السلام کی تربیت کا رنگ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے، بڑا لطیف تھا اور عموماً نرم و نازک پیار کی باتوں سے اور نیک توقعات کے اظہار کے ذریعے بچوں سے ایسی باتیں منوا لیا کرتے تھے کہ بسا اوقات زبانی یا جسمانی سختی کے طریق وہاں ناکام رہ جاتے ہیں۔ آپ نے اکثر دیکھا ہو گا کہ کبھی بچہ ایک کھانے کی چیز ضرورت سے زیادہ اُٹھا لیتا ہے۔ ماں باپ اُسے جھڑکتے اور خفا ہوتے ہیں۔ چھینا جھپٹی پر بھی اتر آتے ہیں لیکن بچہ اُن کی بات ماننے کی بجائے ضد اور بغاوت میں بڑھتا چلا جاتا ہے۔ حضرت مرزا صاحبؑ کا طریقِ کار ایسے مواقع پر بالکل مختلف ہوتا تھا اور اس کا نتیجہ بھی بالکل الگ نکلتا۔ چنانچہ حضرت مرزا صاحب علیہ السلام کے ایک مخلص مُرید سیّد فضل شاہ صاحبؓ بیان کرتے ہیں:۔

"ایک دن حضرت مسیح موعود علیہ السلام چوبارے کے صحن میں بیٹھے تھے اور بادام آگے رکھے تھے۔ میں بادام توڑ رہا تھا کہ اتنے میں حضرت

---

[1] الفضل ۱۸ر جون ۱۹۲۵ء صفحہ ۷

میاں بشیر الدین محمود احمد جن کی عمر اس وقت چار پانچ سال کی ہو گی، تشریف لائے اور سب بادام اُٹھا کر جھولی میں ڈال لیے۔ حضرت اقدسؑ نے یہ دیکھ کر فرمایا "یہ میاں بہت اچھا ہے، زیادہ نہیں لے گا۔ صرف ایک دو لے گا۔ باقی سب ڈال دے گا۔ جب حضرت صاحبؑ نے یہ فرمایا تو میاں نے جھٹ سب بادام میرے آگے رکھ دیئے اور صرف ایک یا دو بادام لے کر چلے گئے۔"

بچوں کے اخلاق کی خرابی کی ایک بڑی اہم وجہ یہ ہے کہ ماں باپ انہیں نادان سمجھ کر اُن سے دیانت اور امانت اور صداقت کا وہ معاملہ نہیں کرتے جن کی اُن سے وہ توقع رکھتے ہیں مثلاً ماں باپ دِل سے چاہیں بھی کہ بچہ جھُوٹ بولنے کا عادی نہ بنے تو بعض دفعہ دِل بہلاوے کی خاطر یا اُن سے وقتی طور پر اپنا پیچھا چھڑانے کی نیت سے بچے کے سامنے جھوٹ بول دیتے ہیں بچوں سے ماں باپ کی کمزوریاں ہرگز چھپی نہیں رہتیں۔ چنانچہ ایسے ماں باپ کی نصیحتوں کا بچوں پر قطعاً کوئی اثر نہیں پڑتا جن کا عمل ان کے قول سے مختلف ہو۔ حضرت مرزا صاحبؑ سے کسی قسم کی اخلاقی کمزوری سرزد ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور بچوں کی طبیعت پر آپؑ کے قول و فعل کی ہم آہنگی اور صداقت کا ازخود اثر پڑتے رہنا ایک لازمی امر تھا۔ آپؑ نے صرف اسی پر اکتفا نہ فرماتی بلکہ بچوں کی تربیت کی خاطر اس بارہ میں غیر معمولی احتیاط فرمایا کرتے تھے۔ مثلاً حضرت منشی ظفر احمد صاحب کپورتھلوی رضی اللہ عنہٗ جو حضرت مرزا صاحبؑ کے خاص عُشاق صحابہؓ میں سے تھے، بیان فرماتے ہیں :-

"ایک دفعہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام لیٹے ہوئے تھے۔ اور سید فضل شاہ صاحب مرحومؓ حضور کے پیر داب رہے تھے کہ شاہ صاحب نے اشارہ کر کے مجھے کہا کہ یہاں پر جیب میں کوئی سخت چیز پڑی ہے۔ میں نے ہاتھ ڈال کر نکالی تو حضور کی آنکھ کھل گئی۔ آدھی ٹوٹی گھڑے کی ایک چینی اور دو ایک ٹھیکرے تھے، میں پھینکنے لگا تو حضور نے فرمایا "یہ میاں محمود نے کھیلتے کھیلتے میری جیب میں ڈال دیئے ہیں۔ آپ پھینکیں نہیں، میری جیب ہی میں ڈال دیں کیونکہ میاں نے ہمیں امین سمجھ کر اپنے کھیلنے کی چیز رکھی ہے، وہ مانگیں گے تو ہم

کہاں سے دیں گے ؟" [1]

یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کی لطافت اور حُسن سے پُوری طرح لُطف اندوز ہوتے کے لیے سرِ راہ اچٹتی ہوئی ایک نظر کافی نہیں' بلکہ اس کی جاذبیت ہر صاحبِ ذوق کے قدم روک کر اُسے کچھ عرصہ ٹھہرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ کوئی حُسن شناس نظر دو گھڑیاں یہاں ٹھہر کر ایک خاص عالمِ محویت میں اس کا نظارہ کئے بغیر یہاں سے گزر جائے۔

کہتے ہیں کہ پارس پتھر سنگریزوں سے بھی مس کر جائے تو وہ سونا بن جاتے ہیں۔ یہ تو ایک افسانہ ہے' لیکن اعلیٰ اخلاقی اقدار کی عینک سے اگر دیکھیں تو وہ آدھی ٹوٹی گھڑے کی چینی اور ایک ٹھیکرے سونے سے کہیں زیادہ بیش قیمت اور چمک دمک میں فائق نظر آئیں گے

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اقدس علیہ السلام کبھی کوئی چھوٹے سے چھوٹا موقع بھی ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے جس کی مدد سے اس بچے کے اخلاق کو ایک نرالی شان کے ساتھ صیقل کیا جا سکے۔ چنانچہ مرزا محمد اسماعیل بیگ صاحبؓ اسی قسم کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں :-

"حضرت مسیح موعود علیہ السلام ایک دن کچھ اصحاب کے ساتھ سیر کو تشریف لے گئے۔ راستہ میں ایک کیکر کا درخت گرا ہُوا تھا۔ بعض دوستوں نے اس کی شاخوں سے مسواکیں بنالیں۔ صاحبزادہ مرزا محمود احمدؓ بھی ساتھ تھے۔ چھوٹی عمر تھی۔ ایک مسواک کسی نے اُن کو بھی دے دی اور انہوں نے بے تکلفی اور بچپن کی وجہ سے ایک دو دفعہ حضور کو بھی کہا " ابّا مسواک لے لیں "۔ مگر حضور نے مسکراتے ہُوتے فرمایا "میاں! پہلے ہمیں یہ بتلاؤ کہ کس کی اجازت سے یہ مسواکیں حاصل کی گئی تھیں۔ یہ بات سُنتے ہی سب نے مسواکیں زمین پر پھینک دیں"۔ [2]

یہ واقعہ ایک انوکھا اندازِ دلکشی لیئے ہوتے ہے اور اس لائق ہے کہ اصولِ تربیت کے مضمون میں اسے سنہری حروف میں رقم کیا جائے۔ سڑک پر گرے ہُوتے ایک کیکر کے درخت سے چند مسواکوں کی ٹہنیاں کاٹ لینا کوئی ایسا اخلاقی جرم نہیں کہ اسے چوری کی حدود میں داخل سمجھا جائے اور کوئی دنیوی یا مذہبی عدالت ایسے شخص کے لئے کوئی سزا یا سرزنش تجویز کرے۔ عام طور پر تو کھڑے درختوں سے بھی مسواک کے لئے شاخیں کاٹ لی جاتی ہیں اور قبل ازیں اجازت حاصل کرنا

---

[1] اصحاب احمد جلد چہارم طبع دوم صہ ۹۹ [2] تاریخ احمدیت جلد ۵ صہ ۲۱

ایک اَن سُنی بات ہے۔ ہاں مالک کا حق بہر حال قائم رہتا ہے، اگر چاہے تو ایسا کرنے سے روک دے۔

ایسے موقع پر اگر آپ اپنے صحابہ کو سختی سے ایسا کرنے سے روک دیتے تو عوام الناس پر ایک ایسا متشدّد اخلاقی ضابطہ عائد کرنے کے مترادف ہوتا جو "تکلیف مالایطاق" کا حکم رکھتا۔ بایں ہمہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے اخلاق کے جس بلند مقام پر فائز فرمایا تھا، اس مقام کے مشکل تر دستور کے مطابق آپ کے حُسن کے شفّاف چہرے پر یہ ادنیٰ سا خاک کا ذرّہ بھی زیب نہ دیتا تھا۔ یہ خاک کا ذرّہ جسے عام انسان اپنی ننگی آنکھ سے دیکھنے کی بھی استطاعت نہیں رکھتا۔ آپ اسے نہ اپنے لئے پسند کرتے تھے نہ اس موعود بیٹے کے لئے جس نے اپنے وقت میں ایک عالَم کے اخلاق کو سنوارنے کا بیڑا اٹھانا تھا لیکن آپ خاموش رہے تاکہ اُن خدّام کی دلآزاری نہ ہو جن کو اس فعل سے روکنا تکلّف میں داخل ہو جاتا۔

پس اِس واقعہ کا حُسن آپ کی اس خاموشی میں مضمر ہے جو اپنے لئے اس چیز کو ناپسند کرتے ہوئے بھی آپ نے اختیار فرمائی۔ یہ خاموشی ایک باریک مگر ناقابلِ تردید دلیل اس بات پر بھی ٹھہرتی ہے کہ اس انسان میں ریا اور عُجب کا شائبہ تک نہ پایا جاتا تھا۔ ورنہ کیا عمدہ موقع تھا اپنے تقویٰ کے بلند مقام کی نمائش کا۔ جب تک بچّے نے مکرّر سوال کرکے مجبور نہ کر دیا، دل ہی دل میں اپنے اس حسین فیصلہ کو داد دینے والی نگاہوں سے چھپاتے چھپاتے چلتے رہے پھر جب بولنے پر مجبور بھی ہوئے تو منع کرنے کا انداز کتنا پیارا ہے۔ سوال کے جواب میں ایک چھوٹا سا سوال کر دیتے ہیں۔ "میاں! ہمیں یہ تو بتاؤ کہ کس کی اجازت سے یہ مسواکیں حاصل کی گئی ہیں"۔ کوئی اپنی نیکی کا عُجب نہیں، کوئی رعُونت نہیں۔ نصیحت میں کوئی تلخی نہیں کوئی خشونت نہیں، مسکراتے ہُوئے نرم الفاظ کے لبادے میں ملائم یہ سوال ہے "میاں! ہمیں یہ تو بتاؤ..."

فضاؤں میں مہک بکھیرنے والے عطر بیز اخلاق بڑے بڑے ترازوں پر نہیں تولے جاتے بلکہ چھوٹے چھوٹے نرم و نازک واقعات کی ایسی ہی زُود حس میزانوں پر تُلتے ہیں۔

گو اس واقعہ کا تعلق دراصل حضرت مرزا صاحب علیہ السلام کی سیرت سے ہے، لیکن یہاں یہ بتانا مطلوب ہے کہ یہ وہ باپ تھا جس کی تربیت کے سائے تلے محمود پل کر جوان ہُوا۔

یہ چند نمونے آپ کے اندازِ تربیت کے ہیں، لیکن خود حضرت مرزا صاحبؑ کے نزدیک

تربیت کا سب سے مقدّم ذریعہ دعا تھا۔ وہ شخص جو اپنی اولاد کے لئے اس کے خلعتِ وجود پہننے سے بھی پہلے انتہائی گریہ وزاری کے ساتھ دعائیں مانگتا رہا ہو، یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنی موجود اولاد کے بارہ میں دعاؤں سے غافل ہو جاتا جب کہ صورتِ احوال یہ تھی کہ دُعا پر آپ کا انحصار کرنا صرف اپنی اولاد کے معاملہ تک ہی محدود نہ تھا بلکہ اعتقاداً آپ دُعا کو ہر دوسرے ذریعہ پر اوّلیت دیتے تھے اور اسباب کی پیروی کو محض اس لئے اختیار فرماتے تھے کہ اسباب بھی خدا ہی کے پیدا کردہ ہیں اور ان کو اختیار کرنا بھی اُسی کی منشاء کے مطابق ہے۔ بسا اوقات جب آپ بعض لوگوں کو اس رنگ میں تربیت کرتا دیکھتے کہ گویا محض ان کی تربیت ہی پر بچوں کے اخلاق کے بننے یا بگڑنے کا انحصار ہے تو آپ کو اس سے شدید تکلیف ہوتی۔ یہاں تک کہ آپ کے نزدیک دُعا کے ذریعہ خدا سے مدد مانگنے کے بغیر تربیت کے دیگر ذرائع پر انحصار کرنا شرک کا درجہ رکھتا تھا۔

مندرجہ ذیل روایت ہمارے مافی الضمیر کو کھول کر بیان کرنے میں ممد ثابت ہوگی :۔

> "ایک مرتبہ ایک دوست نے اپنے بچے کو مارا۔ آپؑ اس سے بہت متاثر ہوئے اور انہیں بُلا کر بڑی دردانگیز تقریر میں فرمایا "میرے نزدیک بچوں کو یوں مارنا شرک میں داخل ہے۔ گویا بدمزاج مارنے والا ہدایت اور ربوبیت میں اپنے تئیں حصہ دار بنانا چاہتا ہے۔ ایک جوش والا آدمی جب کسی بات پر سزا دیتا ہے تو اشتعال میں بڑھتے بڑھتے ایک دشمن کا رنگ اختیار کر لیتا ہے اور جُرم کی حد سے سزا میں کوسوں تجاوز کر جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص خود دار اور اپنے نفس کی باگ کو قابو سے نہ دینے والا اور پورا متحمل اور بُردبار اور باسکون اور باوقار ہو تو اسے البتہ حق پہنچتا ہے کہ کسی وقتِ مناسب پر کسی حد تک بچہ کو سزا دے یا چشم نمائی کرے۔ مگر مغضوب الغضب اور سبک سر اور طائش العقل ہرگز سزاوار نہیں کہ بچوں کی تربیت کا متکفل ہو۔ جس طرح اور جس قدر سزا دینے میں کوشش کی جاتی ہے، کاش دعاؤں میں لگ جائیں اور بچوں کے لئے سوزِ دل سے دُعا کرنے کو ایک حزب مقرر کر لیں۔ اس لئے کہ والدین کی دُعا کو بچوں کے حق

میں خاص قبول بخشا گیا ہے ۔میں التزاماً چند دعائیں ہر روز مانگا کرتا ہوں"

جو چند واقعات جستہ جستہ ہم تک پہنچے ہیں، محض نمونہ ہیں اور اس اُنیس ۱۹ سالہ زندگی کے تمام دَور پر حاوی نہیں جس میں حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود احمدؓ کو اپنے جلیل القدر والد سے تربیت حاصل کرنے کی سعادت نصیب ہُوئی۔ اس تربیت کی چند جھلکیاں جو پیش کی گئی ہیں، انہیں دیکھ کر بے اختیار دل چاہتا ہے کہ کاش ایک سینما سکوپ کی طرح تربیت کے اِن حسین نظاروں کی وہ تمام تصویریں متحرک ہو کر ہماری آنکھوں کے سامنے پھر جائیں!

تاریخ کا یہ دَور جس حد تک بھی محفوظ ہے، اسے دیکھ کر ایک قطعی نتیجہ یہ نکالا جا سکتا ہے کہ جس طرح مقناطیس اپنی قوتِ جاذبہ کو دوسرے لوہے کے ٹکڑے کی طرف منتقل کرتا ہے، اسی طرح حضرت مرزا صاحب علیہ السلام اپنی شخصیت کے تمام حُسن کو حضرت صاحبزادہ صاحب کی شخصیت میں منتقل فرماتے رہے۔ بنی نوع انسان کی جو ہمدردی آپ کے دل میں تھی اس سے آپ اس بچے کے دل کو بھی بھرتے رہے۔ خدا کی دیگر مخلوق کے لئے جس جذبۂ رحم سے آپ کا سینہ بھرپور تھا وہی جذبۂ رحم آپ اپنے اس بچے کے سینہ میں بھی موجزن دیکھنا چاہتے تھے۔ باتیں چھوٹی چھوٹی اور اندازِ نصیحت نہایت سادا اور پیارا ہے۔ لیکن اس کے نتیجہ میں ایک اثر قبول کرنے والا بچہ مخلوقِ خدا کے لئے ایک گداز دل کی نعمت پا جاتا ہے:۔

"ایک بار آپ دالان کے دروازے بند کر کے چڑیاں پکڑ رہے تھے۔ حضرت صاحب جمعہ کی نماز کے لئے باہر جاتے ہوئے وہاں سے گزرے تو دیکھ کر فرمایا۔ میاں! گھر کی چڑیاں نہیں پکڑا کرتے، جس میں رحم نہیں اس میں ایمان نہیں۔"[1]

حضرت صاحبزادہ صاحب کی سیرت کا یہ دَور اپنے بزرگ والد کی سیرت سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور ایک کا بیان دوسرے کے بغیر ممکن نہیں۔ آپ نے صرف اپنے اخلاق ہی سے حضرت صاحبزادہ صاحب کی شخصیت کو معمور نہیں کیا بلکہ جن اقدار کو آپ اولیت دیتے تھے، اُن اقدار کو اوّلیت دینا بھی اپنے اس پیارے بچے کو سکھایا اور اخلاق میں بھی حفظِ مراتب کے آداب سکھائے:

"ایک دفعہ تعلیم الاسلام سکول کے طلبہ کو مضمون دیا گیا کہ "علم اور دولت کا مقابلہ کرو"۔ صاحبزادہ صاحب نے اس مضمون کے متعلق بہت

---

[1] سیرت مسیح موعودؑ صہ۲۴۳

سوچا لیکن فیصلہ نہ کر سکے کہ علم اور دولت میں سے کونسا اچھا ہے۔
کھانے پر جب کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام بھی بیٹھے ہوئے
تھے۔آپؓ نے اپنے چھوٹے بھائی حضرت صاحبزادہ میاں بشیر احمد
صاحبؓ سے باتوں باتوں میں پوچھا۔بشیر! تم بتا سکتے ہو کہ علم اچھا ہے
یا دولت؟ حضرت میاں بشیر احمد صاحبؓ تو خاموش رہے البتہ خود
حضور علیہ السلام نے یہ بات سُن کر فرمایا "بیٹا محمود! توبہ کرو۔
توبہ کرو۔ نہ علم اچھا نہ دولت۔خدا کا فضل اچھا ہے"[1]

اس لطیف اندازِ تربیت کا یہ اثر تھا کہ جس بے پناہ حُسنِ اخلاق کے حضرت مرزا صاحبؑ خود مالک تھے وہی حسن حضرت صاحبزادہ صاحب کے کردار میں بھی بدرجۂ اتم سرایت کر گیا اور بعد ازاں ہمیشہ آپ کے دیکھنے والوں کا ذہن، خصوصاً ان دیکھنے والوں کا جنہوں نے آپ کے مقدس باپ کا چہرہ بھی دیکھا ہُوا تھا، اس الٰہی وعدے کی یاد دلاتا رہا کہ وہ حُسن و احسان میں تیرا نظیر ہوگا۔صرف دوستوں ہی نے اس حقیقت کو نہیں پایا بلکہ اغیار کی آنکھ بھی اس مماثلت کو خوب پہچانتی رہی۔ یہ الگ بات ہے کہ اُن کی زبان اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے تلخی کی آمیزش لئے ہوتی تھی۔

حضرت صاحبزادہ صاحب ہمیشہ لطیفے کے طور پر بچپن کے زمانے کا ایک واقعہ بیان فرمایا کرتے تھے کہ اُن کی تائی جو حضرت مرزا صاحبؑ کے بڑے بھائی مرزا غلام قادر صاحب مرحوم کی بیوہ تھیں اور حضرت مرزا صاحب کی زندگی میں اور آپ کے وصال کے بعد ایک عرصہ تک آپ پر ایمان نہ لائی تھیں، جب حضرت صاحبزادہ صاحب کو دیکھا کرتیں تو بڑی تلخی سے یہ کہتی تھیں:

"جیہو جیا کاں اوہو جیہی کوکو"

حضرت صاحبزادہ صاحب کو اس وقت چونکہ پنجابی زبان کا پورا محاورہ نہ تھا اس لئے بہت مدّت تک، اس کا مفہوم نہ سمجھ سکے۔بعد ازاں پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس سے مراد یہ تھی جس خُو کا باپ تھا ویسا ہی اُس کا بچہ۔ اسی دشمن آنکھ نے اپنی آخری عمر میں یہ بھی توفیق پائی کہ اس مماثلت کو مماثلتِ حسن و احسان کے طور پر پہچان لے۔چنانچہ وہ تائی جو اپنے دیور پر ایمان لانا اپنی غیرت اور شان کے خلاف سمجھتی تھی اپنی آخری عمر میں اپنے اس بھتیجے کے ہاتھ پر ایمان لا کر سلسلہ عالیہ احمدیہ میں داخل ہوئی۔نفرت کی جگہ محبت نے لے لی اور رعونت کی جگہ اس درجہ انکسار نے کہ اِس بچے

---

[1] سیرت مسیح موعودؑ صـ۴۴۳

کی آمد پر بڑھاپے اور کمزوری کے باوجود احتراماً اُٹھ کر کھڑی ہو جاتی تھی۔
یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہو گا کہ حضرت مرزا صاحبؑ کو اللہ تعالیٰ نے یہ دو لفظی الہام فرمایا تھا:
"تائی آئی"۔ یہ الہام مدّت تک دشمنوں کی تضحیک کا موجب بنا رہا اور اس وقت اس کے معنے دنیا پر کھلے جب کہ آپ کی یہی بھاوج جو آپ کے بچوں کی تائی تھیں، آپ کی زندگی میں ایمان سے محروم رہ کر آپ کے بیٹے کے ہاتھ پر اس حیثیت سے سلسلہ میں داخل ہوئیں کہ قادیان کی گلی گلی میں "تائی آئی" کا شور مچ گیا۔

آپ کی تربیت میں آپ کی بزرگ والدہ کا حصّہ

یہ مضمون اُدھورا رہے گا اگر یہ ذکر نہ کیا جائے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تربیت کے ساتھ ساتھ حضرت صاحبزادہ صاحبؓ کی بزرگ والدہ حضرت سیدہ نصرت جہاں بیگم رضی اللہ عنھا کی تربیت کا بھی آپ کے کردار کی تشکیل پر نہایت گہرا اثر پڑا۔ بہت کم ہوتے ہیں وہ خوش نصیب بچے جن کے والدین دونوں ہی اعلیٰ مربیانہ اوصاف سے متصف ہوں۔ مزید براں دونوں کی تربیت کے دھارے ایک ہی سمت میں بہتے ہوں اور دونوں کے مزاج میں تضاد کی بجائے ہم آہنگی پائی جائے۔

حضرت صاحبزادہ مرزا محمود احمد صاحب کے شاندار مستقبل کے بارہ میں جو پیشگوئی کی گئی تھی اس کی عملی تصویر بنانے کے لئے جو مختلف اسباب کارفرما تھے، ان میں یہ بھی ایک اہم سبب تھا۔ باقی تمام امور بچے کی تربیت کے لئے خواہ کیسے ہی مؤید کیوں نہ ہوں۔ اگر صرف یہی رخنہ پڑ جائے کہ ماں باپ کا اندازِ تربیت ایک دوسرے کی ضد یا مزاج اور مطمحِ نظر مخالف ہوں تو صرف یہ ایک سبب ہی بچے کی تربیت میں گہرے گھاؤ ڈال دیتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا آپ پر غیر معمولی احسان تھا کہ ماں بھی آپ کو وہ نصیب ہوئی جو شرافت اور نجابت اور فنِ تربیت میں ایک بلند شان رکھتی تھی اور آپ کا مطمحِ نظر بھی وہی تھا جو حضرت اقدس مرزا غلام احمد علیہ السلام کا تھا۔

آپ کی والدہ حضرت سیّدہ نصرت جہاں بیگمؓ جو راقم الحروف کی دادی تھیں، اور چوبیس ۲۴ سال تک مجھے بھی آپ کا زمانہ پانے کی سعادت نصیب ہوئی ہے، بڑے سادہ اور مؤثر الفاظ میں نصیحت فرمایا کرتی تھیں۔ بناوٹ اور تصنّع کے کوچے سے ناآشنا صدق وصفا کی مظہر تھیں۔ آپ کی ہر بات محبّت بھری سچائی سے معطّر تھی۔ سوائے غصّہ کے میں نے آپ کی کسی بات میں کبھی ادنیٰ سا تکلّف کا شائبہ تک نہ دیکھا۔ دل کی چونکہ بے حد نرم تھیں۔ غصّہ بہت کم اور وہ بھی برائے نام ہی آتا تھا لہذا کبھی بچوں کے ساتھ کسی حرکت پر اظہار ناراضگی مقصود ہو تو زبردستی غصہ ظاہر فرمایا کرتیں۔ اور ہم بعد میں ہنسا کرتے کہ حضرت اماں جان کو غصّہ وغیرہ تو کوئی نہیں ہے محض ہماری تنبیہ کی خاطر

اظہار کر رہی ہیں۔ اس ظاہری غصہ کے بعد جس کا کوئی دکھ ہم بچوں کو نہیں پہنچتا تھا۔ خود ہی پریشان ہو جاتی تھیں اور بچے کی دلجوئی کی کوشش فرماتیں۔ ہم بچے تو آپ کے پوتوں، پوتیوں نواسوں، نواسیوں کی حیثیت سے کبھی کبھی آپ سے فیضیاب ہوتے تھے۔ ہاں وہ اولاد بڑی خوش قسمت تھی جسے مسلسل آپ کا فیضان حاصل رہا۔ میرے والد حضرت مرزا محمود احمد صاحبؓ کے بچپن کے زمانے میں آپ کا کیا اندازِ تربیت تھا اس کے متعلق بہترین بیان آپ کی اولاد ہی میں سے کسی کا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اپنی بڑی پھوپھی جان حضرت نواب مبارکہ بیگم صاحبہ کے ایک مضمون میں سے متعلقہ اقتباس پیشِ خدمت ہے۔ آپ فرماتی ہیں :-

"بچے پر ہمیشہ اور بہت پختہ اعتبار ظاہر کر کے اس کو والدین کے اعتبار کی شرم اور لاج ڈال دینا یہ آپ کا بڑا اصولِ تربیت ہے۔ جھوٹ سے نفرت اور غیرت و غنا آپ کا اوّل سبق ہوتا تھا۔ ہم لوگوں سے بھی آپ ہمیشہ یہی فرماتی رہیں کہ بچے میں یہ عادت ڈالو کہ وہ کہنا مان لے پھر بے شک بچپن کی شرارت بھی آئے تو کوئی ڈر نہیں۔ حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا ہمیشہ فرماتی تھیں کہ میرے بچے جھوٹ نہیں بولتے اور یہی اعتبار تھا جو ہم کو جھوٹ سے بچاتا بلکہ متنفر کرتا تھا ... اور مجھے یاد ہے کہ حضور اقدس سے حضرت والدہ صاحبہ کی بے حد محبت و قدر کرنے کی وجہ سے آپ کی قدر میرے دل میں اور بھی بڑھا کرتی تھی۔

بچوں کی تربیت کے متعلق ایک اصول آپ یہ بھی بیان فرمایا کرتی تھیں کہ پہلے بچے کی تربیت پر اپنا پورا زور لگاؤ تو دوسرے اُن کا نمونہ دیکھ کر خود ہی ٹھیک ہو جاتیں گے۔"[1]

---

[1] سیرت اُمّ المومنینؓ مصنفہ شیخ محمود احمد صاحب عرفانی حصہ اوّل صفحہ ۹۵-۳۹۴

تربیت قبول کرنے کی اہلیت

رنگ خواہ کیسا ہی دیدہ زیب اور پختہ اور دیرپا کیوں نہ ہو جب تک کسی کپڑے میں اُسے قبول کرنے کی پوری صلاحیت موجود نہ ہو وہ رنگ اس پر چڑھ نہیں سکتا۔ تربیت کا رنگ بھی اسی شرط کا محتاج ہے۔ اس پہلو سے جب ہم حضرت صاحبزادہ مرزا محمود احمد صاحبؓ کی سیرت کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں آپ کی ذات میں یہ خوبی بدرجۂ اتم موجود نظر آتی ہے کہ اچھی باتوں کو قبول کرنے اور خوبصورت رنگوں کو اپنانے کا مادہ آپ کو بدرجۂ احسن ودیعت ہوا تھا۔ یہی نہیں بلکہ غلط نقش کو رد کر دینے کی اہلیت بھی آپ بخوبی رکھتے تھے۔ حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کی لمبی تربیت کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ آپ اچھی بات کو جو اچھے اور عمدہ طریق پر کہی گئی ہو قبول کرتے تھے بلکہ ایسی نصیحت کو بھی جو بظاہر سخت کڑوی ہو لیکن فی ذاتہٖ درست ہو آپ بغیر تردد اور نفسیاتی اُلجھن کے قبول فرما لیتے تھے۔ ایک واقعہ اس ضمن میں اس پہلو سے خصوصاً قابلِ غور ہے کہ اچھی مگر تلخی سے کی ہوئی نصیحت کو نہ صرف آپ نے قبول کیا بلکہ اس نصیحت کرنے والے کا احسان زندگی بھر محسوس فرماتے رہے :

> "مجھے ایک دوست کا احسان اپنی ساری زندگی میں نہیں بھول سکتا اور میں جب کبھی اس دوست کی اولاد پر کوئی مشکل پڑی دیکھتا ہوں تو میرے دل میں ٹیس اُٹھتی ہے اور اُن کی بہبودی کے لئے دعائیں کیا کرتا ہوں ... ۱۹۰۳ء کی بات ہے جب کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام مولوی کرم دین والے مقدمہ کی پیروی کے لئے گورداسپور میں مقیم تھے وہ دوست جن کا میں ذکر کر رہا ہوں، مراد آباد یو۔پی کے رہنے والے تھے اور فوج میں رسالدار میجر تھے۔ محمد ایوب ان کا نام تھا۔ وہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ملنے کے لئے گورداسپور آئے تھے۔ انہوں نے دو باتیں ایسی کیں جو میرے لئے ہدایت کا موجب ہوئیں۔ دلی میں رواج تھا کہ بچے باپ کو تُم کہہ کر خطاب کرتے، اسی طرح بیوی خاوند

کو تم کہتی۔ لکھنو وغیرہ میں "آپ" کے لفظ سے مخاطب کرتے ہیں۔ گھر میں ہمیشہ تم تم کا لفظ سنتے رہنے سے میری عادت بھی تم کہنے کی ہو گئی تھی۔ یوں تو میری عادت تھی کہ میں حتی الوسع حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مخاطب کرنے سے کتراتا تھا۔ لیکن اگر ضرورت پڑ جاتی اور مجبوراً مخاطب کرنا پڑتا تو تم کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ چنانچہ مجھے اس دوست کی موجودگی میں آپؑ سے کوئی بات کرنی پڑی اور میں نے تم کا لفظ استعمال کیا۔ یہ لفظ سُن کر اس دوست نے مجھے بازو سے پکڑ لیا اور مجلس سے ایک طرف لے گئے اور کہا "میرے دل میں آپ کا بڑا ادب ہے لیکن یہ ادب ہی چاہتا ہے آپ کو آپ کی غلطی سے آگاہ کروں۔ اور وہ یہ کہ آپ کو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مخاطب کرتے وقت کبھی بھی تم کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ آپ کے لفظ سے مخاطب کریں۔ ورنہ آپ نے پھر یہ لفظ بولا تو جان لے لوں گا" مجھے تو تم کا لفظ استعمال کرتے رہنے کی وجہ سے تم اور آپ میں کوئی فرق محسوس نہ ہوتا تھا بلکہ میں آپ کی نسبت تم کے لفظ کو زیادہ پسند کرتا تھا۔ اور حالت یہ تھی کہ آپ کا لفظ بولتے ہوئے مجھے بوجہ عادت نہ ہونے کے شرم سے پسینہ آجاتا تھا کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ آپ کہنا جُرم ہے۔ مگر اس دوست کے سمجھانے کے بعد میں آپ کا لفظ استعمال کرنے لگا اور ان کی اس نصیحت کا اثر اب تک میرے دل میں موجود ہے۔

اسی طرح ایک دفعہ میں نے لاہور آنے پر یہاں بعض لڑکوں کو نکٹائی لگاتے دیکھا اور میں نے بھی شوق سے ایک نکٹائی خرید لی اور پہننی شروع کر دی۔ گورداسپور ہی کا واقعہ ہے کہ وہی مرحوم دوست مجھے پکڑ کر ایک طرف لے گئے اور کہنے لگے "آج آپ نے نکٹائی پہنی ہے تو ہم کل کنچنیوں کا تماشہ دیکھنے لگ جائیں گے۔ کیونکہ ہم نے تو آپ سے سبق سیکھنا ہے۔ جو قدم آپ اٹھائیں گے، ہم بھی آپ کے پیچھے چلیں گے۔" یہ کہہ کر انہوں نے مجھ سے نکٹائی مانگی اور میں نے اُتار کر ان کو دے دی

پس اُن کی یہ دو نصیحتیں مجھے کبھی نہیں بھول سکتیں اور میں
سمجھتا ہوں کہ ایک مخلص متبع کو ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ اگر ہمارے خاندان
کا کوئی نوجوان اپنی ذمہ داری کو نہیں سمجھتا تو صاحبزادہ صاحب! صاحبزادہ
صاحب کہہ کر اس کا دماغ بگاڑنا نہیں چاہیئے بلکہ اس سے کہنا چاہیئے
کہ آپ ہوتے تو صاحبزادہ ہی تھے مگر اب غلام زادہ سے بھی بدتر معلوم
ہو رہے ہیں اس لئے آپ کو چاہیئے کہ اپنی اصلاح کریں" [1]

اس روایت سے جہاں اور بہت سے سبق ملتے ہیں وہاں یہ دلچسپ حقیقت بھی سامنے آ جاتی ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صحابہ کے دل میں آپ کا عشق اتنا غالب تھا کہ اس کے مقابل پر کسی دوسری محبت کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ یہ درست ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صحابہ کو آپ کی اولاد سے بھی بہت پیار تھا اور بکثرت شواہد ملتے ہیں کہ وہ آپ کی اولاد کے ساتھ نہایت پیار اور محبت کا سلوک روا رکھتے تھے۔ لیکن اُن کی یہ محبت کسی کورانہ تقلید کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ اس عرفان کی وجہ سے تھی کہ اس زمانہ میں تمام برکتوں اور اعلیٰ اقدار کا سرچشمہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں اور خوب جانتے تھے کہ جڑ کو اپنی شاخ پر بہرحال فضیلت ہے اور وہ اسی وقت تک اور اسی حد تک پیار کے لائق ہے جس حد تک وہ اس سرچشمہ کے قریب ہو۔

یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسلام کوئی ظاہری لباس معیّن کرتا ہے جس کا ترک کرنا کسی انسان کو قابلِ مواخذہ بنا دے اور کیا فقط شلوار قمیص ہی اسلامی لباس ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس روایت سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انگریز ہندوستان میں ایک حاکم کے طور پر آیا اور ہندوستانیوں نے اس کے لباس اور عادات اور اطوار کو اس بناء پر قبول نہیں کیا کہ ان میں کوئی فوقیت پائی جاتی تھی بلکہ یہ نقل ایک غلامانہ ذہنیت کے نتیجہ میں شروع ہوئی۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صحابہؓ آپؑ کی اولاد سے اتنی بلند توقعات رکھتے تھے کہ ان کے لئے ایک ادنیٰ سی لغزش بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

اگرچہ اصولاً واجب الاطاعت امام ہی نمونہ ہوتا ہے اور اس کی اولاد سے غلط نمونہ اخذ کرنا نامناسب اور بے اصول طریق ہے اور قرآن کریم نے اس مسئلہ کو خوب کھول کر بیان فرما دیا ہے

---

[1] الفضل لاہور ۱۸ فروری ۱۹۴۸ء

لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں اور اس طرف بھی قرآن کریم میں اشارہ موجود ہے کہ عوام الناس جو اصول کو اچھی طرح نہیں سمجھتے' بسا اوقات امام کے قریب تر رہنے والوں سے بھی نمونہ پکڑتے ہیں خواہ وہ بُرا ہی کیوں نہ ہو' لہٰذا جہاں تک اہلِ بیت کا تعلق ہے ان پر بہرحال دوھری احتیاط کی ذمہ داری ہے۔ اس پہلو سے اس زمانہ میں جب کہ مغربی تہذیب صرف ایک لباس ہی کے ذریعہ ہماری قدیم تمدنی روایات پر حملہ آور نہیں ہو رہی تھی بلکہ اس کے ساتھ بہت سی دیگر اخلاقی خرابیاں بھی شریعت سے ہندوستان میں پھیل رہی تھیں۔ انگریزی لباس کو اپنانے کے نتیجے میں ایسے طبقہ کے لئے جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے' یقیناً یہ خطرہ تھا کہ وہ انگریز کے لباس کے ساتھ دیگر بُرائیوں میں بھی ملوّث ہو جاتے۔ اس خطرہ کی نشاندہی مکرم و محترم رسالدار میجر محمد ایوب خان صاحب مرحوم نے کھلے لفظوں میں فرمائی ہے اور آپ نے اسے دُرست تسلیم فرمایا اور آئندہ کے لئے اس لباس کو ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

میں خاص طور پر اس امر کی وضاحت اس لئے کر رہا ہوں کہ اس واقعہ سے غلط استنباط کرتے ہوئے کوئی اسے شرعی مسئلہ نہ سمجھ بیٹھے جب کہ خود حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحبؓ کے نزدیک اس کی یہ حقیقت نہ تھی۔ اس ضمن میں حضرت مرزا محمود احمد صاحب کے بچپن کے ایام کے ذکر سے چند لمحے کی رخصت لیتے ہوئے ایک بہت بعد کا واقعہ بیان کرتا ہوں جو میرے سامنے گزرا اور جس کے اور بہت سے گواہ بھی موجود ہیں :

واقعہ یوں ہے کہ ۱۹۵۵ء میں جب حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد امامِ جماعت احمدیہ بغرض علاج انگلستان تشریف لے گئے تو حضور کے دوسرے کئی بچوں کی طرح مجھے بھی حضورؓ کی معیت کی سعادت نصیب ہوئی۔ وہاں ایک موقعہ پر کھانا کھاتے ہوئے مکرم و محترم چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب سے انگریزی لباس کے مسئلہ پر گفتگو چل پڑی۔ محترم چوہدری صاحب چونکہ خود کوٹ پتلون استعمال فرماتے تھے اس لئے چاہتے تھے کہ ایک دفعہ کُھل کر حضور اس بارہ میں کوئی فیصلہ صادر فرمائیں۔ اس موقع پر حضرت صاحب نے جو مؤقف اختیار فرمایا' وہ وہی تھا جس کا میں ذکر کر آیا ہوں' یعنی یہ لباس خصوصاً اس لئے آپ کو ناپسند تھا کہ یہ ہماری قوم کی غلامانہ ذہنیت کا آئینہ دار تھا۔ آخر یہ کیا وجہ ہے کہ انگریزوں نے اپنی حکومت کے زمانہ میں ہمارا لباس نہیں اپنایا بلکہ وہ اپنے لئے اُسے ذلت کا موجب سمجھتے رہے۔ ایسی صورت میں آپ کے نزدیک یہ بے غیرتی اور بے حمیتی تھی کہ اُن کے لباس کو اختیار کیا جاتے۔ حضورؓ کا یہ جواب سُن کر محترم چوہدری

صاحب نے گذارش کی کہ اب تو وہ صورتِ حال باقی نہیں اور کیا انگریز اور کیا امریکن سب مغربی قومیں بکثرت ہمارا لباس اختیار کرنے لگی ہیں لہٰذا وہ کراہت باقی نہیں رہنی چاہیئے۔ مکرم چوہدری صاحب نے یہ بھی گزارش کی کہ مُرورِ زمانہ سے اب آہستہ آہستہ یہ انگریزی لباس ایک بین الاقوامی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور مشرق بعید کی دوسری آزاد اور باغیرت قومیں بھی اسے اپنا چکی ہیں، نیز ہمارے لباس کی نسبت یہ کچھ سستا بھی پڑتا ہے۔ خاص طور پر یورپین ممالک میں شلوار، قمیص اور اچکن کو صاف ستھرا رکھنا بھی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اس پر حضور نے فرمایا کہ ہاں ایسی صورت میں تو کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں رہتی البتہ ٹائی لگانے کے متعلق مجھے یہ تردد ہے کہ کہیں یہ صلیب کی علامت نہ ہو اس لئے بغیر ٹائی کے استعمال کر لیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ چوہدری صاحب نے اس کے جواب میں جو گزارش کی وہ یہ تھی کہ ٹائی صلیب کی علامت یقیناً نہیں کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو یہودی قوم کبھی بھی اسے نہ اپناتی۔ نیز ٹائی دراصل سرد ممالک کے اس رومال کی بدلی ہوئی صُورت ہے جو گردن کو سردی سے محفوظ رکھنے کے لئے یہ قومیں استعمال کرتی تھیں، بعد ازاں اس کا کام صرف کالر کو بند کرنے کا رہ گیا۔ اس استدلال کو قبول کرتے ہوئے حضور نے نہ صرف اس کی اجازت فرمائی بلکہ محترم ڈاکٹر حشمت اللہ خاں صاحب مرحوم کو جو سفر میں حضورؓ کے ہمراہ تھے، بطور لطیفہ ایک ٹائی کا تحفہ بھی مرحمت فرمایا۔

اصل مضمون کی طرف واپس آتے ہوئے حضرت صاحبزادہ صاحبؓ کے تربیت سے متاثر ہونے اور بخوشی اسے قبول کرنے کا ایک اَور واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں :-

> "میں نے دیکھا ہے کہ بعض لوگوں کی بچپن میں تربیت کا اب تک مجھ پر اثر ہے اور جب وہ واقعہ یاد آتا ہے تو بے اختیار ان کے لئے دل سے دُعا نکلتی ہے۔ ایک دفعہ ایک لڑکے کے کندھے پر کہنی ٹیک کر کھڑا تھا کہ ماسٹر قادر بخش صاحبؓ نے جو مولوی عبدالرحیم صاحب دردؓ کے والد تھے، اس سے منع کیا اور کہا کہ یہ بُری بات ہے۔ اُس وقت میری عمر بارہ تیرہ سال کی ہوگی۔ لیکن وہ نقشہ جب بھی میرے سامنے آتا ہے، اُن کے لئے دل سے دُعا نکلتی ہے" لہ

اس واقعہ سے بھی مزید اس امر پر روشنی پڑتی ہے کہ آپ میں اچھی تربیت قبول کرنے کا کیسا

لہ اخبار الفضل قادیان ۱۱ر مارچ ۱۹۲۹ء

طبعی میلان پایا جاتا تھا اور صرف یہی نہیں کہ آپ نصیحت کی بات کو بُرا نہیں مناتے تھے بلکہ اس کے نتیجہ میں شکر گزاری کا ایسا شدید جذبہ دل میں پیدا ہو جاتا تھا کہ سالہا سال گزر جانے اور بچپن کے بعد جوانی اور جوانی کے بعد بڑھاپا آجانے کے بعد بھی اس کی شدت کم نہ ہوتی۔ یہ فقرہ بہت ہی فکر انگیز ہے کہ:

"جب وہ واقعہ یاد آتا ہے تو بے اختیار اُن کے لئے دل سے دُعا نکلتی ہے"

خود اپنی تربیت کی اہلیت

انسانی تربیت میں ایک بڑا حصہ اُن نصائح کا ہوتا ہے جو وہ اپنے بہی خواہوں سے سُنتا ہے اور ایک حصہ اس طعن و تشنیع کا جو دشمن کی زبان سے کسی نیک نیتی کے نتیجہ میں نہیں نکلتی بلکہ محض زخم پہنچانے کی خاطر صادر ہوتی ہے۔ ایک حصہ اُن حماقتوں کا بھی ہوتا ہے جو وہ گرد و پیش میں بیوقوفوں سے سرزد ہوتا ہُوا دیکھتا ہے اور ایک حصہ ان خود کردہ غلطیوں کا بھی، جن کے سرزد ہونے کے بعد جلد یا بدیر احساس ندامت دل و دماغ کو کریدنے لگتا ہے۔ ان سب امور کے علاوہ انسان کی اپنے گرد و پیش پر غور کرنے کی عمومی عادت بھی تربیت کے معاملے میں نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں اسی عادت کا ذکر ہے۔ اس طرزِ فکر کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ عادت کہ انسان اپنے گرد و پیش پر غور و فکر کرے اور اپنے نفس میں ڈوب کر معارف اور حقائق کے نئے نئے موتی تلاش کرتا رہے اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ جو باتیں اُسے آبائی عقائد اور عادات و اطوار کے نتیجہ میں از خود گویا ورثے میں ملی ہیں، انہیں آنکھیں بند کر کے قبول نہ کرے بلکہ اس وقت تک کہ وہ موروثی عقائد عقل کو قائل نہ کریں اور دل میں جاگزیں نہ ہو جائیں انہیں نہ اپنائے۔ جس انسان میں اِس قسم کی عادت ہو اُسے گویا ایک اندرونی مربّی عطا ہو جاتا ہے جو تا زندگی اس کے ساتھ رہتا اور اس کی فکری نشوونما میں ہمیشہ مددگار بنا رہتا ہے۔ یہ طرزِ فکر ذہنی دیانت کا بھی متقاضی ہے جس کے بغیر صحیح نتائج تک رسائی ممکن نہیں۔ حضرت صاحبزادہ صاحب کو یہ مربّی بھی عطا ہُوا تھا۔ اور آپ کو بڑے بڑے مسائل سے لے کر چھوٹی چھوٹی باتوں پر غور کرنے اور انہیں ذہن میں منقلب کرتے رہنے کی عادت تھی۔ دو واقعات اس تعلق میں بطور مثال پیش ہیں۔ اوّلاً۔ آپ فرماتے ہیں:۔

"میں نے بچپن میں یہ اعتراض آریوں کا سُنا کہ خُدا کچھ پیدا نہیں کرسکتا

وہ کسی چیز کے پیدا کرنے کے لئے روح اور مادہ دونوں کا محتاج ہے۔
میری یہ عادت تھی کہ ایسے مسائل کو لے کر جو عقل کے مخالف ہوتے' میں غور
کیا کرتا تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میں ایک دفعہ رات کے وقت دیوار سے
ٹیک لگائے ستاروں پر غور کر رہا تھا۔ میں نے یہ خیال کرنا شروع کیا کہ ان
ستاروں کے اوپر بھی کوئی چیز ہے تو میں نے خیال کیا کہ اگر کوئی چیز نہیں
تو خلاء ناممکن ہے اور اگر کہو کہ کچھ اور بھی ہے تو پھر اس کے بعد کچھ اور
بھی ہوگا۔ غرضیکہ اسی طرح سوچتے سوچتے میں نے دیکھا کہ انسان تو اس
نظری مسئلہ کو بھی حل نہیں کر سکتا اور اس سوال کے دو ہی جواب ہیں'
اور دونوں ہی ناممکن ہیں" [1]

ایک اور موقعہ پر آپ فرماتے ہیں :۔

"میں علمی طور پر بتلاتا ہوں کہ میں نے حضرت صاحبؑ کو والد ہونے کی
وجہ سے نہیں مانا تھا بلکہ جب میں گیارہ سال کے قریب کا تھا تو میں نے مصمم
ارادہ کیا تھا کہ اگر میری تحقیقات میں وہ نعوذ باللہ جھوٹے نکلے تو میں گھر
سے نکل جاؤں گا۔ مگر میں نے ان کی صداقت کو سمجھا اور میرا ایمان بڑھتا
گیا حتٰی کہ جب آپ فوت ہوئے تو میرا یقین اور بھی بڑھ گیا" [2]

اس سلسلہ میں یہ تیسرا واقعہ بھی آپ کے ذہنی انقلاب کی نشاندہی کرتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"۱۹۰۰ء میرے قلب کو اسلامی احکام کی طرف توجہ دلانے کا موجب ہوا
اس وقت میں گیارہ سال کا تھا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے
لئے کوئی شخص چھینٹ کی قسم کے کپڑے کا ایک جُبّہ لایا تھا۔ میں نے آپ
سے وہ جُبّہ لے لیا تھا کسی اور خیال سے نہیں بلکہ اس لئے کہ اس کا رنگ
اور اس کے نقش مجھے پسند تھے' میں اسے پہن نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ اس
کے دامن میرے پاؤں سے نیچے لٹکتے رہتے تھے۔
جب میں گیارہ سال کا ہوا اور ۱۹۰۰ء نے دنیا میں قدم رکھا تو میرے
دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ میں خدا تعالیٰ پر کیوں ایمان لاتا ہوں' اس کے

---

[1] الفضل ۲۴ راگست ۱۹۱۴ء صہ ۵ [2] الفضل ۷ رجون ۱۹۳۴ء صہ ۵

وجود کا کیا ثبوت ہے؟ میں دیر تک رات کے وقت اس مسئلہ پر سوچتا رہا۔ آخر دس گیارہ بجے میرے دل نے فیصلہ کیا کہ ہاں ایک خدا ہے۔ وہ گھڑی میرے لئے کیسی خوشی کی گھڑی تھی جس طرح ایک بچے کو اس کی ماں مل جائے تو اسے خوشی ہوتی ہے اسی طرح مجھے خوشی تھی کہ میرا پیدا کرنے والا مجھے مل گیا۔ سماعی ایمان علمی ایمان سے تبدیل ہو گیا۔ میں اپنے جامہ میں پھولا نہیں سماتا تھا۔ میں نے اسی وقت اللہ تعالیٰ سے دُعا کی اور ایک عرصہ تک کرتا رہا کہ خدایا! مجھے تیری ذات کے متعلق کبھی شک پیدا نہ ہو۔ اس وقت میں گیارہ سال کا تھا۔۔ مگر آج بھی اس دُعا کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ میں آج بھی یہی کہتا ہوں خدایا تیری ذات کے متعلق مجھے کبھی شک پیدا نہ ہو۔ ہاں اُس وقت میں بچہ تھا۔ اب مجھے زائد تجربہ ہے۔ اب میں اس قدر زیادتی کرتا ہوں کہ خدایا مجھے تیری ذات کے متعلق حق الیقین پیدا ہو۔

جب میرے دل میں خیالات کی وہ موجیں پیدا ہونی شروع ہوئیں جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے تو ایک دن ضحیٰ کے وقت یا اِشراق کے وقت میں نے وضو کیا اور وہ جُبّہ اس وجہ سے نہیں کہ خوبصورت ہے بلکہ اس وجہ سے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا ہے اور متبرک ہے یہ پہلا احساس میرے دل میں خدا تعالیٰ کے فرستادہ کے مقدس ہونے کا تھا، پہن لیا تب میں نے اس کوٹھڑی کا جس میں مَیں رہتا تھا دروازہ بند کر لیا اور ایک کپڑا بچھا کر نماز پڑھنی شروع کی اور میں اس میں خوب رویا خوب رویا، خوب رویا اور اقرار کیا کہ اب نماز کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ اس گیارہ سال کی عمر میں مجھ میں کیسا عزم تھا! اس اقرار کے بعد میں نے کبھی نماز نہیں چھوڑی گو اس نماز کے بعد کئی سال بچپن کے ابھی باقی تھے میرا وہ عزم میرے آج کے ارادوں کو شرماتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم۔ میں کیوں رویا فلسفی کہے گا۔ اعصابی کمزوری کا نتیجہ ہے۔ مذہبی کہے گا تقویٰ کا جذبہ تھا مگر مَیں جس سے یہ واقعہ گزرا کہتا ہوں، مجھے معلوم نہیں میں کیوں رویا؟

ہاں یہ یاد ہے کہ اس وقت میں اس امر کا اقرار کرتا تھا کہ پھر کبھی نماز نہیں چھوڑوں گا۔ اور وہ رونا کیسا بابرکت ہُوا! اور وہ افسردگی کیسی راحت بن گئی! جب اس کا خیال کرتا ہوں تو سمجھتا ہوں کہ وہ آنسو ہسٹیریا کے دَورہ کا نتیجہ نہ تھے۔ پھر وہ کیا تھے؟ میرا خیال ہے وہ شمس رُوحانی کی گرم کر دینے والی کرنوں کا گرایا ہُوا پسینہ تھے۔ وہ مسیح موعودؑ کے کسی فقرہ یا کسی نظر کا نتیجہ تھے اگر یہ نہیں تو میں نہیں کہہ سکتا کہ پھر وہ کیا تھے؟[1]

---

[1] الحکم جوبلی نمبر دسمبر ۱۹۳۹ء

تعلیم

ایک ایسا بچہ جس کی پیدائش اتنے بڑے عالمگیر نزاع کا مرکز بنی رہی ہو اور جس کی لمبی اور بامراد زندگی کے ساتھ اس کے باپ کی صداقت کی پہچان کی تمام تر امیدیں وابستہ ہوں یقیناً اس لائق ہے کہ اس کا باپ اس کی صحت وعافیت اور تعلیم و تربیت کے انتظام میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھے۔ لیکن تعجب ہوتا ہے کہ حضرت مرزا صاحب علیہ السلام کی طرف سے ایسا کوئی اقدام نہ کیا گیا۔ نہ اس بچے کی صحت وعافیت کی طرف کوئی غیر معمولی توجہ دی گئی نہ اس کی تعلیم و تربیت کا کوئی خاص اہتمام کیا گیا۔ یہ بات بھی نہ تھی کہ بچہ از خود ہی صحت مند اور توانا تھا یا تعلیم میں ویسے ہی بہت ہوشیار تھا اور کسی خصوصی توجہ کا محتاج نہ تھا۔ اس کے برعکس یہ ایک نحیف و ناتواں بچہ تھا جس کی صحت کسی بھی زاویہ نگاہ سے قابلِ رشک قرار نہیں دی جا سکتی تھی اور جس سے قبل پیدا ہونے والے اس کی والدہ کے تمام دوسرے بچے کم سنی ہی میں فوت ہو چکے تھے۔ آپ کی آنکھوں میں ککروں کا جو آزار تھا وہ محض جسمانی تکلیف کا موجب ہی نہیں تھا بلکہ حصولِ تعلیم میں بھی مشکلات پیدا کر رہا تھا۔ بسا اوقات آپ بچپن کے زمانہ میں آنکھوں کی بیماری کے باعث سکول جانے سے قاصر رہتے اور جاتے بھی تو پڑھائی کی طرف کماحقہٗ توجہ نہ دے سکتے۔ جس کے نتیجہ میں آپ کے بچپن کا تعلیمی دور کسی بھی دنیوی معیار کے لحاظ سے تسلی بخش قرار نہیں دیا جا سکتا۔

یہ ایک اہم نفسیاتی سوال ہے کہ وہ شخص جو اپنے ہاں کسی ایسے بچے کی ولادت کی پیشگوئی کرے جو لمبی عمر پانے والا اور صاحبِ علم و فضل ہو، وہ پیشگوئی اگر اس نے خود بنائی ہو اور اس کا الٰہی بشارات سے کوئی تعلق نہ ہو تو ایسی صورت میں اپنے بچوں کی تعلیمی دیکھ بھال وغیرہ سے متعلق اس کا کیا طرزِ عمل ہونا چاہیئے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی، دوست اور دشمن تمام دنیا کی آنکھیں اس بچے پر لگی ہوئی تھیں لیکن حیرت کی بات ہے کہ حضرت مرزا صاحب کو اس بارہ میں کبھی کوئی تشویش لاحق نہ ہوئی اور سوائے اس کے کہ حضرت صاحبزادہ صاحب کے قرآن کریم ناظرہ ختم کرنے پر آپ نے غیر معمولی خوشی منائی، صاحبزادہ صاحب کی تعلیم میں آپ کی کوئی خاص دلچسپی نظر نہیں آتی۔

زمانہ کے دستور کے مطابق صاحبزادہ صاحب کی تعلیم کا آغاز گھر پر ہی حروف کی سوجھ بوجھ

پیدا کرنے اور قرآن کریم ناظرہ پڑھنے کے ذریعہ ہُوا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس غرض سے حافظ احمد اللہ ناگپوریؓ کو مقرر فرمایا۔ آپ کو قرآن کریم سے جو عشق تھا اس کا کچھ اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب صاحبزادہ مرزا محمود احمد صاحبؓ نے ناظرہ قرآن کریم پڑھ لیا تو حضرت صاحب نے ایک نہایت شاندار تقریب اس موقع پر منعقد فرمائی اور بطور شکرانہ کے حافظ صاحب کو ڈیڑھ صد روپے کی رقم جو اس زمانہ کے معیار کے لحاظ سے ایک بہت بڑی رقم تھی، عطا فرمائی۔ اس تقریب میں قادیان کے دوستوں ہی کو مدعو نہیں کیا گیا بلکہ دُور دُور کے تعلق والوں کو بھی دعوت دی گئی۔ گویا باقاعدہ ایک جشن کا اہتمام تھا۔

علاوہ ازیں آپ نے ایک دعائیہ "آمین" بھی لکھی جو ایک جلسہ میں پڑھ کر سنائی گئی۔ اس آمین کا مطالعہ نہایت اہمیّت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس سے ایک طرف اس عظیم باپ کے پُرخلوص جذبات کی تصویر سامنے آجاتی ہے اور دوسری طرف یہ حقیقت بڑی شدت سے محسوس ہونے لگتی ہے کہ آپ اس بچے کی تربیت کے معاملہ میں اصل انحصار اللہ تعالیٰ ہی پر رکھتے تھے اور بھروسہ دعاؤں پر تھا نہ کہ ظاہری تدابیر پر۔

اس آمین کے چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں :۔

حمد و ثنا اُسی کو جو ذاتِ جاودانی ❀ ہمسر نہیں ہے اس کا کوئی نہ کوئی ثانی
باقی وہی ہمیشہ۔ غیر اُسکے سب ہیں فانی ❀ غیروں سے دل لگانا جھوٹی ہے سب کہانی
سب غیر ہیں وہی ہے اک دل کا یارِ جانی
دل میں مرے یہی ہے سُبْحَانَ مَنْ یَّرَانِی

یارب ہے تیرا احساں میں تیرے در پہ قرباں ❀ تُو نے دیا ہے ایماں تُو ہر زماں نگہباں
تیرا کرم ہے ہر آں تو ہے رحیم و رحمٰں
یہ روز کر مبارک سُبْحَانَ مَنْ یَّرَانِی

کیونکر ہو شکر تیرا۔ تیرا ہے جو ہے میرا ❀ تو نے ہر اک کرم سے گھر بھر دیا ہے میرا
جب تیرا نُور آیا جاتا رہا اندھیرا
یہ روز کر مبارک سُبْحَانَ مَنْ یَّرَانِی

تُونے یہ دن دکھایا محمود پڑھکے آیا ❀ دِل دیکھ کر یہ احساں تیری ثنائیں گایا
صد شکر ہے خدایا صد شکر ہے خدایا
یہ روز کر مبارک سُبْحَانَ مَنْ یَّرَانِیْ

ہے آج ختمِ قرآں نکلے ہیں دِل کے ارماں ❀ تُونے دکھایا یہ دِن میں تیرے منہ کے قرباں
اے میرے ربِّ مُحسن کیونکر ہو شکر احساں
یہ روز کر مبارک سُبْحَانَ مَنْ یَّرَانِیْ

تیرا یہ سب کرم ہے تو رحمتِ اتم ہے ❀ کیونکر ہو حمد تیری کب طاقتِ قلم ہے
تیرا ہوں مَیں ہمیشہ جب تک کہ دم میں دم ہے
یہ روز کر مبارک سُبْحَانَ مَنْ یَّرَانِیْ

اے قادر و توانا! آفات سے بچانا ❀ ہم تیرے در پہ آئے ہم نے ہے تجھکو مانا
غیروں سے دل غنی ہے جب سے ہے تجھکو جانا
یہ روز کر مبارک سُبْحَانَ مَنْ یَّرَانِیْ

احقر کو میرے پیارے اک دم نہ دُور کرنا ❀ بہتر ہے زندگی سے تیرے حضور مرنا
واللہ خوشی سے بہتر غم سے ترے گذرنا
یہ روز کر مُبارک سُبْحَانَ مَنْ یَّرَانِیْ

سب کام تُو بنائے لڑکے بھی تجھ سے پائے ❀ سب کچھ تری عطا ہے گھر سے تو کچھ نہ لائے
تُونے ہی میرے جانی خوشیوں کے دن دِکھائے
یہ روز کر مبارک سُبْحَانَ مَنْ یَّرَانِیْ

یہ تین جو پسر ہیں تجھ سے ہی یہ ثمر ہیں ❀ یہ میرے بار و بر ہیں تیرے غلام در ہیں
تو سچے وعدوں والا منکر کہاں کدھر ہیں
یہ روز کر مُبارک سُبْحَانَ مَنْ یَّرَانِیْ

کر اِنکو نیک قسمت دے اِنکو دین ودولت ❀ کر ان کی خود حفاظت ہو ان پہ تیری رحمت
دے رُشد اور ہدایت اور عمر اور عزت
یہ روز کر مُبارک سُبْحَانَ مَنْ یَّرَانِیْ

اے واحد و یگانہ اے خالقِ زمانہ ❀ میری دعائیں سن لے اور عرض چاکرانہ
تیرے سپرد تینوں دیں کے قمر بنانا
یہ روز کر مبارک سُبْحَانَ مَنْ یَّرَانِیْ

اقبال کو بڑھانا اب فضل لے کے آنا ❀ ہر رنج سے بچانا دکھ درد سے چھڑانا
خود میرے کام کرنا یارب نہ آزمانا!
یہ روز کر مبارک سُبْحَانَ مَنْ یَّرَانِیْ

یہ تینوں تیرے چاکر ہوویں جہاں کے رہبر ❀ یہ ہادیٔ جہاں ہوں۔ یہ ہوویں نُور یکسر
یہ مرجعِ شہاں ہوں یہ ہوویں مہرِ انور
یہ روز کر مبارک سُبْحَانَ مَنْ یَّرَانِیْ

اہلِ وقار ہوویں فخرِ دیار ہوویں ❀ حق پر نثار ہوویں مولیٰ کے یار ہوویں
بابرگ و بار ہوویں اک سے ہزار ہوویں
یہ روز کر مبارک سُبْحَانَ مَنْ یَّرَانِیْ

تُو ہے جو پالتا ہے ہر دم سنبھالتا ہے ❀ غم سے نکالتا ہے دردوں کو ٹالتا ہے
کرتا ہے پاک دل کو حق دل میں ڈالتا ہے
یہ روز کر مبارک سُبْحَانَ مَنْ یَّرَانِیْ

تُو نے سکھایا فرقاں۔ جو ہے مدارِ ایماں ❀ جس سے ملے ہے عرفاں اور دُور ہووے شیطاں
یہ سب ہے تیرا احساں۔ تجھ پر نثار ہو جاں
یہ روز کر مبارک سُبْحَانَ مَنْ یَّرَانِیْ

دُنیا بھی اک سَرا ہے بچھڑے گا جو ملا ہے ❀ گر سَو برس رہا ہے آخر کو پھر جُدا ہے
شکوہ کی کچھ نہیں جا یہ گھر ہی بے بقا ہے
یہ روز کر مبارک سُبْحَانَ مَنْ یَّرَانِیْ

اے دوستو پیارو! عقبیٰ کو مت بسارو ❀ کچھ زادِ راہ لے لو کچھ کام میں گذارو
دنیا ہے جائے فانی دل سے اسے اتارو
یہ روز کر مبارک سُبْحَانَ مَنْ یَّرَانِیْ

اے میرے بندہ پرور۔ کر انکو نیک اختر ❀ رُتبہ میں ہوں یہ برتر۔ اور بخش تاج و افسر
تُو ہے ہمارا رہبر، تیرا نہیں ہے ہمسر
یہ روز کر مبارک سُبْحَانَ مَنْ یَّرَانِیْ

شیطاں سے دُور رکھیو اپنے حضور رکھیو ❀ جاں پُر ز نُور رکھیو دِل پُر سُرور رکھیو
ان پر مَیں تیرے قرباں! رحمت ضرور رکھیو
یہ روز کر مبارک سُبْحَانَ مَنْ یَّرَانِیْ

میری دُعائیں ساری کریو قبول باری ❀ میں جاؤں تیرے واری۔ کر تُو مدد ہماری
ہم تیرے در پہ آئے لیکر اُمید بھاری
یہ روز کر مبارک سُبْحَانَ مَنْ یَّرَانِیْ

لختِ جگر ہے میرا **محمود** بندہ تیرا ❀ دے اس کو عمر و دولت کر دُور ہر اندھیرا
دِن ہوں مُرادوں والے پُر نُور ہو سویرا
یہ روز کر مبارک سُبْحَانَ مَنْ یَّرَانِیْ

یہ تینوں تیرے بندے رکھیو نہ انکو گندے ❀ کر ان سے دُور یارب دُنیا کے سارے پھندے
چنگے رہیں ہمیشہ کریو نہ ان کو مندے
یہ روز کر مبارک سُبْحَانَ مَنْ یَّرَانِیْ

اے میرے دل کے پیارے، اے مہرباں ہمارے ❀ کر انکے نام روشن جیسے کہ ہیں ستارے
یہ فضل کر کہ ہو ویں نیکو گہر یہ سارے
یہ روز کر مبارک سُبْحَانَ مَنْ یَّرَانِیْ

اے میری جاں کے جانی اے شاہِ دوجہانی ❀ کر ایسی مہربانی ان کا نہ ہو وے ثانی
دے بخت جاودانی اور فیضِ آسمانی
یہ روز کر مبارک سُبْحَانَ مَنْ یَّرَانِیْ

سُن میرے پیارے باری میری دعائیں ساری ❀ رحمت سے ان کو رکھنا میں تیرے منہ کے واری
اپنی پناہ میں رکھیو سُن کر یہ میری زاری
یہ روز کر مبارک سُبْحَانَ مَنْ یَّرَانِیْ

قرآں کو یاد رکھنا' پاک اعتقاد رکھنا ❀ فکرِ معاد رکھنا۔ پاس اپنے زاد رکھنا

اکسیر ہے پیارے صدق و سداد رکھنا

یہ روز کر مبارک سُبْحَانَ مَنْ یَّرَانِیْ

ناظرہ قرآن پڑھنے کے بعد آپ کو باقاعدہ اسکول میں داخل ہو کر مروجہ دنیوی تعلیم پانے کا موقع ملا اور گھر پر بھی بعض اساتذہ سے اردو اور انگریزی کی امدادی تعلیم حاصل کی چنانچہ حضرت پیر منظور محمد صاحب رضی اللہ عنہ کچھ عرصہ آپ کو اُردو پڑھاتے رہے اور بعد ازاں کچھ عرصہ حضرت مولوی شیر علی صاحب رضی اللہ عنہ نے آپ کو انگریزی پڑھائی لیکن یہ سب تعلیم کس ماحول میں اور کس اہتمام کے ساتھ ہوئی۔ یہ ایک دلچسپ داستان ہے جو خود حضرت صاحبزادہ مرزا محمود احمد صاحب ہی کے الفاظ میں سننے سے تعلق رکھتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:-

"میری تعلیم کے سلسلہ میں مجھ پر سب سے زیادہ احسان حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کا ہے۔ آپ چونکہ طبیب بھی تھے اور اس بات کو جانتے تھے کہ میری صحت اس قابل نہیں کہ میں کتاب کی طرف زیادہ دیر تک دیکھ سکوں اس لئے آپ کا طریق تھا کہ آپ مجھے اپنے پاس بٹھا لیتے اور فرماتے میاں میں پڑھتا جاتا ہوں تم سنتے جاؤ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بچپن میں میری آنکھوں میں سخت ککرے پڑ گئے تھے اور متواتر تین چار سال تک میری آنکھیں دُکھتی رہیں اور ایسی شدید تکلیف ککروں کی وجہ سے پیدا ہو گئی کہ ڈاکٹروں نے کہا کہ اس کی بینائی ضائع ہو جائے گی۔ اس پر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے میری صحت کے لئے خاص طور پر دعائیں کرنی شروع کر دیں اور ساتھ ہی آپ نے روزے رکھنے شروع کر دیئے مجھے اس وقت یاد نہیں کہ آپ نے کتنے روزے رکھے۔ بہرحال تین یا سات روزے آپ نے رکھے۔ جب آخری روزے کی آپ افطاری کرنے لگے اور روزہ کھولنے کے لئے منہ میں کوئی چیز ڈالی تو یکدم میں نے آنکھیں کھول دیں اور میں نے آواز دی کہ مجھے نظر آنے لگ گیا ہے لیکن اس بیماری کی شدت اور اس کے متواتر حملوں کا

نتیجہ یہ ہُوا کہ میری ایک آنکھ کی بینائی ماری گئی۔ چنانچہ میری بائیں آنکھ میں بینائی نہیں ہے میں رستہ تو دیکھ سکتا ہوں مگر کتاب نہیں پڑھ سکتا۔ دو چار فٹ پر اگر کوئی ایسا آدمی بیٹھا ہو جو میرا پہچانا ہوا ہو تو میں اس کو دیکھ کر پہچان سکتا ہوں۔ لیکن اگر کوئی بے پہچانا بیٹھا ہو۔ تو مجھے اس کی شکل نظر نہیں آ سکتی۔ صرف دائیں آنکھ کام کرتی ہے مگر اس میں بھی ککرے پڑ گئے اور وہ ایسے شدید ہو گئے کہ کئی کئی راتیں میں جاگ کر کاٹا کرتا تھا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے میرے اُستادوں سے کہہ دیا تھا کہ پڑھائی اسکی مرضی پر ہوگی۔ یہ جتنا پڑھنا چاہے پڑھے اور اگر نہ پڑھے تو اس پر زور نہ دیا جائے کیونکہ اسکی صحت اس قابل نہیں کہ یہ پڑھائی کا بوجھ برداشت کر سکے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بارہا مجھے صرف یہی فرماتے کہ تم قرآن کا ترجمہ اور بخاری حضرت مولوی صاحب سے پڑھ لو۔ اس کے علاوہ آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ کچھ طب بھی پڑھ لو کیونکہ یہ ہمارا خاندانی فن ہے۔ ماسٹر فقیر اللہ صاحب جن کو خدا تعالیٰ نے اِسی سال ہمارے ساتھ ملنے کی توفیق عطا فرمائی ہے وہ ہمارے حساب کے اُستاد تھے اور لڑکوں کو سمجھانے کے لئے بورڈ پر سوالات حل کیا کرتے تھے لیکن مجھے اپنی نظر کی کمزوری کی وجہ سے وہ دکھائی نہیں دیتے تھے۔ کیونکہ جتنی دُور بورڈ تھا۔ اتنی دُور تک میری بینائی کام نہیں دے سکتی تھی اور پھر زیادہ دیر تک میں بورڈ کی طرف یوں بھی نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ نظر تھک جاتی۔ اس وجہ سے مَیں کلاس میں بیٹھنا فضول سمجھا کرتا تھا۔ کبھی جی چاہتا تو چلا جاتا اور کبھی نہ جاتا۔ ماسٹر فقیر اللہ صاحب نے ایک دفعہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس میرے متعلق شکایت کی کہ حضور یہ کچھ نہیں پڑھتا۔ کبھی مدرسہ میں آ جاتا ہے اور کبھی نہیں آتا۔ مجھے یاد ہے جب ماسٹر صاحب نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس یہ شکایت کی تو میں ڈر کے مارے چھپ گیا کہ معلوم نہیں حضرت مسیح موعودؑ کس قدر ناراض ہوں۔ لیکن حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

نے جب یہ بات سُنی تو آپؑ نے فرمایا۔ آپ کی بڑی مہربانی ہے جو آپ بچے کا خیال رکھتے ہیں اور مجھے آپ کی بات سُن کر بڑی خوشی ہوئی کہ یہ کبھی کبھی مدرسے چلا جاتا ہے ورنہ میرے نزدیک تو اس کی صحت اس قابل نہیں کہ پڑھائی کر سکے۔ پھر ہنس کر فرمانے لگے اس سے ہم نے آٹے دال کی دکان تھوڑی کھلوانی ہے کہ اسے حساب سکھایا جائے۔ حساب اسے آئے یا نہ آئے کوئی بات نہیں۔ آخر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم یا آپ کے صحابہ نے کونسا حساب سیکھا تھا۔ اگر یہ مدرسہ میں چلا جائے تو اچھی بات ہے ورنہ اسے مجبور نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ سُن کر ماسٹر صاحب واپس آگئے۔ میں نے اس نرمی سے اور بھی فائدہ اٹھانا شروع کر دیا اور پھر مدرسے میں جانا ہی چھوڑ دیا۔ کبھی مہینہ میں ایک آدھ دفعہ چلا جاتا تو اَور بات تھی۔ غرض اس رنگ میں میری تعلیم ہوئی اور میں درحقیقت مجبور بھی تھا۔ کیونکہ بچپن میں علاوہ آنکھوں کی تکلیف کے مجھے جگر کی خرابی کا بھی مرض تھا۔ چھ چھ مہینے مونگ کی دال کا پانی یا ساگ کا پانی مجھے دیا جاتا رہا۔ پھر اس کے ساتھ تلی بھی بڑھ گئی۔ ریڈ آئیوڈائڈ آف مرکری (Red Iodide of Mercury) کی تلی کے مقام پر مالش کی جاتی تھی۔ اسی طرح گلے پر بھی اس کی مالش کی جاتی تھی۔ کیونکہ مجھے خنازیر کی بھی شکایت تھی۔ غرض آنکھوں میں ککرے۔ جگر کی خرابی، عظمِ طحال کی شکایت اور پھر اس کے ساتھ بخار کا شروع ہو جانا جو چھ چھ مہینے تک نہ اُترتا اور میری پڑھائی کے متعلق بزرگوں کا فیصلہ کر دینا کہ یہ جتنا پڑھنا چاہے، پڑھ لے۔ اس پر زیادہ زور نہ دیا جائے۔ ان حالات سے ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ میری تعلیمی قابلیت کا کیا حال ہو گا۔

ایک دفعہ ہمارے نانا جان حضرت میر ناصر نواب رضی اللہ عنہ نے میرا اُردو کا امتحان لیا۔ میں اب بھی بہت بدخط ہوں مگر اس زمانہ میں تو میرا اتنا بدخط تھا کہ پڑھا ہی نہیں جاتا تھا کہ میں نے کیا لکھا۔ انہوں نے بڑی کوشش کی کہ پتہ لگائیں میں نے کیا لکھا ہے مگر انہیں کچھ پتہ نہ چلا۔

میرے بچوں میں سے اکثر کے خط مجھ سے اچھے ہیں۔ میرے خط کا نمونہ صرف میری لڑکی امۃ الرشید کی تحریر میں پایا جاتا ہے۔ اس کا لکھا ہُوا ایسا ہوتا ہے کہ ہم نے امۃ الرشید کے لکھے ہوئے پر ایک روپیہ انعام مقرر کر دیا تھا کہ اگر خود امۃ الرشید بھی پڑھ کر بتا دے کہ اس نے کیا لکھا ہے تو ایک روپیہ انعام دیا جائے گا۔ یہی حالت اس وقت میری تھی کہ مجھ سے بعض دفعہ اپنا لکھا ہُوا بھی پڑھا نہیں جاتا تھا۔ جب میر صاحب نے پرچہ دیکھا تو وہ جوش میں آ گئے اور کہنے لگے یہ تو ایسا ہے جیسے لُنڈے لکھے ہوں۔ اُن کی طبیعت بڑی تیز تھی۔ غصہ میں فوراً حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس پہنچے۔ میں بھی اتفاقاً اس وقت گھر میں ہی تھا۔ ہم تو پہلے ہی ان کی طبیعت سے ڈرا کرتے تھے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس شکایت لے کر پہنچے تو اور بھی ڈر پیدا ہُوا کہ اب نا معلوم کیا ہو۔ خیر میر صاحب آ گئے اور حضرت صاحب سے کہنے لگے کہ محمود کی تعلیم کی طرف آپ کو ذرا بھی توجہ نہیں ہے۔ میں نے اس کا اُردو کا امتحان لیا تھا۔ آپ ذرا پرچہ تو دیکھیں اس کا اتنا بُرا خط ہے کہ کوئی بھی یہ خط نہیں پڑھ سکتا۔ پھر اسی جوش کی حالت میں وہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کہنے لگے آپ بالکل پرواہ نہیں کرتے اور لڑکے کی عمر برباد ہو رہی ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب میر صاحب کو اس طرح جوش کی حالت میں دیکھا تو فرمایا "بلاؤ حضرت مولوی صاحب کو" جب آپ کو کوئی مشکل پیش آتی تو ہمیشہ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کو بلا لیا کرتے تھے۔ حضرت خلیفہ اول کو مجھ سے بڑی محبت تھی۔ آپ تشریف لائے اور حسبِ معمول سر نیچا ڈال کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا "مولوی صاحب! میں نے آپ کو اس غرض کے لئے بُلایا ہے کہ میر صاحب کہتے ہیں کہ محمود کا لکھا ہُوا پڑھا نہیں جاتا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اس کا امتحان لے لیا جائے" یہ کہتے ہوئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قلم اُٹھائی

اور دو تین سطریں ایک عبارت لکھ کر مجھے دی اور فرمایا اِس کو نقل کرو۔ بس یہ امتحان تھا جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے لیا۔ میں نے بڑی احتیاط سے اور سوچ سمجھ کر اس کو نقل کر دیا۔ اوّل تو وہ عبارت کوئی زیادہ لمبی نہیں تھی۔ دوسرے میں نے صرف نقل کرنا تھا۔ اور نقل کرنے میں تو اور بھی آسانی ہوتی ہے۔ کیونکہ اصل چیز سامنے ہوتی ہے اور پھر میں نے آہستہ آہستہ نقل کیا۔ الف اور باء وغیرہ احتیاط سے ڈالے۔ جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کو دیکھا تو فرمانے لگے۔ مجھے تو میر صاحب کی بات سے بڑا فکر پیدا ہو گیا تھا مگر اس کا خط تو میرے خط کے ساتھ ملتا جلتا ہے۔ حضرت خلیفہ اوّلؓ پہلے ہی میری تائید میں اُدھار کھائے بیٹھے تھے۔ فرمانے لگے حضور! میر صاحب کو تو یونہی جوش آگیا ورنہ اس کا خط تو بڑا اچھا ہے۔

حضرت خلیفہ اوّلؓ ہمیشہ مجھے فرمایا کرتے تھے کہ میاں تمہاری صحت ایسی نہیں کہ تم خود پڑھ سکو۔ میرے پاس آجایا کرو۔ میں پڑھتا جاؤں گا اور تم سنتے رہا کرو۔ چنانچہ انہوں نے زور دے دے کر پہلے قرآن پڑھایا اور پھر بخاری پڑھا دی۔ یہ نہیں کہ آپ نے آہستہ آہستہ مجھے قرآن پڑھایا ہو بلکہ آپ کا طریق یہ تھا کہ آپ قرآن پڑھتے جاتے اور ساتھ ساتھ اس کا ترجمہ کرتے جاتے۔ کوئی بات ضروری سمجھتے تو بتا دیتے۔ ورنہ جلدی جلدی پڑھاتے چلے جاتے۔ آپ نے تین مہینہ میں مجھے سارا قرآن پڑھا دیا تھا۔ اس کے بعد پھر کچھ ناغے ہونے لگ گئے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات کے بعد آپ نے پھر مجھے کہا کہ میاں مجھ سے بخاری تو پوری پڑھ لو۔ دراصل میں نے آپ کو بتا دیا تھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام مجھے فرمایا کرتے تھے کہ مولوی صاحب سے قرآن اور بخاری پڑھ لو۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی میں ہی میں نے آپ سے قرآن اور بخاری پڑھنی شروع کر دی تھی گو ناغے ہوتے رہے۔ اسی طرح طب بھی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

کی ہدایت کے ماتحت میں نے آپ سے شروع کر دی تھی۔طب کا سبق میں نے اور میر محمد اسحاق صاحبؓ نے ایک دن ہی شروع کیا تھا بلکہ میر صاحب کا ایک لطیفہ ہے جو ہمارے گھر میں خوب مشہور ہوا کہ دوسرے ہی دن میر محمد اسحٰق صاحبؓ اپنی والدہ سے کہنے لگے اماں جان! مجھے صبح جلدی جگا دیں کیونکہ مولوی صاحب دیر سے مطب میں آتے ہیں۔میں پہلے مطب میں چلا جاؤں گا تا کہ مریضوں کو نسخے لکھ لکھ کر دُوں۔حالانکہ ابھی ایک ہی دن اُن کو طب شروع کئے ہوا تھا۔

غرض میں نے آپ سے طب بھی پڑھی اور قرآن کریم کی تفسیر بھی۔ قرآن کریم کی تفسیر آپ نے دو مہینے میں ختم کرا دی۔آپ مجھے اپنے پاس بٹھا لیتے اور کبھی نصف پارہ اور کبھی پورا پارہ ترجمہ سے پڑھ کر سُنا دیتے کسی کسی آیت کی تفسیر بھی کر دیتے۔اسی طرح بخاری آپ نے دو تین مہینے میں مجھے ختم کرا دی۔ایک دفعہ رمضان کے مہینے میں آپ نے سارے قرآن کا درس دیا تو اس میں بھی مَیں شریک ہو گیا۔چند عربی کے رسالے بھی مجھے آپ سے پڑھنے کا اتفاق ہوا۔غرض یہ میری علمیت تھی۔مگر انہی دنوں جب میں یہ کورس ختم کر رہا تھا مجھے اللہ تعالیٰ نے ایک رویاء دکھایا۔"[1]

ایک اور موقع پر آپ اپنے بزرگ استاد حضرت الحاج حکیم مولوی نور الدین رضؓ کے طریقِ تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"مجھے سب سے بڑی تعلیم جو حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ نے دی وہ یہی تھی کہ جب میں پڑھتے ہوئے کوئی سوال کرتا تو آپ فرماتے میاں آگے چلو۔اس سوال کے متعلق گھر جا کر خود سوچنا۔"[2]

حضرت حکیم مولانا نور الدین صاحب رضی اللہ عنہٗ جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وصال کے بعد سلسلہ احمدیہ کے پہلے خلیفہ چُنے گئے تھے، اپنے علم و فضل کی وجہ سے تمام ہندوستان

---

[1] الموعود تقریر حضرت مصلح موعود بر موقع جلسہ سالانہ ۱۹۴۴ء صفحہ ۸۳ تا ۸۴

میں ایک معروف مقام رکھتے تھے۔آپ کا حضرت صاحبزادہ صاحب کو پڑھاتے وقت یہ خاص سلوک تھا کہ جہاں دوسروں کے سوالات کا جواب تفصیل سے دیا کرتے وہاں حضرت صاحبزادہ صاحب کو سوال کرنے سے ٹوکتے۔اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ آپ کے نزدیک یہ طالب علم غیر معمولی ذہانت کا مالک تھا اور اگر خود مسائل پر غور کرتا تو درست نتائج تک پہنچ سکتا تھا۔

دوسری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ قرآن کے علم کو کوشش کی بجائے اللہ تعالیٰ کے فضل پر زیادہ مبنی سمجھتے تھے اور یقین رکھتے تھے کہ یہ بچہ اللہ تعالیٰ کے خاص سلوک کے نتیجہ میں اور اسی کی رہنمائی میں قرآن کریم کا علم سیکھے گا۔

ابتداء میں تو حضرت صاحبزادہ صاحب کے دل میں یہ احساس رہا کہ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّلؓ دوسرے طلباء کی نسبت آپؓ پر زیادہ سختی فرماتے ہیں۔لیکن رفتہ رفتہ یہ حقیقت کھل گئی کہ اس استثنائی سلوک کا مقصد کیا تھا۔چنانچہ اس بارہ میں آپ خود ہی اس قسم کے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

> "ایک شاندار نکتہ میں نے اپنی ذات میں بھی دیکھا ہے۔میں جب حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ سے قرآن شریف اور بخاری پڑھا کرتا تھا تو آپ نے آدھ آدھ سپارہ روز پڑھا کر دو ماہ میں سب ختم کرا دیا۔میں جب کچھ پوچھنا چاہتا تو فرماتے۔میاں! گھر جا کر سوچ لینا۔دوسرے پڑھنے والوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے اگر میں کوئی سوال کرتا تو فرماتے۔میاں! اُٹھو اِدھر آ کر بیٹھو۔
>
> غرض اس طرح پڑھانے کے بعد فرمایا جو علم نُور دین کو آتا تھا، پڑھا دیا۔اس کے اندر ایک نکتہ تھا اور وہ یہ کہ ایک مسلمان کے لئے صرف اتنا ضروری ہے کہ وہ ترجمہ پڑھ لے اور اس کو اچھی طرح سمجھ لے۔باقی جو علوم ہیں وہ تو خدا کے سکھانے سے آتے ہیں۔اُن کے متعلق اسے اپنے طور پر کوشش کرنی چاہیئے اور خدا تعالیٰ سے حاصل کرنے چاہئیں۔میں اگر حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کی بتائی ہوئی باتوں کو لکھ رکھتا تو آج ان اعتراضوں کے جواب کہاں سے لاتا جو اسلام پر ہو رہے ہیں۔کیا انہوں نے ہمیشہ زندہ رہنا تھا۔نہیں! اسی لئے انہوں نے وہ گُر مجھے بتا دیا جو اُن

سے کے بعد بھی میرے کام آنے والا تھا۔"[۱]

ایک اور موقع پر فرماتے ہیں :۔

"اللہ تعالیٰ نے اب مجھے بہت علم بخشا ہے ... لیکن اس کتاب (قرآن) کی چاٹ انہوں نے ہی لگائی اور اس کی تفسیر کے متعلق صحیح راستہ پر ڈالا اور وہ بنیاد ڈالی جس پر عمارت تعمیر کر سکا۔ اس لئے دِل ہمیشہ ان کے لئے دعا گو رہتا ہے۔"[۲]

دینی تعلیم کے متعلق آپ کا رجحان اور ذاتی دلچسپی دنیوی تعلیم کی طرف رجحان اور دلچسپی سے بالکل مختلف اور ممتاز نظر آتے ہیں۔ کہاں یہ بے رُخی کہ حساب کی کلاس میں عدم دلچسپی اور صحت کی کمزوری کے باعث یکسر جانا ہی ترک کر دیا اور دیگر مضامین کی طرف بھی کوئی خاص توجہ نہ کی اور سکول میں آئے دن ناغے ہوتے رہے۔ اور کُجا دینی تعلیم کے لئے ایسا ذوق و شوق کہ بسا اوقات سارا سارا دن اس انتظار میں بیٹھے گذار دیتے تھے کہ کب حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کو فرصت ملے اور آپ سے سبق لے لیں اور دینی تعلیم کے اس ذوق و شوق کی راہ میں جسمانی بیماریوں کے حائل ہونے کا تو کیا سوال جو غیر معمولی مشقت اس راہ میں اُٹھانی پڑی، اُس کے نتیجہ میں بعض عوارض اور بھی آپ کو لاحق ہو گئے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں :۔

"میں نے حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضؓ سے جس طرح پڑھا ہے اور کوئی شخص نہیں پڑھ سکتا آدھ آدھ پارہ بخاری کا آپ پڑھتے تھے اور کہیں کہیں خود بخود ہی کچھ بتا دیتے تھے اور بعض وقت سبق کے انتظار میں سارا سارا دِن گزارنا پڑتا تھا اور کھانا بھی بے وقت کھایا جاتا تھا۔ اسی وقت میرا معدہ خراب ہوا ہے۔ ایک دفعہ میرے سر میں درد تھا اور میں پڑھ کر آیا تھا۔ والدہ نے پوچھا کیا پڑھتے ہو؟ میں نے کہا کہ میں تو پڑھتا نہیں۔ مولوی صاحب ہی پڑھتے ہیں۔ آپ نے جا کر مولوی صاحب سے کہا۔ آپ کیا پڑھاتے ہیں؟ محمود یوں کہتا ہے۔ حضرت مولوی صاحب نے مجھے فرمایا۔ میاں! تم ہمیں کہتے! بیوی صاحبہ کو کہنے کی کیا ضرورت تھی۔"[۳]

---

[۱] الفضل ۳ر نومبر ۱۹۵۴ء   [۲] تفسیر کبیر جلد سوم صفحہ ۸۳۴
[۳] الفضل ۳ر جولائی ۱۹۲۲ء

اسی تعلق میں ایک اور روایت بھی قابلِ توجہ ہے جس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس حد تک آپ کے دِل میں دینی علم کے حصول کے لئے ایک فطری لگن پائی جاتی تھی۔ آپ فرماتے ہیں :۔

"ایک دفعہ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی زندگی میں مجھ سے ناراض ہو گئے۔ وجہ یہ کہ آپ نے ایک مضمون لکھوایا تھا اور اس پر ایک انعام مقرر کیا تھا جو بعض کے نزدیک اس قابل نہ تھا۔ میری رائے بھی یہی تھی۔ ایک شخص نے سختی سے نکتہ چینی کی اور وہ کسی نے میری طرف منسوب کر کے آپ کو پہنچا دی۔ مولوی صاحب مجھ سے ناراض ہو گئے۔ میں اُن دنوں بخاری پڑھتا تھا۔ میں فوراً بخاری لے کر آپ کے پاس پڑھنے کے لئے چلا گیا۔ حالانکہ مجھے ان دنوں بخار ہوتا تھا، اور کئی ماہ سے سبق چھوڑا ہوا تھا لیکن میں نے یہ خیال کیا کہ اگر آج نہ گیا تو ضرور دل میں ایک حجاب پیدا ہو جائے گا اور علم سے محروم رہ جاؤں گا۔"[1]

اِس روایت کو پڑھ کر آپ کی بصیرت کے ایک اَور پہلو کی طرف بھی ذہن متوجہ ہوتا ہے۔ یعنی اس باریک نفسیاتی نکتہ تک رسائی کہ استاد اور طالب علم کے درمیان مذکورہ صورتِ حال میں ایک ایسا حجاب بھی پیدا ہو سکتا ہے جو علم کی راہ میں روک بن جائے، یہ ہر بچے کے بس کی بات نہیں بلکہ یہ طرزِ فکر آپ کی غیر معمولی ذہانت اور بصیرت پر گواہ ہے۔

سبقاً سبقاً قرآن کریم اور صحیح بخاری پڑھنے کے علاوہ بھی آپ کو وسیع پیمانے پر دینی تعلیم محض حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قرب کی وجہ سے صبح و مسا مِل رہی تھی لیکن یہ زبانی اور عمومی رنگ کی تعلیم تھی۔ یہ وہ گھر تھا جہاں دن رات تذکرہ ہی خدا اور رسول ؐ کا رہتا تھا۔ جُوں جُوں آپ کی عمر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مبارک سایہ تلے بڑھتی گئی۔ دینی اغراض سے آنے والے دوستوں کی تعداد بھی بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ قادیان ایک مرجع خاص و عام بن گیا۔ اِن آنے والوں میں دوست بھی تھے اور دشمن بھی لیکن ذکر دونوں کی زبان پر امورِ دینیہ ہی کا چلتا تھا۔

پس اُس زمانے میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے قُرب میں کسی بچے کا پلنا ہی ایک بڑی بھاری دینی تربیت گاہ میں داخل ہونے کے مترادف تھا۔ اس دَور کا ذکر کرتے ہوئے خود حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :۔

---

[1] الفضل ۱۳ رستمبر ۱۹۲۰ء

"ہمارے کانوں میں ابھی تک وہ آوازیں گونج رہی ہیں جو ہم نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے براہِ راست سنیں۔ میں چھوٹا تھا مگر میرا مشغلہ یہی تھا کہ میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی مجلس میں بیٹھا رہتا اور آپ کی باتیں سنتا۔"[1]

اس قسم کی پُرمعارف مجالس سے آپ نے کیا استفادہ کیا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے آپؓ فرماتے ہیں:

"ہم نے (ان مجالس میں) اس قدر مسائل سُنے ہیں کہ جب آپ کی کتابوں کو پڑھا جاتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام باتیں ہم نے پہلے سُنی ہوئی ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی عادت تھی کہ آپ دن کو جو کچھ لکھتے، دن اور شام کی مجلس میں آکر بیان کر دیتے تھے اس لئے آپ کی تمام باتیں ہم کو حفظ ہیں اور ہم ان مطالب کو خوب سمجھتے ہیں جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی منشأ اور آپؑ کی تعلیم کے مطابق ہیں۔"[2]

آخر میں ہم آپ کے بارہ میں آپ کے بچپن کے دو بزرگ اساتذہ کے تاثرات بیان کرکے اس باب کو ختم کرتے ہیں۔ سیرت کے مطالعہ کا یہ بھی ایک پہلو ہے کہ استاد کی آنکھ سے شاگرد کو دیکھا جائے۔ حضرت مولوی شیر علی صاحب رضی اللہ عنہ جو آپ کے انگریزی کے استاد تھے اور علاوہ مدرسہ کے آپ کو گھر پر بھی پڑھاتے تھے، اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"۱۸۹۹ء میں مدرسہ تعلیم الاسلام کا چارج لینے کے بعد جلد ہی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد کے ماتحت حضرت امیرالمومنین ایدہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت جب کہ آپ کی عمر ۱۰ سال کی تھی بندہ کے پاس انگریزی پڑھنی شروع کی پہلے میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ایک مکان میں جو دارالمسیح الموعود کے متصل اس جگہ واقع تھا جہاں آجکل نواب صاحب کا مکان ہے رہتا تھا۔ جب تک میں اس مکان میں رہا حضرت خلیفۃ المسیح ایدہ اللہ تعالیٰ اس مکان میں پڑھنے کے لئے تشریف لاتے رہے اس کے بعد میں خود حضور کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ اور یہ خدمت بندہ حضرت

---

[1] الفضل ۳؍ دسمبر ۱۹۳۸ء
[2] الفضل ۳؍ دسمبر ۱۹۳۸ء

مسیح موعود علیہ السلام کی زندگی کے آخری دس سال میں برابر ادا کرتا رہا۔ اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی وفات کے بعد بھی یہ سلسلہ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کے شش سالہ دَورِ خلافت میں جاری رہا ... گویا حضور کا سارا بڑھنا اور پھولنا اور بابرگ و بار ہونا میری آنکھوں کے سامنے ہوا۔ آپ ایک نازک پتیوں والے چھوٹے پودے کی طرح تھے جب کہ میں نے پہلی دفعہ حضور کو دیکھا اور یہ پودا میرے دیکھتے دیکھتے جلد جلد بڑھا اور پھول پھل لایا اور وہ حیرت انگیز ترقی کی جس کو دیکھ کر آنکھیں چُندھیا جاتیں اور عقل دنگ ہو جاتی ہے اگر کوئی قابل انشاپرداز ہوتا تو وہ شاید اس حیرت انگیز ترقی کا نقشہ کھینچنے کی کچھ کوشش کرتا لیکن مَیں تو اس سے زیادہ نہیں کر سکتا کہ اس بات کی شہادت دوں کہ جو کچھ خدا تعالیٰ کے پاک کلام میں آپ کی نسبت پہلے سے خبر دی گئی تھی اس کو میں نے اپنی آنکھوں سے لفظ بلفظ پورا ہوتے دیکھ لیا۔ مجھے اپنی زبان کی کمزوری اور قلم کی ناتوانی پر افسوس آتا ہے جو صحیح نقشہ ناظرین کے سامنے پیش کرنے سے عاجز ہوں لیکن میں اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کچھ بیان کرنے کی کوشش کروں گا **وھو الموفق**۔

میں نے بچپن سے ہی حضور میں سوائے اوصافِ حمیدہ اور خصائلِ محمودہ کے کچھ نہیں دیکھا۔ ابتداء میں ہی آپ میں نیکی کے انوار اور تقویٰ کے آثار پائے جاتے تھے جو آپ کی عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ اور زیادہ نمایاں ہوتے گئے۔ ممکن ہے کہ کوئی شخص میرے اس بیان کو خوش اعتقادی پر محمول کرے اس لئے میں آپ کے بچپن کی ایک بات کا ذکر کرتا ہوں جس سے ناظرین خود حقیقت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ آپ کو بچپن میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہدایت فرمائی تھی کہ کسی کے ہاتھ سے کوئی کھانے کی چیز نہ لینا۔ یہ ایک ہدایت تھی جو حضرت اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے بچّہ کو دی۔ اب دیکھئے کہ وہ خورد سال بچہ حضرت اقدسؑ کی اس ہدایت کی کس طرح تعمیل کرتا ہے۔

میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ ابتداء میں حضور بندہ کے مکان پر پڑھنے کے لئے تشریف لاتے تھے اور وہ مکان حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام کا ہی مکان تھا جو حضور کے رہائشی مکان کے بالکل متصل بلکہ حضور کے گھر کے ساتھ ملحق تھا ہم غالباً تین سال اس مکان میں رہے اور اس تمام عرصہ میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی بندہ کے پاس پڑھنے کے لئے تشریف لاتے اور جب کبھی آپ کو پیاس لگتی تو آپ اُٹھ کر اپنے گھر تشریف لے جاتے اور اپنے گھر سے پانی پی کر پھر واپس تشریف لاتے۔ خواہ کیسا ہی مصفا پانی کیسے ہی صاف ستھرے برتن میں آپ کی خدمت میں پیش کیا جاتا آپ اسے نہ پیتے صرف اس لئے کہ حضرت اقدس علیہ السلام کی طرف سے آپ کو ہدایت تھی کہ کسی کے ہاتھ سے کوئی کھانے پینے کی چیز نہ لینا۔ اب بظاہر تو یہ ایک چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ ایک چھوٹا سا آئینہ ہے جس میں ہمیں حضور کی اس وقت کی شکل صحیح رنگ میں نظر آسکتی ہے۔

اوّل دیکھئے کہ حضور اس بچپن کے زمانہ میں بھی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام کی کیسی کامل اطاعت کرتے اور کبھی بھی اس کی خلاف ورزی نہ کرتے۔ دوسرے دیکھئے کہ وہ اس اطاعت میں کس درجہ کی احتیاط سے کام لیتے۔ بظاہر حضرت اقدسؑ نے جب فرمایا کہ کسی کے ہاتھ سے کھانے پینے کی چیز نہ لینا تو حضرت اقدسؑ کی مراد ایسی چیزوں سے تھی جو لوگ بچوں کو اپنی محبت اور پیار کے اظہار کے لئے دیتے ہیں جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ کسی کے برتن سے پانی بھی نہ پینا۔ مگر آپ کی احتیاط اس درجہ کی تھی کہ آپ اپنے گھر کے سوا قادیان میں کسی اور گھر سے کسی گھڑے یا صراحی سے پانی لے کر پینا بھی حضرت اقدسؑ کے حکم کی خلاف ورزی ہی سمجھتے تھے۔ یہی حد درجہ کی احتیاط ہے جسے دوسرے لفظوں میں تقویٰ کہتے ہیں۔ پس آپ کے اسی عمل سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ بچپن میں ہی اطاعت اور تقویٰ کی باریک راہوں پر گامزن تھے

اور یہی بیج تھا جو آپ کی عمر کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا گیا اور زیادہ واضح اور زیادہ نمایاں شکل میں کمال کے آخری مرتبہ تک پہنچ گیا۔ یہ پانی کا واقعہ ایک دفعہ نہیں بلکہ کئی دفعہ ہُوا اور حضور ہمیشہ اطاعت کے اصول پر مضبوطی سے قائم رہے۔ ممکن ہے کہ کوئی شخص خیال کرے کہ شاید حجاب کی وجہ سے آپ ہمارے گھر سے پانی پینے سے اجتناب فرماتے مگر ایسا نہیں تھا، آپ بے تکلفی سے ہمارے گھر میں رہتے اور حضور کی خوش خلقی اور خوش طبعی کی باتیں اس وقت بندہ کے گھر سے نہایت محبت کے ساتھ یاد کرتی ہیں اور جب حضور کے منصبِ خلافت پر سرفراز ہونے کے بعد بندہ کے گھر سے بیعت کے لئے حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضور نے اُس وقت کے بچپن کے واقعات ان کو یاد دِلائے کیونکہ حضور کا حافظہ بہت مضبوط ہے۔

حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی طالب علمی کا ایک اور واقعہ لکھتا ہوں اس سے بھی آپ کی قلبی کیفیت پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک دن کچھ بارش ہو رہی تھی مگر زیادہ نہ تھی بندہ وقتِ مقررہ پر حضور کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ سیڑھیوں کا دروازہ کھٹکھٹایا حضور نے دروازہ کھولا۔ بندہ اندر آکر برآمدہ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ آپ کمرہ میں تشریف لے گئے۔ میں نے سمجھا کہ کتاب لے کر باہر برآمدہ میں تشریف لائیں گے مگر جب آپ کے باہر تشریف لانے میں کچھ دیر ہوگئی تو میں نے اندر کی طرف دیکھا اور کیا دیکھتا ہوں کہ آپ فرش پر سجدہ میں پڑے ہُوئے ہیں۔ میں نے خیال کیا کہ آج بارش کی وجہ سے شاید آپ سمجھتے تھے کہ میں حاضر نہیں ہوں گا۔ اور جب میں آگیا ہوں تو آپ کے دِل میں خاکسار کے لئے دعا کی تحریک ہُوئی ہے اور آپ بندہ کے لئے دعا فرمارہے ہیں۔ آپ بہت دیر تک سجدہ میں پڑے رہے اور دعا فرماتے رہے۔"[1]

اسی طرح حضرت مفتی محمد صادق صاحبؓ بھی جو آپ کے بچپن کے اساتذہ میں سے تھے۔ اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں :۔

---

[1] الفضل ۵ نومبر ۱۹۳۸ء۔

"چونکہ عاجز نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بیعت ۱۸۹۰ء کے آخیر میں کرلی تھی اور اس وقت سے ہمیشہ آمد و رفت کا سلسلہ متواتر جاری رہا۔ میں حضرت اولوالعزم مرزا بشیر الدین محمود احمد ایدہ اللہ تعالیٰ کو ان کے بچپن سے دیکھ رہا ہوں کہ کس طرح ہمیشہ ان کی عادت حیا اور شرافت اور صداقت اور دین کی طرف متوجہ ہونے کی تھی اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے دینی کاموں میں بچپن سے ہی ان کو شوق تھا۔ نمازوں میں اکثر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ساتھ جامع مسجد میں جاتے اور خطبہ سنتے۔ ایک دفعہ مجھے یاد ہے جب آپ کی عمر دس سال کے قریب ہو گی۔ آپ مسجد اقصیٰ میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ساتھ نماز میں کھڑے تھے اور پھر سجدہ میں بہت رو رہے تھے۔ بچپن سے ہی آپ کو فطرۃً اللہ کے ساتھ اور اس کے رسولوں کے ساتھ خاص تعلق محبت تھا۔"[1]

---

[1] الفضل ۲۰ر جنوری ۱۹۲۸ء

تقریر و تحریر

آپ کی تعلیم کا ایک اہم پہلو تحریر و تقریر سے متعلق تھا۔اس شعبہ میں بھی حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ ہی آپ کے معلّم اور مربّی بنے اور آپ کی تربیت میں گہری دلچسپی لی۔لیکن آپ کے مضامین اور تقاریر کو جس سخت معیار سے جانچتے رہے وہ بعض اوقات آپ کی دل شکنی کا موجب بھی بن جاتا تھا حالانکہ اس سختی کی وجہ محض یہ تھی کہ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کو آپ سے بہت ہی بلند توقعات تھیں اور انہی توقعات کی کسوٹی پر آپ حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب رضی اللہ عنہ کو پرکھتے تھے۔اس ضمن میں حضرت صاحبزادہ صاحب فرماتے ہیں:۔

> "مجھے خوب یاد ہے۔میں نے سب سے پہلا مضمون جب تشحیذ الاذہان میں لکھا تو اس کی بڑی تعریف ہوئی۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی اسے پسند فرمایا۔حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ نے خود کئی لوگوں کو دکھایا۔مگر مجھے فرمانے لگے "کبھی تم نے سنا ہے لوگ کہا کرتے ہیں۔اونٹ چالی تے ٹوڈا بتالی۔"پھر فرمانے لگے"اس کا کیا مطلب ہے؟میں نے عرض کیا مجھے تو پتہ نہیں ٹوڈا کیا ہوتا ہے۔فرمانے لگے"کسی نے اونٹ والے سے پوچھا تھا۔اونٹ بیچتے ہو؟اس کی کیا قیمت لوگے؟اس نے کہا اونٹ کے تو میں چالیس روپے لوں گا مگر اونٹ کے بچے کے بیالیس۔اس نے کہا یہ کیوں؟بیچنے والا کہنے لگا"اس لئے کہ یہ اونٹ بھی ہے اور اونٹ کا بچہ بھی ہے۔پھر فرمانے لگے ہم تمہارے باپ کے مضامین دیکھتے رہتے ہیں۔ابھی تک تمہارا یہ مضمون حضرت کے مقابل کا مضمون نہیں۔ہمیں تو تب خوشی ہو کہ ان سے بھی اعلیٰ لکھو"[1]

حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کی ایسی ہی بلند توقعات آپ کی تقاریر سے متعلق بھی تھیں اور نتیجۃً اُن کو بھی ایسے ہی کڑے معیاروں پر پرکھا جاتا تھا۔اس کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مرزا

---

[1] الفضل ۲۶ فروری ۱۹۳۱ء صفحہ ۹

بشیرالدین محمود احمد صاحبؓ فرماتے ہیں :۔

"ہم نے ایک دفعہ ایک انجمن بنائی جس میں تقریریں کرنے کی مشق کی جاتی تھی اور اعلیٰ درجہ کی تقریر کرنے والوں کو انعام دیئے جاتے تھے۔میں اس میں جب بھی تقریر کرتا' حضرت خلیفۃ المسیح الاوّلؓ اس پر ہمیشہ جرح اور نکتہ چینی کرتے ۔ کچھ مدت تک اسی طرح ہوتا رہا۔میرے نفس نے دھوکا دیا اور میں نے خیال کیا کہ مولوی صاحب مجھ پر حد سے زیادہ سختی کرتے ہیں۔میں نے ایک مضمون لکھا اور اپنے ایک سکول فیلو (ہم مکتب) کو جو تقریر کرنا نہیں جانتا تھا' پڑھنے کے لئے دیا۔جب اس نے مضمون پڑھا تو حضرت مولوی صاحبؓ نے اس کی از حد تعریف کی۔اس پر میرے دل میں اور احساس ہُوا کہ مولوی صاحب مجھ سے سختی کرتے ہیں۔"[۱]

یہ تو آپؓ کا اپنا تاثر تھا۔آپ کے بچپن کے ہم جماعت محترم شیخ عبدالعزیز صاحب جو آجکل لائلپور میں رہائش پذیر ہیں' اس بارہ میں اپنا الگ تاثر یوں بیان کرتے ہیں :۔

"حضرت مولوی نورالدین صاحب رضی اللہ عنہ اپنی خلافت کے زمانہ میں جمعہ پڑھانے کے بعد مسجد اقصیٰ میں ہی تشریف فرما ہوتے اور چند ایک طلباء تھوڑے وقت میں اپنا اپنا مضمون یا لیکچر سناتے ۔آخر میں حضرت مولوی صاحبؓ ہر ایک کے مضمون اور لیکچر پر ریمارکس کرتے لیکن حضرت میاں صاحب (مصلح موعودؓ) کے مضمون کی زیادہ ہی غلطیاں نکالتے اور بتاتے کہ آپ کو یہ یہ باتیں بیان کرنی چاہیئے تھیں اور اصلاح فرماتے ہوئے نہایت محبت اور شفقت سے ان کی بعض خوبیاں بھی بیان کرتے جس سے کم از کم میں تو ضرور سمجھتا کہ میاں صاحب کا مضمون سب سے "پھاڈی" ہے جس میں بے شمار نقائص ہیں۔لیکن مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ دراصل آپ میاں صاحب کو ٹرینڈ کر رہے تھے۔بعد میں مَیں نے خود انہیں ایسے ایسے لیکچر دیتے سُنا کہ عقل حیران ہو جاتی تھی کہ یہ وہی شخص ہے جو سب سے پھاڈی تھا۔"[۲]

---

[۱] الفضل ۵؍اکتوبر ۱۹۴۸ء [۲] مسوّدہ روایات محترم شیخ عبدالعزیز صاحب

جب استاد کا طالب علم سے اس قسم کا رویہ ہو تو بسا اوقات استاد کے نیک ارادوں کی طرف طبیعت مائل ہونے کی بجائے اس کے سلوک کی ظاہری تلخی زیادہ شدت سے محسوس ہونے لگتی ہے اور اکثر طلباء کا ردِ عمل ایسی صورت میں یا تو استاد اور تعلیم سے متنفر ہو جانے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے یا پھر ایسے طلباء اندرونی طور پر مرجھا جاتے ہیں اور کوئی ذوق و شوق باقی نہیں رہتا۔ اس کے برعکس بعض طلباء کو اللہ تعالیٰ نے ایسی فطرت عطا فرمائی ہوتی ہے کہ اُن پر استاد کا یہ سلوک تازیانہ کا کام کرتا ہے اور اس چیلنج کو مردانہ وار قبول کرتے ہوئے وہ اپنی کمزوریوں کو دُور کرنے اور اپنی قابلیتوں کو پہلے سے بڑھ کر اُجاگر کرنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔

حضرت مرزا محمود احمد صاحبؓ پر مؤخر الذکر ردِ عمل ہُوا اور اسی کی حضرت خلیفہ اوّلؓ کو آپ سے توقع تھی۔ اس کے نتیجہ میں آپ کی تقریر و تحریر کو کیا نئی رفعتیں عطا ہوئیں، اس مضمون کے بیان کا موقع آپ کی زندگی کے بعد کے حالات میں جا بجا پیدا ہوتا رہے گا۔

اس دَور میں جس پر ہم نظر ڈال رہے ہیں یعنی آپ کی پیدائش سے لے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وصال تک کا دَور ــــ اس میں آپ کو مشق کے علاوہ بھی بعض اوقات تقریر کرنی پڑی ۱۹۰۰ء میں تعلیم الاسلام ہائی سکول قادیان کا امرتسر خالصہ کالج سے فٹ بال کا میچ ہُوا تھا۔ جس میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے تعلیم الاسلام ہائی سکول کی ٹیم کامیاب رہی۔ صاحبزادہ صاحب موصوف بھی ٹیم کے ساتھ امرتسر گئے تھے۔ میچ کے بعد ایک مختصر سی تقریبِ مسرت منعقد ہُوئی جس میں شہر کے بعض رؤسا شامل تھے۔ پارٹی کے بعد صاحبزادہ صاحب سے خواہش کی گئی کہ آپ حاضرین سے خطاب فرماویں۔ آپ نے اس سے پہلے اس قسم کے مجمع میں جس میں معزز غیر احمدی بھی بکثرت شامل ہوں کبھی پبلک تقریر نہیں کی تھی۔ اس لئے آپ نے عذر کیا اور کہا کہ میں تیار نہیں ہوں۔ لیکن حاضرین کے اصرار پر آپ دل میں دُعا کرتے ہوئے کھڑے ہُوئے اور پہلے تجربہ کے باوجود بڑی مؤثر تقریر کی اور ایسے نئے نکات بیان کئے کہ ایک نوخیز طالب علم کی زبان سے معرفت کی ایسی باتیں سُن کر سبھی حیران رہ گئے۔ آپ نے فرمایا:

> "خدا تعالیٰ سورۃ فاتحہ میں ایک دُعا سکھاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اے خدا ہم نہ مغضوب بنیں اور نہ ضالّ بنیں۔ احادیث سے ثابت ہے کہ مغضوب علیہم سے مُراد یہودی اور ضالّین سے مراد نصاریٰ ہیں ... دوسری طرف اس بات پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے کہ یہ سورۃ مکّہ میں نازل ہُوئی ہے۔ اب یہ ایک عجیب بات ہے کہ جب یہ سورۃ نازل ہُوئی تھی اس وقت نہ یہودی

آپ کے مخالف تھے نہ عیسائی۔ آپ کے مخالف صرف مکّہ کے مشرکین تھے ... اس میں کیا راز اور کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کا تو ذکر نہ کیا جن کی مخالفت کا مکّہ میں شدید زور تھا اور یہود و نصاریٰ کا ذکر کر دیا۔ جو وہاں آٹے میں نمک کے برابر تھے۔ اس میں یہ راز ہے کہ قرآن کریم کا نازل کرنے والا عالم الغیب خدا جانتا تھا کہ اس کی تقدیر کے ماتحت مکّہ کا مذہب ہمیشہ کے لئے تباہ کر دیا جانے والا تھا۔ اور آئندہ ... اس کا نام و نشان تک نہ ملنا تھا پس جو مذہب ہی مٹ جانے والا تھا، اس سے بچنے کی دُعا سکھانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ جو مذاہب بچ رہنے تھے اور جن سے رُوحانی یا مادی رنگ میں اسلام کا ٹکراؤ ہوتا تھا، ان کے بارہ میں دُعا سکھا دی گئی "[1]

ابتدائی تقاریر میں سب سے اہم اور قابلِ ذکر موقع اُس آخری جلسہ سالانہ کا ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے وصال سے ڈیڑھ سال قبل دسمبر ۱۹۰۶ء میں منعقد ہُوا۔ اس موقع پر سلسلہ کے چوٹی کے علماء اور اکابرین کے علاوہ بیرونی جماعتوں سے کافی تعداد میں مرد، عورتیں اور بچے تشریف لائے ہُوئے تھے۔ پبلک اجتماع سے آپ کا یہ پہلا خطاب تھا اور موقع کی اہمیت کے پیشِ نظر آپ پر جو اندرونی ہیجان اور گھبراہٹ کی کیفیت طاری تھی، اس کے باوجود آپ کی تقریر غیر معمولی طور پر کامیاب ہُوئی اور سورۃ لقمان کے دوسرے رکوع کی جو تفسیر آپ نے بیان فرمائی اس میں قرآن کریم کے ایسے نئے معارف اور لطیف نکات بیان ہُوئے کہ یہ تفسیر زبان زدِ عام ہو گئی اور حیرت و استعجاب سے انگلیاں اٹھنے لگیں کہ یہ نوجوان قرآنی معارف کو سمجھنے میں بڑے بڑے اکابرین پر بازی لے گیا ہے۔ چنانچہ یہ تقریر اسی زمانہ میں اخبار "البدر" قادیان میں شائع ہو گئی اور آج بھی اس کا مطالعہ انسان کو ایک عجیب رُوحانی سُرور عطا کرتا ہے۔ خود حضرت مرزا محمود احمد رضی اللہ عنہ پر اس تقریر کے دوران جو کیفیت طاری تھی وہ آپ ہی کی زبانی سُننے کے لائق ہے۔

آپ فرماتے ہیں :-

"سب سے پہلی تقریر جو میں نے عام جلسہ میں کی ــــ اس رکوع کو پڑھ کر اس مسجد میں کی تھی۔ اب مسجد وسیع ہو گئی ہے اور اس کی پہلی شکل

---

[1] تفسیر کبیر سورۃ کوثر صفحہ ۴۷۶-۴۷۷

نہیں رہی لیکن اس وقت میں جہاں کھڑا ہوں عین اس کے سامنے کے دروازے میں کھڑے ہو کر میں نے تقریر کی تھی۔ اگرچہ اب علم میں بہت ترقی ہو گئی ہے۔ حالات اور افکار میں بہت تغیر ہو گیا ہے لیکن اب بھی میں اس تقریر کو پڑھ کر حیران ہو جاتا ہوں کہ وہ باتیں کس طرح میرے منہ سے نکلیں اور اگر اب میں وہ باتیں بیان کروں تو یہی سمجھوں گا کہ خدا تعالیٰ نے خاص فضل سے سمجھائی ہیں۔ اس وقت مجھ پر ایسی حالت تھی کہ چھوٹی عمر اور مجمع عام میں پہلی دفعہ بولنے کی وجہ سے میرے اعصاب پر ایسا اثر پڑا ہوا تھا کہ مجھے لوگوں کے چہرے نظر نہ آتے تھے' اندھیرا سا معلوم ہوتا تھا۔ اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ مَیں کیا کہہ رہا ہوں۔ بعد میں اخبار میں مَیں نے یہی تقریر پڑھی تو معلوم ہُوا کہ میں نے کیا کہا تھا۔ یہ رکوع میرے لئے تبلیغ اسلام کرنے میں بیج کا کام دے گیا اور میں نے اس سے بڑا فائدہ اٹھایا۔"[1]

اس موقع پر سامعین کی جو کیفیت تھی اس کا کچھ اندازہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جلیل القدر صحابی اور قادر الکلام شاعر حضرت قاضی محمد ظہور الدین صاحب اکمل رضی اللہ عنہ کے ان الفاظ سے ہو سکتا ہے:۔

"بُرجِ نبوّت کا روشن ستارہ' اوجِ رسالت کا درخشندہ گوہر محمود سلمہ اللہ الودود شرک پر تقریر کرنے کیلئے کھڑا ہُوا' میں ان کی تقریر خاص توجہ سے سنتا رہا۔ کیا بتاؤں' فصاحت کا ایک سیلاب تھا جو پورے زور سے بہہ رہا تھا۔ واقعی اتنی چھوٹی سی عمر میں خیالات کی پختگی اعجاز سے کم نہیں! میرے خیال میں یہ بھی حضور علیہ السلام کی صداقت کا ایک نشان ہے اور اسی سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ مسیحیّت مآب کی تربیت کا جوہر کس درجہ کمال پر پہنچا ہوا ہے۔ آپ نے روحانی کمالات پر عجیب طرز سے بحث کی۔"[2]

جہاں تک آپ کی مضمون نویسی کی مشق کا تعلق ہے' اس کا پہلا ٹھوس اظہار نوجوانوں کے ایک دینی' علمی اور ادبی رسالہ تشحیذ الاذہان کی صورت میں منظرِ عام پر آیا' جسے آپ نے اور آپ کے ساتھیوں

---

[1] الحکم جوبلی نمبر' دسمبر ۱۹۳۹ء

[2] الحکم ۱۰ جنوری ۱۹۰۰ء و جوبلی نمبر ۱۹۳۹ء

نے مل کر جاری کیا۔ آپؓ فرماتے ہیں :-

"ہم سات طالب علم تھے جنہوں نے مل کر رسالہ تشحیذالاذہان جاری کیا کسی سے کوئی مدد ہم نے نہیں لی۔ ایک پیسہ بھی چندہ کسی سے نہیں مانگا، اپنے پاس سے ہی سب رقوم دیں۔ ہاں بعد میں اگر بعض دوستوں نے اپنے طور پر کوئی مدد دی تو وہ لے لی ورنہ سب بوجھ خود اٹھایا کسی سے مضمون بھی نہیں مانگا خود ہی رسالہ کو ایڈٹ کرتے، خود ہی چھاپتے اور خود ہی بھیجتے تھے۔ سب کام خود ہی کرتے تھے۔" [1]

اس رسالہ میں نہایت اعلیٰ پایہ کے مضامین شائع ہوتے رہے اور جہاں ایک طرف وہ نوجوان جو جوہرِ قابل رکھتے تھے، اہلِ علم و ادب سے متعارف ہوئے، وہاں بعض نوجوانوں کو تحریر کی مشق کا بہت اچھا موقع میسر آیا۔ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیرالدین محمود احمد صاحبؓ اس کے صرف بانی ہی نہیں تھے بلکہ ہمیشہ اس کی روحِ رواں بھی بنے رہے اور آپ ہی کے مضامین دراصل اس رسالہ کی جان تھے۔ چنانچہ وہ پہلی تمہید جو اس رسالے کو شائع کرنے کی وجوہات پر بحث کرتے ہوئے رقم فرمائی وہ چودہ ۱۴ صفحات پر مشتمل تھی اور ایک ایسی اعلیٰ پایہ کی کاوش تھی کہ حضرت مولانا حکیم نورالدین رضی اللہ عنہ نے بھی کھلے لفظوں میں اس کی داد دی۔ گویا وہ اعلیٰ مطمحِ نظر آپ کو پورا ہوتا دکھائی دیا جس کو پیشِ نظر رکھ کر آپ نے اس نوجوان کو تقریر و تحریر کی تربیت دی تھی۔ حضرت حکیم نورالدینؓ کی تعریف تو پھر ایک استاد کی تعریف تھی، ایک مشفق و مہربان بلکہ غیر معمولی محبت کرنے والے بزرگ کی تعریف تھی تعجب تو اس بات پر آتا ہے کہ خواجہ کمال الدین صاحب وکیل اور مولوی محمد علی صاحب ایم۔ اے بھی اس موقع پر آپ کی تعریف میں رطبُ اللسان ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ دونوں بزرگ وہ ہیں جنہیں اپنی دنیوی علوم کی برتری کا اس زمانہ میں بھی بڑی شدت سے احساس تھا اور بعد میں تو یہ احساس بڑھتے بڑھتے اس درجے تک پہنچ گیا کہ حضرت مرزا محمود احمد رضی اللہ عنہ کی ہردلعزیزی اور آپ کے علم و فضل کی برتری کے چرچے ان کو خوشی کی بجائے دُکھ پہنچانے لگے۔ یہی مولانا محمد علی صاحب ہیں جو اس تمہید کو پڑھ کر بے اختیار یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے :-

"اس رسالہ کے ایڈیٹر مرزا بشیرالدین محمود احمد حضرت اقدس کے صاحبزادہ ہیں۔ پہلے نمبر میں چودہ صفحوں کا ایک انٹروڈکشن ان کی قلم سے

---

[1] الفضل ۳۰ر جولائی ۱۹۴۱ء

لکھا ہُوا ہے۔ جماعت تو اس مضمون کو پڑھے گی مگر میں اس مضمون کو مخالفینِ سلسلہ کے سامنے بطور ایک بیّن دلیل کے پیش کرتا ہوں جو اس سلسلہ کی صداقت پر گواہ ہے۔ اس وقت صاحبزادہ صاحب کی عمر اٹھارہ اُنیس سال کی ہے اور تمام دنیا جانتی ہے کہ اس عمر میں بچوں کا شوق اور امنگیں کیا ہوتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اگر وہ کالجوں میں پڑھتے ہیں تو اعلیٰ تعلیم کا شوق اور آزادیٔ خیال اُن کے دِلوں میں ہوگا۔ مگر دین کی ہمدردی اور اسلام کی حمایت کا یہ جوش جو اوپر کے بے تکلّف الفاظ سے ظاہر ہو رہا ہے' ایک خارقِ عادت بات ہے۔ صرف اسی موقع پر نہیں بلکہ میں نے دیکھا ہے کہ ہر موقع پر یہ دِلی جوش اُن کا ظاہر ہو جاتا ہے۔ جھُوٹ تو ایک گند ہے۔ پس اس کا اثر تو یہ چاہیئے تھا کہ گندہ ہوتا نہ یہ کہ ایسا پاک اور نُورانی جس کی نظیر نہیں ملتی ... غور کرو! کہ جس کی تعلیم اور تربیت کا یہ پھل ہے' وہ کاذب ہو سکتا ہے؟ اگر وہ کاذب ہے تو پھر دنیا میں صادق کا کیا نشان ہے؟" [1]

صرف جماعتِ احمدیہ کے افراد نے ہی اس رسالے کی عظمت کو تسلیم نہیں کیا بلکہ غیروں نے بھی اس پر تحسین کی نظر ڈالی۔ یہاں تک کہ قادیان سے سینکڑوں میل دُور وسطِ ہند کے مشہور شہر مُراد آباد تک بھی اس کے چرچے ہونے لگے۔ چنانچہ وہاں کے ایک مشہور اخبار "نیّرِ اعظم" نے لکھا:

"بلا مبالغہ اسلامی رسالوں میں ریویو آف ریلیجنز کے بعد اس کا شمار کرنا چاہیئے مذہبِ اسلام کو اس کے اجرائے سے بہت مدد ملے گی۔" [2]

اس زمانہ میں آپ کی دینی سرگرمیاں غیر معمولی تیزی سے بڑھ رہی تھیں۔ ذہنی اور رُوحانی نشوونما کا یہ دَور تھا جسے دیکھ کر بے اختیار مصلحِ موعود کی پیشگوئی کے ان الفاظ کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے کہ —— "وہ جلد جلد بڑھے گا"۔

چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی اس دَور میں آپ کے دینی جوش کو محسوس فرما کر اس کا اظہار اِن لفظوں میں فرمایا:۔

"میاں محمود میں اس قدر دینی جوش پایا جاتا ہے کہ میں بعض اوقات ان کے لئے خاص طور پر دُعا کرتا ہوں۔" [3]

---

[1] ریویو اُردو مارچ ۱۹۰۶ء [2] تاریخِ احمدیت جلد سوم صفحہ ۴۶۹ [3] الحکم جوبلی نمبر ۱۹۳۹ء

یہ چھوٹا سا اظہارِ مسرّت خود حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرزِ فکر پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ بچے کی غیر معمولی صلاحیتوں کو دیکھ کر خوشی کے اظہار کا یہ ایک عجیب طریق ہے کہ فخریہ کلمات کی بجائے آپ فرماتے ہیں کہ میں ان کے لئے خاص طور پر دُعا کرتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ آپ یہ محسوس کرکے کہ یہ وہی بچہ ہے جس کا وعدہ دیا گیا تھا، اس لئے خاص طور پر دُعا کی طرف متوجہ ہوتے تھے کہ اسے اللہ تعالیٰ واقعی وہی موعود بیٹا بنا دے جس کی خبر دی گئی تھی اور اُس پر اپنے فضلوں کی بارش کو تیز تر کر دے تاکہ تمام خوشخبریاں اس کے حق میں بدرجۂ تام پُوری ہوں۔

بچپن کی دلچسپیاں
تفریحات اور کھیلیں

آپ کی دلچسپیوں کا دائرہ بہت وسیع تھا اور ایک نظر اُن پر ڈالنے سے ایک نہایت وسیع اور ہمہ گیر شخصیت سے تعارف کا احساس ہونے لگتا ہے۔

دلچسپیوں کا مضمون اگرچہ بظاہر کوئی سنجیدہ یا مسائلِ انسانی سے متعلق کوئی اہم مضمون نظر نہیں آتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ کسی انسان کے کردار کے گہرے اور قابلِ اعتماد مطالعہ کے لئے اس کے بچپن اور لڑکپن کی دلچسپیوں کا مطالعہ نہایت مفید ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ انسانی زندگی کا یہ دور تصنّع سے پاک ہوتا ہے۔

پس جہاں بچپن اور دلچسپیوں کا مضمون اکٹھا ہو جائے، وہاں بے لاگ اور غیر مبہم مطالعہ کا بہترین موقع پیدا ہو جاتا ہے مثلاً کھیل کے میدان میں جذباتی انگیخت کے واقعات اور ان کا طبیعت پر ردِ عمل، فتح و شکست کی کیفیات، جسمانی خطرات، دوستوں کے ساتھ معاملات، کسی کی حق تلفی کا موقع پیدا ہونا، کسی کی حق تلفی کرنا، خود نمائی پیدا ہونا یا اس کے برعکس انکسار، حق پرستی یا توکل وغیرہ وغیرہ ایسے بہت سے حالات بکثرت پیدا ہوتے رہتے ہیں جو کسی انسان کی ذہنی اُپج اور جذبات اور اخلاق کی گہرائیوں کے مطالعہ کا بہترین موقع فراہم کرتے ہیں۔

کھیلوں میں آپ کی دلچسپی کا عمومی تعارف تو یہ ہے کہ کبھی آپ نے کسی ایک کھیل کو اس طرح منفرد کر کے نہیں اپنایا کہ وہ مستقلاً آپ کی عادت بن جائے اور آپ کی دیگر دلچسپیوں پر حاوی ہو جائے بدلتے ہوئے موسموں کے مطابق بدلتی ہوئی کھیلیں آپ کی دلچسپیوں کا مرکز بنتی رہیں۔ قادیان ایک ایسے علاقہ میں واقع ہے جو دامنِ کوہ کے قریب ہونے کے باعث سر سبز و شاداب ہے اور سردی و گرمی دونوں ہی وہاں شدید ہوتے ہیں۔ برسات بھی خوب کھُل کر ہوتی ہے اور بسا اوقات ہفتہ ہفتہ دس دس دِن تک مسلسل جھڑی لگی رہتی ہے۔ اس علاقے میں پنجاب کی ٹھیٹھ مقامی کھیلیں بڑی مرغوب ہیں مثلاً گلی ڈنڈا کبڈی، میرو ڈبہ وغیرہ اور باہر سے آئی ہوئی یورپین کھیلیں مثلاً فٹ بال، ہاکی، کرکٹ، بیڈمنٹن بھی وہاں شوق سے کھیلی جاتی ہیں۔

ان میں سے بعض کھیلیں سخت سردی کے دنوں میں زیادہ موزوں، بعض موسم بہار یا موسم خزاں میں، بعض برسات میں اور بعض سخت گرمی کے ایام میں کھیلی جاتی ہیں۔

حضرت صاحبزادہ صاحب ان میں سے کسی ایک کھیل کے ایسے شوقین نہیں ہوتے کہ اس میں غیر معمولی مہارت پیدا کرنے کے لئے اُسے مستقلاً اپنا لیا ہو۔ طبیعت میں تجسّس کا مادہ بہت تھا اور نئی چیز دیکھنے پر اس کا ذاتی تجربہ حاصل کرنے کا شوق مچلنے لگتا۔ چنانچہ ایسے دنوں میں جب کہ موسم اور طبیعت کو فٹ بال سے زیادہ مناسبت ہو، آپؓ فٹ بال کھیلا کرتے۔ جب کبڈی کا دَور دَورہ ہوتا، آپ کبڈی کے میدان میں نکل جاتے۔ جب بچوں میں میرو ڈبہ یا گلی ڈنڈا کی رَو چلتی تو آپ میرو ڈبہ یا گلی ڈنڈا کی ٹیموں میں دکھائی دینے لگتے۔ جب برسات کی جھڑیاں قادیان کے گرداگرد پھیلے ہوئے جوہڑوں کو لبالب بھر دیتیں بلکہ پانی ان کے کناروں سے اُچھل کر میدانوں میں پھیل جاتا اور قادیان حدِ نظر تک پھیلے ہوئے پانی کے درمیان ایک جزیرہ دکھائی دینے لگتا تو تیراکی اور کشتی رانی کا شوق ہر شوق پر غالب آجاتا۔ پھر جب خزاں اور بہار کے معتدل دن رات شکار کا موسم لے کر آتے تو آپ کے دِل میں بھی یہ شوق کروٹیں لینے لگتا۔

بچپن کے ابتدائی دَور میں آپ غلیل لے کر بچوں کے جھرمٹ میں شکار کے لئے نکل کھڑے ہوتے بعد ازاں جب ہوائی بندوق میسر آئی تو ہوائی بندوق لے کر دوستوں کو ساتھ لئے ہوئے قادیان کے اردگرد کے دیہات میں شکار کے لئے نکل جاتے۔

آیئے اب ہم ان دلچسپیوں پر ذرا تفصیلی نظر ڈال کر دیکھیں کہ کس حد تک یہ ہمیں آپؓ کی شخصیت سے روشناس کرانے میں مدد دیتی ہیں۔

شکار کا ذکر چل رہا تھا سو شکار ہی کے ایک واقعہ سے ہم اس مضمون کا آغاز کرتے ہیں جو آپؓ نے ایک موقع پر بیان فرمایا ہے:۔

"مجھے اپنے بچپن کی ایک مثال یاد ہے۔ اس وقت تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی تھی اور میں بڑا تعجب کرتا تھا اور بہت سوچتا تھا۔ مگر کچھ سمجھ نہیں آتی تھی۔ آخر خدا کے فضل سے وہ بات حل ہوگئی اور میں سمجھ گیا کہ اس کے اندر کیا حقیقت تھی۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ مجھے بچپن میں ہوائی بندوق کے ساتھ چھوٹے پرندوں کے شکار کا بہت شوق تھا۔ ایک دفعہ میں بندوق لے کر ایک گاؤں کی طرف گیا جس کا نام شاید ناتھ پور ہے۔ ایک

دو اور لڑکے بھی میرے ساتھ تھے۔ جب میں وہاں پہنچا چند نوجوان سکھ اُس گاؤں کے ہمارے پاس آئے اور کہنے لگے' آؤ ہم تم کو شکار بتلاتے ہیں۔ چنانچہ وہ ہمیں گاؤں کے قریب لے گئے اور خود انہوں نے ہمیں شکار بتلایا اور جگہ جگہ ہمارے ساتھ پھرتے رہے اور جس طرح ہم اس شکار میں لذّت محسوس کر رہے تھے' اسی طرح وہ بھی لذّت محسوس کر رہے تھے۔ اور جس طرح ہم شوق سے شکار کی تلاش میں پھر رہے تھے' ہمارے ساتھ وہ بھی اسی طرح شوق کے ساتھ پھر رہے تھے کہ ایک جگہ ایک درخت پر فاختہ نظر آئی' میں نے نشانہ لگا کر بندوق چلائی اور وہ گر گئی۔ اس سے بھی جس طرح ہم نے لذّت اور خوشی محسوس کی' اسی طرح انہوں نے بھی خوشی کا اظہار کیا کہ اتنے میں گاؤں کی ایک بُڑھیا وہاں سے گزری۔ اس نے جو فاختہ کو تڑپتے ہوئے دیکھا' تو دیکھتے ہی شور مچانا شروع کر دیا اور ان نوجوان سکھوں سے کہا کہ تم کو شرم نہیں آتی! تم ایسے بے غیرت ہو گئے ہو کہ لوگ دوسرے گاؤں سے آ کر تمہارے گاؤں میں جیو ہتیا کرتے ہیں۔ (آگے حضور نے فرمایا کہ اس بُڑھیا کے کہنے پر ان نوجوان سکھوں کا رنگ متغیّر ہو گیا اور وہ کہنے لگے کہ یہاں شکار نہ کریں)"[1]

یہ واقعہ میرے نزدیک اس پہلو سے مطالعہ کے لائق ہے کہ ایسا واقعہ اگر کسی عام بچے سے پیش آتا تو یقیناً وہ سخت خوف محسوس کرتا اور یہی خوف اس کی یاد کا نمایاں پہلو بن کر اس کے ذہن پر ثبت ہو جاتا۔ بلاشبہ صورتِ حال ایسی تھی کہ بڑھیا کی انگیخت سے آپ اور آپکے چند معصوم ساتھیوں کیلئے سخت خطرہ پیدا ہو سکتا تھا۔ جس زمانہ کا یہ ذکر ہے ان دِنوں قادیان کی آبادی بہت کم تھی اور علاقے پر وہ رُعب ابھی قائم نہ ہُوا تھا جس کا ہم نے بعد کے زمانہ میں مشاہدہ کیا۔ لیکن بعد کے زمانہ میں بھی جب کہ قادیان کی دھاک بیٹھ چکی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ قادیان کے بچے سکھوں کے بعض بدنام دیہات میں جانے سے گھبراتے تھے کیونکہ ان کی وحشت اور جرائم کے قصّے عام مشہور تھے اور بسا اوقات وہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے برانگیختہ ہو کر بچوں کو زد و کوب کیا کرتے تھے۔ بلکہ بڑوں سے بھی اُن کے اُلجھنے اور بعض اوقات اچھی خاصی لڑائیاں ہونے کے واقعات روزمرّہ کے مشاہدہ کی باتیں تھیں۔ لہٰذا میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس پس منظر کی روشنی میں بچوں کو ایسے واقعات اگر یاد رہتے ہیں تو خوف اور گھبراہٹ کی ہیجانی کیفیات کی وجہ سے

---

[1] الفضل قادیان ۱۴ اپریل ۱۹۲۵ء

اور عموماً ایسے واقعات بیان کرتے ہوئے وہ اس بات پر ختم کرتے ہیں کہ اس وقت خوف کے مارے ہماری جان نکل گئی یا ٹانگیں کانپنے لگیں یا سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنے لگے یا ہم نے دُعا کی کہ اے اللہ! اب تو ہی بچانے والا ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن حضرت صاحبزادہ صاحب کا ردِّ عمل بالکل الگ ہے اور طبیعت پر غالب اور دیرپا اثر جس چیز نے کیا وہ ایک نفسیاتی مسئلہ تھا۔ آپ کے ذہن کا ردِّ عمل ایک ایسے فلسفی کا سا ہے جو مثلاً تاریخ کے اُلجھے ہوئے واقعات کو سُلجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ آپؓ کو اس واقعہ سے شدید تعجب اس بات پر ہوا کہ ایک طرف سادہ فطرت کا معصوم تقاضا ہے جس کے پیشِ نظر سادہ لوح سکھ جوان اور بچے آپ کے ساتھ مل کر شکار کا طبعی لُطف اٹھا رہے ہیں۔ دوسری طرف ایک مذہبی تعصب سے پیدا شدہ انگیخت ہے جس کے نتیجہ میں اچانک ان کا رُجحان تبدیل ہو کر اُن کا تعصب فطری شوق پر غالب آجاتا ہے۔ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ اور کس حد تک درست اور کس حد تک غلط تھا؟ یہ فکر آپؓ پر ایسی غالب آئی کہ اس وقت ہی نہیں بلکہ بعد ازاں بھی سالہا سال اس پر غور کرتے رہے اور یہ واقعہ اپنے اسی نمایاں پہلو کی وجہ سے آپ کو یاد رہا۔ آپ کے یہ الفاظ آپ کی دیرینہ عادتِ فکر کے آئینہ دار ہیں:

"اس وقت تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی تھی اور میں بڑا تعجب کرتا تھا اور بہت سوچتا تھا مگر کچھ سمجھ نہ آتی تھی۔ آخر خدا کے فضل سے وہ بات حل ہوگئی اور میں سمجھ گیا کہ اس کے اندر کیا حقیقت تھی؟..."

آپ کا نشانہ بچپن ہی سے بہت اچھا تھا۔ حکیم دین محمد صاحبؓ جو آپ کے بچپن کے ساتھ کھیلے ہوئے ہیں، بیان کرتے ہیں:۔

"ایئر گن کا نشانہ آپ کا بڑا ہی صحیح تھا چنانچہ اس حد تک تھا کہ زنبور[1] جو آم پر بیٹھے ہوتے تھے۔ آپ ایک ایک کو نشانہ بنا کر گرا دیتے تھے۔ اکثر چھوٹی چڑیوں اور فاختہ کا شکار کرتے۔ ہم آپ کے ساتھ ہوتے، اور ذبح کرتے جاتے۔ بڑے ہو کر آپ کے پاس بندوقیں تھیں اور سب احباب کو معلوم ہے پھر دھیچی میں جا کر دریائے بیاس پر مُرغابی کا شکار کیا کرتے تھے"[2]

شکار کے دوران کئی رنگ میں آپ کی تربیت ہوتی رہی۔ بہت حد تک تو اس وجہ سے کہ آپ کا

---

[1] بھڑ

[2] مسودہ روایات حضرت حکیم دین محمد صاحب، دار الرحمت وسطی۔ ربوہ

ذہن گرد و پیش پر غور کرنے اور چھوٹے چھوٹے واقعات سے سبق حاصل کرنے کا عادی تھا۔ اور کچھ اس طریق پر کہ جب گھر آکر اپنے شکار کے قصے بیان کیا کرتے تو حضرت اماں جان اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام جہاں ضروری سمجھتے مناسب نصیحت فرما دیتے جو حکمت و دانائی سے لبریز ہوتی۔

ایک مرتبہ آپ ایک طوطا شکار کر لائے۔ ہمارے ہاں عوام النّاس میں طوطے کو حرام سمجھا جاتا ہے اور بہت سے علماء کے نزدیک اس کا کھانا مکروہ ہے لیکن جہاں تک شریعت کا تعلق ہے کوئی ثبوت اسکے حرام یا مکروہ ہونے کا نہیں ملتا۔ البتہ ہمارا مزاج ضرور گواہی دیتا ہے کہ یہ جانور کھانے کا نہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس موقع پر ظاہری اصطلاحوں میں پڑنے کی بجائے بڑے ہی پیارے انداز میں وہ حکمت کی بات صاحبزادہ صاحب کو سمجھا دی جس کے نتیجہ میں صرف طوطے کا مسئلہ ہی نہیں بلکہ اس قسم کے بیسیوں الجھے ہوئے مسائل نہایت آسانی سے حل ہو جاتے ہیں، آپ نے فرمایا:

> "میاں! اللہ تعالیٰ نے سب جانور کھانے کے لئے ہی پیدا نہیں کئے۔ بعض ان میں سے خوبصورتی کے لئے بھی پیدا کئے گئے ہیں۔ (یعنی اللہ تعالیٰ کی کائنات کو زینت بخشنے کے لئے) طوطا انہیں میں سے ایک ہے۔"

بات یہ چھوٹی سی ہے لیکن جس بچے کی اس حکمت اور دانائی سے تربیت ہو رہی ہو، اس کی بصیرت میں لطافت اور قلب و ذہن میں وسعت کیوں پیدا نہ ہو۔ شکار کے علاوہ آپ کو گھوڑ سواری کا بھی شوق تھا آپ فرماتے ہیں:۔

> "مجھے یاد ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے مجھے ایک گھوڑی خرید کر دی تھی۔ درحقیقت وہ خرید تو نہ کی گئی تھی بلکہ تحفۃً بھیجی گئی تھی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ میں نے لڑکوں کو سائیکل پر سواری کرتے دیکھا تو میرے دل میں بھی سائیکل کی سواری کا شوق پیدا ہوا۔ میں نے اس کا ذکر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی خدمت میں کیا۔ آپ نے فرمایا مجھے سائیکل کی سواری تو پسند نہیں، میں تو گھوڑے کی سواری کو مردانہ سواری سمجھتا ہوں۔ میں نے کہا اچھا آپ مجھے گھوڑا ہی لے دیں۔ آپؑ نے فرمایا پھر مجھے گھوڑا وہ پسند ہے جو مضبوط اور طاقتور ہو۔ اس سے غالباً آپ کا منشاء یہ تھا کہ میں اچھا سوار بن جاؤں گا۔ آپ نے کپورتھلہ والے عبدالمجید خان صاحب کو لکھا کہ ایک اچھا گھوڑا خرید کر بھجوا دیں۔ خان صاحب کو اس لئے لکھا کہ ان کے والد صاحب ریاست کے اصطبل کے

انچارج تھے اور ان کا خاندان گھوڑوں سے اچھا واقف تھا۔ انہوں نے ایک گھوڑی خرید کر تحفۃً بھجوا دی اور قیمت نہ لی۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام جب فوت ہوئے تو چونکہ آپ کی وفات کا اثر لازمی طور پر ہمارے اخراجات پر بھی پڑنا تھا۔ اس لئے میں نے ارادہ کیا کہ اس گھوڑی کو فروخت کر دیا جائے تاکہ اس کے اخراجات کا بوجھ والدہ صاحبہ پر نہ پڑے۔ مجھے ایک دوست نے جن کو میرا یہ ارادہ معلوم ہو گیا تھا اور جو اَب بھی زندہ ہیں، کہلا بھیجا کہ یہ گھوڑی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا تحفہ ہے۔ اسے آپ بالکل فروخت نہ کریں۔ اس وقت میری عمر اُنیس۱۹ سال کی تھی۔ وہ جگہ جہاں مجھے یہ بات کہی گئی تھی، اب تک یاد ہے۔ میں اس وقت ڈھاب کے کنارے تشحیذ الاذہان کے دفتر سے جنوب مشرق کی طرف کھڑا تھا۔ جب مجھے یہ کہا گیا کہ یہ گھوڑی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا تحفہ ہے اس لئے اسے فروخت نہ کرنا چاہیئے تو بغیر سوچے سمجھے معاً میرے منہ سے جو الفاظ نکلے وہ یہ تھے کہ بے شک یہ تحفہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہے ... مگر میں گھوڑی کی خاطر حضرت ام المومنین رضؓ کو تکلیف دینا نہیں چاہتا۔ چنانچہ میں نے اس گھوڑی کو فروخت کر دیا۔" [1]

اس واقعہ کے من و عن بیان کرنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ قارئین کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے اس رجحان کا اندازہ ہو سکے کہ آپؑ ایک مجاہدانہ روح رکھتے تھے۔ اس لئے سائیکل کی بجائے گھوڑے کی مردانہ سواری کو ترجیح دی۔ اور گھوڑا بھی وہ جو بہت مضبوط اور طاقتور ہو۔

اگرچہ یہ بات اولاً حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی سیرت پر روشنی ڈالتی ہے، —— لیکن بلاشبہ مردانگی کی یہی صفات پوری شدت کے ساتھ حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحبؓ کے اندر بھی پائی جاتی تھیں۔ دراصل انسانی قویٰ کی بلوغت کے بعد جو انسانی صفات ہمیں نظر آتی ہیں، اگر اس کے پس منظر میں جستجو کی جائے تو انسان کے بچپن کے زمانہ میں یہ درخت ایک چھوٹے سے نرم و نازک پودے کی صورت میں دکھائی دے گا جس کی نرم و نازک جڑیں اس قسم کے واقعات کی نرم اور زرخیز مٹی میں پیوستہ ہوتی ہیں۔ دوسرا پہلو قابلِ توجہ اس روایت کا آخری حصہ ہے۔ باوجود اس کے کہ آپؓ کو

---

[1] الفضل لاہور ۱۸؍ فروری ۱۹۴۸ء

گھوڑوں سے بہت پیار تھا اور تمام عمر آپ نے حسبِ توفیق متعدد گھوڑے رکھے اور اپنے بچوں اور بچیوں کو بھی سواری کا شوق دلایا۔ گھوڑوں سے پیار اپنی جگہ، لیکن اس سے بہت بڑھ کر اس گھوڑی کی یہ حیثیت کہ وہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا ایک یادگار عطیہ تھی۔ اس شدید محبت کے پیشِ نظر جو آپ کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے تھی، یقیناً یہ گھوڑی بھی آپ کو اسی نسبت سے خاص طور پر پیاری ہوگی لیکن ذمہ داری کا احساس ایک غیر مبہم اور روشن قوتِ فکر اور یہ ذہنی قابلیت کہ مختلف اقدار کو ان کے موقع اور محل پر رکھا جانا چاہیئے۔ یہ تینوں صفات قطعی طور پر اس بات کی ضامن تھیں کہ آپ جذبات کے کسی ایک دھارے میں بہہ کر کوئی یک طرفہ اور غیر متوازن فیصلہ نہ کر بیٹھیں۔ کتنا صحیح فیصلہ ہے کہ اپنے جذبات کی قربانی کو تو قبول کروں گا۔ مگر یہ خطرہ مول نہ لوں گا کہ میری ماں کو اس وجہ سے ادنیٰ سی تکلیف بھی پہنچے۔

گھڑ سواری ہی کے ضمن میں دو اور دلچسپ واقعات پیش کئے جاتے ہیں جو اپنے اپنے رنگ میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اللہ رکھی، جو قادیان کی ایک پرانی معروف دایا اور فضل دین قصاب کی بیوہ ہے۔ اس کا خاندان احمدی تو نہیں تھا لیکن حضرت صاحب کا پرانا خدمت گزار ضرور تھا اللہ رکھی اپنے بچپن کا یہ واقعہ بیان کرتی ہیں :۔

> "جب حضور سیر کے بعد گھوڑی پر سوار ہو کر گھر آیا کرتے تو ہم باوجود اس کے کہ غیر احمدی بچیاں تھیں۔ باہم مل کر ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ کر کھڑی ہو جاتی تھیں۔ اور آپ سے کہتی تھیں :۔
>
> "میاں محمود دی گھوڑی نوں پیٹھے
> میاں دی گھوڑی نوں اللہ رکھے
> گھوڑی دے دم دا اک بال دے دے"
>
> حضور مسکرا کر فرماتے کہ تم بال لے کر کیا کرو گی؟ ہم کہتیں کہ ہم بھڑیں پکڑیں گی اور ہوائی جہاز بنا کر اڑائیں گی۔ حضور فرماتے کہ اس سے گھوڑی کو تکلیف ہوگی روئے گی، پیٹے گی، خون نکلے گا۔ لاؤ میں تمہیں خود اپنے ہاتھ سے بھڑ پکڑ دیتا ہوں۔ ایک دفعہ حضور نے گھوڑی سے اتر کر ہمارے گھر کے سامنے دھریک کے درخت کے ساتھ باندھ دی اور اپنے ہاتھ سے آہستہ سے بھڑوں کے چھتے سے ایک دو بھڑ پکڑ لئے اور ہمیں کہا یہ لو بھڑیں۔ ایسا واقعہ کئی مرتبہ ہوا"

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بچپن ہی سے آپ کی طبیعت میں بے تکلفی، انکساری، زندہ دلی اور بچوں سے پیار پایا جاتا تھا۔ جس طرح پیار سے آپ چھوٹی چھوٹی بچیوں سے بات کرتے ہیں جو خاندانی لحاظ سے خادماؤں اور چاکرانیوں کا درجہ رکھتی ہیں، اُن کی دلجوئی کی خاطر سواری سے اتر کر اسے درخت سے باندھتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کا دل خوش کرنے کے لئے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ دیکھئے یہ چھوٹا سا دلچسپ واقعہ ایک بچے کی طبیعت کے کتنے ہی پہلوؤں پر کس عمدگی سے روشنی ڈالتا ہے۔ بچپن کا زمانہ اس لحاظ سے بہت ہی اہم ہے کہ اس کے سادہ، بے ریا اور بے تکلف نظارے کسی انسان کی فطرت سے روشناس کرانے میں بڑی ہی مدد دیتے ہیں۔ ایک مرتبہ بٹالہ کے اسٹیشن پر گورداسپور کے ایک ہندو رئیس بابا کانشی رام صاحب جو آپؓ سے بہت عقیدت رکھتے تھے آپ کی ملاقات کے لئے حاضر ہوئے، وہاں گھوڑوں کا تذکرہ چل پڑا تو آپ نے بچپن کا یہ واقعہ بیان کیا:

"ایک دفعہ بچپن کے ایام میں میں گھوڑے پر سوار ہوا۔ گھوڑا اتھا منہ زور۔ قصبہ سے باہر نکلتے ہی وہ بے لگام ہوگیا۔ میں نے ہرچند اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ نہ رُکا۔ اس حالت میں موضع بسرانواں کے قریب پہنچ گیا۔ جہاں میں نے دیکھا کہ گھوڑا جس رُخ جا رہا ہے۔ اس کے سامنے ایک غیر آباد بغیر منڈیر کے کنواں ہے۔ اور اس کے پاس ہی دو چار قدم کے فاصلے پر چند بچے کھیل رہے ہیں۔ اس وقت میں نے سوچا اگر اپنی جان بچانے کی کوشش کرتا ہوں اور بچوں کی طرف گھوڑے کا رُخ کرتا ہوں تو میری ایک جان کے بدلے کئی جانیں (بچے) ضائع ہونے کا خطرہ ہے اور اگر ان کو بچاتا ہوں۔ تو دوسری طرف کنواں ہے۔ جس میں گھوڑے کے گرنے کی وجہ سے اپنی جان جانے کا ڈر ہے۔ اس وقت میں نے یہی فیصلہ کیا کہ میرا اخلاقی فرض ہے کہ میں اپنی جان کی پرواہ نہ کروں۔ چنانچہ میں نے گھوڑے کو سیدھا جانے دیا۔ خدا کی شان، گھوڑا سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ عین کنوئیں کی منڈیر کے پاس پہنچ کر یکدم رُک گیا۔"[۱]

یہ واقعہ کسی تبصرے کا محتاج نہیں۔ سوائے اس کے کہ جب انسان خلوصِ نیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر کسی عظیم قربانی کے لئے تیار ہو جاتا ہے تو بسا اوقات اللہ تعالیٰ اس قربانی کی رُوح

---

[۱] الفضل ۴ مارچ ۱۹۶۲ء

کو تو قبول کر لیتا ہے لیکن آزمائش کے دُکھوں سے اِنسان کو اپنے فضل سے بچا لیتا ہے۔ نہ جانے وہ کتنی مرتبہ اپنے صادق بندوں سے اس قسم کے پیار کے سلوک فرما چکا ہے اور آئندہ فرماتا رہے گا۔ اور آج تک یہ دلنواز رسمِ بندگی و بندہ نوازی اُمّتِ محمدیہ میں لاکھوں مرتبہ جلوہ دکھا چکی ہوگی۔

جیسا کہ ذکر گزر چکا ہے' آپ کو کشتی رانی کا بھی شوق تھا اور تیراک بھی بہت اچھے تھے۔ یہ مشقیں زیادہ تر قادیان کے چاروں طرف پھیلے ہوئے ان خندق نما جوہڑوں میں ہُوا کرتی تھیں جو ڈھاب کے نام سے معروف تھے اور جن میں پانی تو سال بھر خشک نہ ہوتا تھا لیکن نہانے کے قابل صرف برسات کے دنوں میں ہُوا کرتے۔ غرضیکہ آپ اُن سب کھیلوں میں حصہ لیتے رہے جو قادیان میں رائج تھیں۔ آپ کے بچپن کے ایک ساتھی مرزا احمد بیگ صاحب بیان کرتے ہیں :

"بڑے ہو کر حضور فٹ بال بھی شوق سے کھیلتے تھے۔ اور میر وڈبہ خاص شوق سے کھیلتے تھے مجھے بھی حضور کے ساتھ میر وڈبہ اور فٹ بال کھیلنے کا اکثر اتفاق ہوا ہے۔ ویسے حضور ابتداءً جسمانی طور پر کچھ کمزور تھے۔ اس کے متعلق روایت ہے کہ ایک دفعہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی مجلس میں بھی حضور کی صحت کی اس حالت کا ذکر آیا تھا اور غالباً حضرت خلیفۃ المسیح الاوّلؓ نے کاڈ لیور آئیل Cod-liver oil تجویز کیا تھا۔

حضور کچھ عرصہ پہلوانی یعنی کُشتی کا کرتب بھی سیکھتے رہے ہیں یہ کرتب آپ ایک نوجوان جس کا نام محمد حسین تھا لیکن بچے اس کو بابا فضل حسین کر کے پکارتے تھے' سے سیکھا کرتے۔ فضل حسین صاحب اس لڑکے کے دادا تھے۔

ایک چھوٹی سی کشتی بھی جہلم سے منگوائی تھی۔ یہ طغیانی کے دِنوں میں حضور ڈھاب میں چلایا کرتے تھے۔

خلافت سے پہلے حضورؓ حضرت استاذی المکرّم مولوی شیر علی صاحبؓ کے ساتھ ضیاء الاسلام پریس کے عقب میں بیڈ منٹن کھیلا کرتے تھے ایک دفعہ مَیں بھی اس کھیل میں شامل ہُوا تھا۔"[1]

اس سلسلہ میں مدیر "الحکم" کا بیان بھی قابلِ ذکر ہے۔

---

[1] روایت مرزا احمد بیگ صاحب' ساہیوال

"غور کا مقام ہے کہ بچوں کو ایسے موقعوں پر کھیل کود کے تماشے دیکھنے کا ازحد شوق ہوا کرتا ہے۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ لڑکے اپنے فوائد کی پرواہ نہ کرکے اور نقصان اٹھا کر بھی دُور دُور سے ایسے نظارے دیکھنے کے واسطے جمع ہو جایا کرتے ہیں۔ مگر میں بعض ایسے لڑکوں کو خوب جانتا ہوں جو مدرسہ تعلیم الاسلام ہی کے تعلیم یافتہ ہیں۔ اپنی ٹیم کی کمزوری اور مقابل ٹیم کی طاقت اور مضبوطی کو دیکھ کر کھیل کے میدان سے الگ جاکر اور تنہائی کے گوشوں میں گریہ و بکا سے حضورِ الٰہی میں دعاؤں میں مصروف تھے۔ یہ بات کوئی چھوٹی سی نہیں کہ نظرانداز کر دی جائے۔ سوچنے والی طبیعت اس سے اندازہ کر سکتی ہے اور نتیجہ نکال سکتی ہے کہ ان بچوں نے اپنی کامیابی کی کلید کس بات کو یقین کر رکھا تھا اور اس سے ان کے دلی خیالات اور عقائد کا اچھی طرح سے اندازہ ہو سکتا ہے اور ان کے تعلیم و تربیت کے اعلیٰ اصول کا پتہ لگتا ہے...

جُوں تُوں کرکے ہاف ٹائم گزرا۔ پانچ منٹ آرام یا یُوں کہیے کہ دُعاؤں کے لئے ایک موقع ہاتھ آگیا۔ اور وقت گزرنے پر پھر میچ شروع ہوگیا۔ غرض پھر پُورے جوش و خروش سے اپنی اپنی کامیابی کے واسطے سرتوڑ کوشش کرنے لگے۔ خدا کی شان کوئی پندرہ بیس منٹ کی کھیل کے بعد تعلیم الاسلام سکول قادیان فٹ بال ٹیم نے ایک گول خالصہ کالجیئیٹ پر کر دیا۔ جس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں کیا گیا اور سب نے بے چون و چرا اس کو تسلیم کر لیا۔ اللہ اکبر! گول کا ہونا تھا کہ سب لڑکے میدان مقابلہ میں جدھر جس کا منہ تھا اور جہاں جو کوئی تھا، وہیں اللہ اکبر کہہ کر سجدے میں گر گئے۔ تمام احمدی قوم کے افراد جو اس وقت وہاں موجود تھے، خدا کی اس ذرّہ نوازی پر شکریہ کرتے ہوئے سجدہ میں گر گئے جن کی دیکھا دیکھی عوام اہلِ اسلام بھی سجدے میں گر گئے۔ عجیب ایک نظارہ تھا۔ اور عجیب ہی سماں! حاضرین پر ایک خاص اثر ہوا بجائے اس کے کہ گول کرنے کی خوشی میں چیرز

اور ہُرّوں کے نعرے لگائے جاتے اور بڑا غل غپاڑہ کیا جاتا، کوئی اُچھلتا، کوئی کُودتا، سب کے سب یکدم خدا کی حمد اور ستائش کے لئے سر نیاز زمین پر رگڑ رگڑ کر شکریہ کرنے لگے۔ سب لوگ اس نظارہ سے متاثر ہُوئے اور تعریف کرنے لگے۔

اس جگہ پر میں ایک عجیب نکتہ بیان کئے بغیر نہیں رہ سکتا جو کہ اگرچہ احمدی قوم کی تعلیم کی گھٹی میں شامل ہے۔ مگر موقع اور وقت کے لحاظ سے ایک نکتہ اس طبیعت کے واسطے بڑا ہی قابلِ تعریف ہے۔ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحبؓ جو اس وقت موقع میچ میں شریک تھے، سجدۂ شکر کے بعد اُٹھے اور فرمایا کہ ہم نے تو صرف یہ دعا کی ہے کہ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ۔ اُن کا فرمانا تھا کہ بجلی کی طرح میرے دل میں وہ سارا سماں بندھ گیا اور ساری حقیقت اس دعا کی میرے دل میں بھر گئی اور میں حضرت صاحبزادہ صاحب کی نکتہ رس طبیعت اور انتقالِ ذہن پر عش عش کر گیا۔ اور میں نے بھی اسی رنگ میں دعا کرنی شروع کر دی ....

کسی نے کسی ماہر فنِ جنگ سے پوچھا تھا کہ ہتھیاروں میں سے سب سے اچھا کون سا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ جو وقت پر کام آجاوے، غرض مناسبِ موقع اور مناسبِ حال یہی ایک دُعا تھی چنانچہ اللہ تعالےٰ نے بڑا فضل کیا اور انجام بخیر ہُوا اور مقابل کے لوگ کوئی گول نہ کر سکے، اور اس طرح سے خدا نے محض اپنے فضل سے تعلیم الاسلام ہائی سکول کو فتح عطا کی۔ جو کہ لڑکوں کے لئے خصوصاً مُوجب ازدیادِ ایمان ہوئی اور قبولیتِ دُعا کا ایک تازہ نمونہ اُن کو خدا نے اُن کے اپنے وجود میں عطا کر دیا۔"[1]

---

[1] "الحکم" ۲۲ مارچ ۱۹۰۸ء

تعلقات کے دائرے

بچپن کے اس دَور میں آپ کے تعلقات کے دائرے اپنے ہم جولیوں، بہن بھائیوں، اساتذہ اور بزرگان، ماں باپ، امام اور امام الائمہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ تعالیٰ کی ذات والاصفات تک ممتد تھے۔ مخالفوں سے براہِ راست سلوک کا کوئی خاص موقع اس لئے پیدا نہیں ہُوا کہ آپ کے لئے اُن سے معاملہ کرنے کے مواقع ہی پیدا نہیں ہوئے۔ اپنے سے کم عمر چھوٹے بچوں سے جو سلوک آپ فرماتے تھے۔ اس کی ایک چھوٹی سی جھلک گھوڑی والے اس واقعہ میں گزر چکی ہے جس میں گھوڑی کے دم کا بال مانگنے پر آپ نے کس طرح ان غریب بچوں کی دلجوئی فرمائی۔

آپ کے بچپن کے ساتھیوں کے تاثرات بھی جا بجا روایات کی صورت میں کچھ دیئے جا چکے ہیں اور کچھ آئندہ دیئے جاتے رہیں گے۔ اس لئے اس پر بھی کوئی الگ باب باندھنے کی ضرورت نہیں البتہ بہن بھائیوں سے آپ کا جو سلوک تھا اور اُن کے دلوں پر آپ کی کیا تصویر بن رہی تھی۔ یہ مطالعہ بڑا دلچسپ ہے۔

خوش قسمتی سے حضرت سیّدہ نواب مبارکہ بیگم صاحبہ مدظلہا العالی جو آپ کی چھوٹی ہمشیرہ اور ہمشیرگان میں بڑی ہیں، اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس وقت بقیدِ حیات ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کی عمر میں اور صحت میں بہت برکت دے۔ آپ نے صحت کی کمزوری کے باوجود تکلیف فرما کر اپنے تاثرات قلمبند فرمائے ہیں جن میں سے فی الحال آپ کی یادوں کا وہ حصہ پیش کیا جاتا ہے جو بچپن کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ آپ فرماتی ہیں :۔

"میں نے حضرت اُمّ المومنین رضی اللہ عنہا کو ایک خواب بیان فرماتے سُنا ہے۔ بلکہ خود مجھے بھی مخاطب فرما کر سُنایا ہے۔ دو چار بار فرمایا :۔

"جب تمہارے بڑے بھائی پیدا ہونے کو تھے تو ایامِ حمل میں مَیں نے خواب دیکھا کہ میری شادی مرزا نظام الدین سے ہو رہی ہے۔ اس خواب کا میرے دل پر مرزا نظام الدین کے اشد مخالف ہونے کی وجہ سے بہت بُرا اثر پڑا کہ دُشمن سے شادی مَیں نے کیوں دیکھی؛ مَیں تین روز تک مغموم رہی

اور اکثر روتی رہتی۔ تمہارے ابا یعنی حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے میں نے ذکر نہیں کیا۔ مگر جب آپؑ نے بہت اصرار کیا کہ بات کیا ہے؟ کیا تکلیف پہنچی ہے؟ مجھے بتانا چاہیئے تو میں نے ڈرتے ڈرتے یہ خواب بیان کیا۔ خواب سُن کر تو آپ بے حد خوش ہو گئے اور فرمایا اتنا مبارک خواب اور اتنے دن تم نے مجھ سے چھپایا! تمہارے ہاں لڑکا اسی حمل سے پیدا ہو گا اور نظام الدین کے نام پر غور کرو۔ اس کا مطلب یہ مرزا نظام الدین نہیں تم نے اتنے دن تکلیف اٹھائی اور مجھے یہ بشارت نہیں سُنائی"۔

اپنا بچپن کا ایک خواب یاد آگیا۔ یاد رہا اور کچھ سال ہوئے میں نے لکھ بھی لیا تھا۔ میں نے خواب میں دیکھا (میں خواب میں اوپر کے صحن میں کھڑی تھی) کہ ہمارے صحن کا کنواں لبالب پانی سے بھرا ہے اور ایک جوان نوعمر جس کی پُشت سے بڑے بھائی صاحب مرزا بشیر الدین محمود احمد ہی معلوم ہوتے تھے، تیز تیز اس کنواں کے گرد گھوم رہا ہے اور اس کی زبان پر اونچی آواز سے یہ الفاظ جاری ہیں:

" اِنِّیْ جَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِیْنَ
كَفَرُوْا اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ "

آنکھ کھلی تو میرے بڑے بھائی صاحب کا سَر (صرف شانوں تک) میرے تکیہ پر تھا پہلے تو میں دیکھتی رہی مگر جب وہ کیفیت دُور ہو گئی تو ڈر کر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو پکارا اور کہا کہ میں نے اس طرح خواب دیکھا ہے۔ آپ نے فرمایا یہ کشف تھا۔ ڈرو نہیں، بہت مبارک خواب اور کشف ہے۔

جہاں تک مجھے یاد ہے۔ حضرت اماں جانؓ کی زبانی دائی کا نام ہرو دائی تھا۔ اذان بھی کان میں حضورؑ خود دیتے تھے اور غالباً شہد وغیرہ بھی خود ہی چٹاتے ہوں گے۔ مگر اس کے لئے خاص الفاظ حضرت اماں جان رضی اللہ عنہا کے مجھے یاد نہیں۔

حضرت اماں جانؓ نے فرمایا کہ جب تمہارے بڑے بھائی پیدا ہوئے

تو عصمت (ہماری بہن) سو رہی تھیں۔ خادمہ نے اس کو جگایا اور کہا اُٹھو بی بی! تمہارا بشیرؔ آگیا۔ کیونکہ بشیر اوّل کی وفات پر غالباً عصمت اس کو یاد کرتی ہوں گی۔ اماں جان رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ وہ اُٹھ کر بجائے میری طرف آنے کے "میرا بشیر آگیا" کہتی ہوئی اپنی بڑی والدہ (والدہ حضرت مرزا سلطان احمد صاحبؒ) کی طرف یعنی تائی صاحبہ کے گھر کو دوڑ گئی۔ اس کو اپنی بڑی والدہ سے بہت تعلق تھا اور وہ بھی اس کو بہت پیار کرتی تھیں۔

بسم اللہ وغیرہ کی کوئی تقریب میں نے نہیں سُنی نہ دیکھی۔ آمین بے شک ہم سب کی ہُوئی اور بہت دُھوم سے ہُوئی۔ آپ نے شروع میں جہاں تک مجھے یاد ہے۔ اکثر سُنا ہوا (نام یاد نہیں آرہا) اس وقت بنگالی صاحب تھے نیز اُن کی اہلیہ صاحبہ کا دُودھ میرے منجھلے بھائی صاحب نے پیا تھا۔ زینب (بیگم مصری عبدالرحمٰن) کے والد صاحب صحابی تھے۔ مخلص تھے۔ ایک خط اُن کا میرے پاس رکھا ہے میرے میاں کو لکھا تھا۔ ایک بہت مبشر خواب مگر نام اُن کا بھول گئی اس وقت، مگر اللہ کے ساتھ نام تھا، یاد ہی نہیں آرہا۔ غالباً اُن سے ہی ابتداء میں پڑھا، پھر سکول میں بھی اور اصل شوق سے جو پڑھنا شروع کیا تو حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ سے جو قرآن شریف و حدیث پڑھنے لگے کیونکہ اس وقت سے مطالعہ پر زور تھا اور اکثر مسائل پر حدیث وغیرہ پر۔ میرے چھوٹے ماموں جان سے گھر پر بھی باتیں ہوتی تھیں۔ ان کی توجہ علمِ دین کی طرف ہی رہی مگر یہ نہیں کہ ہر وقت لگے ہی رہیں۔ میز پر قرآن شریف، عربی کی کتابیں، لُغت وغیرہ کتبِ حدیث اور ایک انجیل بھی ضرور رکھی رہتی تھی۔ اسی طرح شیعوں کے مراثی اور کتابیں مختلف مذاہب کی ہوں گی ضرور، مگر میں نے انجیل پڑھ کر دیکھی کچھ حصہ اور مرثیے پڑھے، وہ یاد ہے۔ انیسؔ اور دبیرؔ بھی اُن کے پاس تھے۔ کوئی خاص وقت پڑھائی کا باہر صَرف بھی نہیں کرتے تھے اور اندر بھی پڑھتے ضرور تھے مگر اتنا نہیں کہ دن رات جیسے لڑکے سر کھپاتے ہیں، ان کو تو اللہ تعالیٰ نے خود ہی اپنے فضل سے پڑھا دیا۔

اکثر آشوبِ چشم بھی ہوجاتا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے پڑھائی کے لئے کبھی بھی نہیں کہا کہ محنت کرو وغیرہ مگر ابتدائسے اپنی دینی کُتب قرآن مجید، حدیث اور دیگر مذاہب کی کتابیں اور الف لیلہ بھی، مجھے بھی چھوٹی چھوٹی کہانیاں الف لیلہ کی بھی سُنا دیتے تھے۔ دیوانِ غالب وغیرہ اور آپ کے استاد (جن سے کچھ عرصہ اصلاح لی تھی شاعری کے سلسلہ میں) جلال لکھنوی کے دیوان بھی آپ کے پاس تھے۔ میری ہوش میں بہت کم عمری سے میں نے بڑے بھائی (حضرت مصلح موعودؓ) کا کمرہ الگ دیکھا جس میں کتابیں رکھی رہتی تھیں میز پر، میں بھی وہاں جا پہنچتی تھی آپ گھر میں کھیلتے تھے۔ اکثر وقت پا کر جو خالی صحن ہو، اس میں گیند بلا وغیرہ اور اس کے علاوہ گھر کے باہر آپ کے مشاغل غلیل سے نشانہ بازی، کشتی چلانا تیرنا وغیرہ تھے۔ مٹی کے غلّے بنانے میں ہم سب شریک ہو جاتے مگر گھر میں نہیں چلاتے تھے۔ یہ کام باہر ہوتا تھا۔ گھر میں تو کبھی نشان لگا کر غلیل چلا کر دیکھ لیا اور اس سے ذرا بڑے ہوئے تو سواری سیکھی اور گھوڑے کی سواری کو بہت پسند کرتے تھے۔

آپ ہم بچوں سے بہت پیار کرنے والے بے حد خیال رکھنے والے تھے، مجھے تو خاص طور پر بہت محبت کی۔ بہت ناز اُٹھاتے۔ کبھی خفا ہونا یاد میں نہیں۔ ایک بار لڑکیوں کے ساتھ میں کھیل رہی تھی۔ لڑکیوں نے کوئی کھیل تالی بجانے والا کھیلا۔ میں بھی بجانے لگی تو مجھے کہا کھیلو مگر تم نہ کبھی تالی بجانا۔ یہ لوگ بجایا کریں۔

مبارک سے بھی بہت پیار کا سلوک تھا (ایک خط میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے میرے میاں کو لکھا ہے محمود اپنی والدہ سے بہت مانوس ہے اور مبارک سے بھی اب تک کھیلتا ہے۔ ابھی بچہ ہی ہے) دوسرے بھائیوں سے بھی کبھی میں نے سختی کا سلوک یا جھگڑا نہیں دیکھا۔ منجھلے بھائی صاحب سے تو اکثر لمبی باتیں کرتے مگر ہر وقت اچھے موضوع پر، میرے بھائی اور ماموں مل کر باتیں کرتے تھے۔ کبھی فضول بات میں نے

نہیں سُنی کیونکہ جہاں یہ سب مل کر بیٹھتے ہیں ضرور جا پہنچتی تھی کئی بار ہنس کر فرماتے تھے کہ

لڑکی وہ جو لڑکیوں میں کھیلے
نہ کہ لڑکوں میں ڈنٹر پیلے

مجھ سے بچپن سے بے تکلف رہے۔ ہر بات مجھ سے کر لیتے اور میں ہر بات جو نئی سُنی یا مجھ سے باہر ہُوئی اُن سے پوچھتی۔ میری کھُل کر بات یا حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے ہوتی تھی یا بڑے بھائی حضرت مصلح موعود سے۔ حضرت مسیح موعود بھی جانتے تھے کہ ہم دونوں کا آپس میں زیادہ پیار اور بے تکلفی ہے تو آپ نے بھی تین چار بار کہا محمود کچھ چُپ چُپ ہے کبھی حاجت نہیں ظاہر کرتا نہ مانگتا ہے تم پوچھو تو سہی کہ کیا چاہیئے میں نے پوچھا اور آپ نے بتا دیا۔ یہ میں لکھ چکی ہوں پہلے کبھی۔ ایک بار بخاری کی جلدوں کا پُورا سیٹ منگانے کیلئے کہا تھا۔ ایک بار سول اخبار جاری کروانے کو ایک دفعہ بھائی جان کو لاہور گئے زیادہ دن ہو گئے تھے، کہا "میں اُن کا لاہور زیادہ رہنا پسند نہیں کرتا بُلوا لیں"۔

ہم لوگ لڑتے نہیں تھے۔ کم از کم بہنوں سے لڑنے کی تو قسم ہی ہمارے ہاں تھی۔ مبارک احمد اور میں چھوٹے تھے۔ تینوں بھائیوں نے کبھی کچھ نہیں کہا۔ آپس میں منجھلے بھائی کبھی تکیوں سے لڑائی گویا مصنوعی جنگ کیا کرتے تھے یا چھوٹے بھائی صاحب کو منجھلے بھائی صاحب چڑاتے تھے وہ چڑتے مگر اس سے زیادہ ہرگز نہیں۔ نہ مار نہ کٹائی۔ ایک بار کوڑا چھپا کی کھیلتے ہُوئے مبارک کی پیٹھ پر کوڑا زور سے مار دیا، وہ نازک سا بچہ تھا رونے لگا۔ مجھے آج تک افسوس ہے اپنی اس حرکت کا کہ میں نے پُکار کر حضرت مسیح موعودؑ کو کہا کہ مبارک کو چھوٹے بھائی نے زور سے کوڑا مار دیا۔ تو آپ چھوٹے بھائی پر بہت خفا ہوئے تھے ... مگر میں نے تو بڑے بھائی کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی مانند محبت کرنے والا پایا۔ ذرا بڑے ہو کر یہ محبت ایک دوستی کا رنگ بھی اختیار کر گئی"۔

اس کے بعد حضرت صاحبزادی سیدہ نواب مبارکہ بیگم صاحبہ کے ایک اور طبع شدہ مضمون سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں:

"سب بہن بھائیوں سے بڑھ کر اپنے پیار سے مجھے شرف بخشا... بچپن سے انہوں نے مجھ سے خاص محبت کی۔ ہمیشہ میرا خیال رکھا۔ کئی آڑے وقتوں میں میری مدد کی... بچپن میں تو غلطیاں بھی ہوتی ہیں۔ کبھی بڑے بھائی بہنوں کو جھڑک جھڑک بھی لیتے ہوں گے مگر یہاں تو محض پیار اور نازبرداری ہی تھی۔ ایک دفعہ بھی کبھی ٹیڑھی نظر سے نہ دیکھا۔ میرا بھی یہ حال تھا کہ ہر بات پر شکایت یا ابا سے' یا بڑے بھائی سے کرتی۔ میں بہت چھوٹی تھی آپ باہر ڈھاب (جوہڑ) میں کشتی چلانے گئے ہوئے تھے۔ دو لڑکے آئے اور کہا کہ میاں ٹب مانگ رہے ہیں۔ ٹب دے دیا گیا اور میں نے اس وقت اپنی زندگی میں پہلا شعر کہا۔ جب آئے تو خوشی سے لپٹ کر کہا' بڑے بھائی! میں نے تمہارے لئے شعر بنایا ہے۔ (اس وقت اس عمر میں ہم شعر کہتے نہیں تھے بلکہ بناتے تھے) فرمایا بتاؤ بتاؤ کیا؟ میں نے بڑے فخر سے سنایا کہ ؎

ٹب لینا تھا ٹب لے گئے = کشتی چلانی تھی کشتی چلا گئے

اس کو یاد کر کے اب تک ہنسا کرتے تھے۔ ایک دفعہ میرے اُستاد پیر منظور محمد صاحبؓ مرزا افضل بیگ صاحب سے گراموفون مانگ لائے اور ریکارڈ چلانے لگے۔ میں چھوٹی تھی اور وہ عجیب سے اشعار میرے لئے نئی چیز تھے۔ میں نے کہا پیرجی! میری کاپی پر یہ شعر لکھ دو۔ انہوں نے بے خیالی میں لکھ دیا۔ ایک مصرعہ مجھے یاد ہے ع

ستم سے باز آ ظالم قیامت آنیوالی ہے

مَیں فوراً بھاگی اور آ کر بڑے بھائی کو دکھایا کہ یہ پیرجی سے لکھوا کر لائی ہوں۔ میرے ہاتھ سے کاپی لی اور وہیں کھڑے کھڑے کاپی پر لکھ دیا ؎

اگر لایا کئے ایسی گھروں کو کاپیاں بچے
تو حضرت آپ کی اک روز شامت آنیوالی ہے

اور کہا اب جا کر یہ پیرجی کو دکھا دو۔ اُن دنوں وہ گول کمرے میں ہمارے ہاں ہی رہتے تھے۔ میں نے جا کر دکھا دیا۔ پیرجی نے کہا توبہ! توبہ!! لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّابِاللّٰہِ مجھ سے بڑی غلطی ہوگئی اور چاک کرنے لگے۔ میں نے اُن کو کہا اپنے شعر کو پھاڑ دو پر بڑے بھائی کا شعر نہیں پھاڑنے دوں گی۔

غرض بڑے بھائی صاحب سے بہت مانوسیت تھی اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو بھی علم تھا کہ میں اُن سے اور وہ مجھ سے بہت مانوس اور بے تکلف ہیں۔ آپ اب بڑے ہو چکے تھے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے بچپن کی بے تکلفی سے کچھ طلب نہ کرتے تھے۔ ویسے بھی سوال کرنا آپ کو ناپسند تھا مگر وہاں تو ادب کا بھی حجاب تھا۔ چند بار مجھے ہی حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے کہا کہ محمود کچھ خاموش اور اداس ہے تم کو بتائے گا۔ تم بھائی سے پوچھو کس چیز کی ضرورت ہے۔ دو تین بار کا تو مجھے ٹھیک یاد ہے۔ ایک دفعہ تو میرے پوچھنے پر کہا تھا "کہنا بخاری منگا دیں"۔ پھر کئی جلدوں میں سُرخ جلدیں تھیں، بہت سے پارے بخاری شریف کے آئے تھے۔ ایک بار اسی طرح آپؑ کے فرمانے پر میں نے پوچھا تو کہا سولِ اخبار میرے نام جاری کرا دیں۔ وہ بھی ہوگیا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو آپ سے واضح طور پر بہت محبت اور آپ کی بہت قدر تھی۔ اس کم عمری میں بھی مجھ پر یہ اثر تھا کہ مبارک چھوٹا ہے اور میں لڑکی ہوں اس لئے زیادہ خیال میرا رکھتے اور مبارک سے زیادہ پیار کرتے ہیں مگر اصل میں سب سے زیادہ میرے ابا کو پیارے میرے بڑے بھائی ہیں۔ شادی کے بعد جب میں آتی، میری آواز سُن کر یا معلوم کر کے کہ مَیں آئی ہوئی ہوں فوراً تشریف لے آتے۔ جو بات نئی میری غیر حاضری میں ہوتی مجھے ضرور سُناتے۔ اپنے اشعار بالعموم پہلے مجھے سُناتے۔ دو تین بار مصرعہ میں نے لگا دیا اس کو پسند کیا اور شامل کر لیا۔ ایک بار جب آپ کے اشعار کا پہلا مجموعہ "کلامِ محمود" شائع ہُوا، مجھ سے پُوچھا ٹھیک ٹھیک

بتاؤ تم کو میرا کون سا شعر سب سے زیادہ پسند ہے؟ میں نے کہا ؎

حقیقی عشق گر ہوتا تو سچی جستجو ہوتی
تلاشِ یار ہر ہر دیہہ میں ہوتی کو بہ کو ہوتی

پہلی شادی

حضرت مسیح موعود علیہ السلام پسند فرماتے تھے کہ نوجوانی کی عمر کو پہنچتے ہی بچّہ کی شادی کر دینی چاہیئے۔ چنانچہ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیرالدین محمود احمد صاحب کی عمر ابھی تیرہ برس کی تھی کہ آپ نے ۱۹۰۲ء میں اپنے ایک مخلص مُرید محترم ڈاکٹر خلیفہ رشیدالدین رضی اللہ عنہ کو تحریک فرمائی کہ وہ اپنی بڑی لڑکی رشیدہ بیگم (جن کا حضرت اُمّ المومنین رضی اللہ عنہا نے محمودہ بیگم نام رکھ دیا تھا اور جو بعد ازاں حضرت اُمِّ ناصر کے نام سے مشہور ہُوئیں) کا رشتہ حضرت صاحبزادہ صاحب کے ساتھ کرنے کے بارہ میں غور کریں۔ اس سلسلہ میں آپؑ نے محترم ڈاکٹر صاحبؓ کو لکھا:

"اس رشتہ پر محمود راضی معلوم ہوتا ہے اور گو الہامی طور پر اس بارہ میں کچھ معلوم نہیں جس کے معلوم ہونے کے بارہ میں مجھے خواہش ہے تاکہ کوئی کام ہمارا مرضی الٰہی کے خلاف نہ ہو مگر محمود کی رضامندی ایک دلیل اس بات پر ہے کہ یہ امر غالباً وَاللّٰہُ اَعْلَمُ جناب الٰہی کی رضامندی کے موافق انشاء اللہ ہوگا۔ لہٰذا آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ اگر خدا تعالیٰ کی یہ مرضی ہو اور اس میں کوئی مخالفت نہ پائی جائے جس کے مقابل پر سب ارادے کالعدم ہو جاتے ہیں تو اس صُورت میں اور اس شرط سے آپ تیار اور مستعد رہیں کہ جب آپ کو مسنون طور پر نکاح کے لئے لکھا جائے چند ہفتہ تک استخارہ کریں کہ ہر ایک کام جو استخارہ اور خدا تعالیٰ کی مرضی سے کیا جاتا ہے وہ مبارک ہوتا ہے۔ دوسرے میرا ارادہ یہ ہے اس نکاح میں انبیاء کی سُنّت کی طرح سب کام ہو۔ بدعت اور بے ہُودہ مصارف اور لغو رسوم اس نکاح میں نہ ہوں بلکہ ایسے سیدھے سادھے طریق پر ہو جو خُدا کے پاک نبیوں نے پسند فرمایا

ہے نکاح ہو جاوے تو موجبِ برکات ہو"۔[1]

محترم ڈاکٹر صاحب کے رشتہ داروں نے جو احمدی نہیں تھے اس رشتہ کی مخالفت کی لیکن ڈاکٹر صاحب نے بلا تامل اس مبارک تعلق پر رضامندی کا اظہار کر دیا۔ ان دنوں ڈاکٹر صاحب رڑکی ضلع سہارنپور (یو۔پی) میں متعین تھے۔ وہیں نکاح کی تقریب کا منعقد ہونا طے پایا۔ چنانچہ صاحبزادہ مرزا محمود احمد صاحب، حضرت مولوی نور الدین صاحب رضؓ حضرت میر ناصر نواب صاحبؓ، حضرت میر محمد اسماعیل صاحبؓ اور چند اور بزرگوں اور دوستوں کے ہمراہ ۲ راکتوبر ۱۹۰۲ء کی شام کو رڑکی پہنچے۔ اسٹیشن پر ڈاکٹر صاحب نے اپنے بہت سے دوستوں کے ساتھ استقبال کیا۔ حضرت مولوی نور الدین صاحبؓ نے ایک ہزار روپیہ حق مہر پر نکاح پڑھا اور ۵ راکتوبر کو بعد نماز عصر یہ قافلہ رڑکی سے بخیریت واپس قادیان پہنچا۔ مغرب کی نماز کے بعد جب کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام حسبِ معمول شہ نشین پر تشریف فرما ہوئے تو حضرت مولوی نورالدین صاحب نے تقریب نکاح پر مبارک دی اور ڈاکٹر صاحب کے اخلاص کی تعریف کی۔ حضورؑ نے اظہارِ خوشنودی کرتے ہوئے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت اخلاص دیا ہے، ان میں اہلیت اور زیرکی بہت ہے اور میں نے دیکھا ہے اُن میں نُورِ فراست بھی ہے"۔[2]

رُخصتانہ کی تقریب دوسرے سال ۱۹۰۳ء میں اکتوبر کے دوسرے ہفتے آگرہ میں منعقد ہُوئی۔ اِن دنوں محترم ڈاکٹر صاحب آگرہ میڈیکل کالج میں پروفیسر تھے۔ ۱۱ راکتوبر ۱۹۰۳ء کو برات واپس قادیان پہنچی، اگلے دن حضورؑ کے گھر سے اس خوشی میں بتاشے تقسیم کئے گئے۔[3]

بمبئی سے سیٹھ محمد اسماعیل آدم صاحبؓ نے تقریبِ شادی کے موقع پر ایک ٹوپی اور اوڑھنی کا تحفہ بھیجا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے تحفہ بھیجنے پر محترم سیٹھ صاحب کو شکریہ کا خط لکھا جس میں آپ نے تحریر فرمایا:۔

"آپ کا محبت و اخلاص کا تحفہ جو آپ نے برخوردار محمود اور بشیر کی کی شادی کی تقریب پر بھیجا ہے یعنی ایک ٹوپی اور ایک اوڑھنی، پہنچ گیا ہے۔ میں آپ کے اس محبانہ تحفہ کا شکر کرتا ہوں اور آپ کے حق میں دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو دین اور دُنیا میں اس کا اجر بخشے۔ آمین"[4]

---

[1] تاریخ احمدیت جلد ۳ صفحہ ۲۳۱ [2] الحکم ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۲ء [3] الفضل ۴ جولائی ۱۹۲۴ء [4] مکتوباتِ احمد جلد ۵ صفحہ ۲۱۸

۱۹۰۶ء میں اللہ تعالیٰ نے حضرت صاحبزادہ صاحب کو پہلا فرزند عطا فرمایا جس کا نام نصیر احمد رکھا گیا۔ صاحبزادہ مرزا نصیر احمد چھوٹی عمر میں ہی فوت ہو گئے اور لاہور میں تدفین عمل میں آئی[1]

نومبر ۱۹۰۹ء میں آپ کے ہاں دوسرے فرزند صاحبزادہ مرزا ناصر احمد تولد ہوئے۔ اس ولادت کے مبارک ہونے کی بشارت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو پہلے ہی مل چکی تھی چنانچہ آپ نے اپنے ۲۶ ستمبر ۱۹۰۹ء کے ایک خط میں لکھا:

"مجھے بھی خدا تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ میں تجھے ایسا لڑکا دوں گا جو دین کا ناصر ہوگا اور اسلام کی خدمت پر کمربستہ"[2]

یہ خوشخبری اپنی پوری شان سے اس وقت پوری ہوئی جب اس رویا کے چھپن ۵۶ برس بعد ۱۹۶۵ء میں اللہ تعالیٰ نے حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب کو منصبِ خلافت پر سرفراز فرمایا۔

---

[1] تاریخِ احمدیت جلد ۳ صفحہ ۴۷۹ و جلد ۵ صفحہ ۴،

[2] "بدر" قادیان ۱۸ نومبر ۱۹۰۹ء و تاریخِ احمدیت جلد ۳ صفحہ ۳۲۰

اپنے عظیم باپ کی صداقت پر آپ کا ایمان اور اس کے نتائج

حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد کی آئندہ زندگی کا رُخ معین کرنے کے لئے بہت سے اسباب کارفرما تھے۔ جو ظاہری بھی تھے اور باطنی بھی، عمومی بھی تھے اور خصوصی بھی ایسے عوامل میں سے جو عمومی حیثیت رکھتے ہیں اور بچے کی شخصیت کی تعمیر پر لازماً نہایت گہرے رنگ میں اثرانداز ہوتے ہیں ایک نہایت اہم عامل کا اب ہم جائزہ لیں گے جس نے آپ کی شخصیت کی تعمیر میں ایک ناقابلِ فراموش اور نہایت اہم کردار ادا کیا۔

سوائے اس کے کہ بچہ نہایت کُند ذہن ہو کوئی ماں باپ اپنے بچے سے اپنی اندرونی شخصیت کو چھپا نہیں سکتے۔ خواہ وہ شخصیتیں لاکھ جعل اور فریب کے پردوں میں لپٹی ہوئی کیوں نہ ہوں اور یہ امر بھی قطعی اور ناقابلِ تردید ہے کہ بچے کے خیالات کا رُخ معین کرنے اور اس کی اندرونی شخصیت کے خدوخال بنانے میں سب سے اہم کردار اس کے ماں باپ کی وہ اندرونی تصویر ادا کرتی ہے جو خود اس کے دل و دماغ پر بنتی چلی جاتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں نفسیاتی الجھنیں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ اسی کے نتیجہ میں ذہنی بغاوتیں بھی جنم لیتی ہیں اور اسی کے نتیجہ میں اعلیٰ مقاصد کی پیروی میں سرتاپا وقف مخلص اور صادق القول شخصیتیں بھی اُبھرتی ہیں۔ غرضیکہ نیکی اور بدی میں نمایاں کردار ادا کرنے والوں کے نفسیاتی پس منظر کا اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ کہنا مبالغہ آمیز نہ ہوگا کہ اُن کے والدین کے متعلق اُن کی رائے کو ان کے کردار کے بگاڑنے یا بنانے میں گہرا دخل ہوتا ہے جو رائے غیر شعوری طور پر لمبے تجربات اور محسوسات کے نتیجہ میں از خود ان کے دل و دماغ میں قائم ہوتی چلی جاتی ہے اور اس رائے کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی منفی یا مثبت جذباتی تحریکات اس کی اپنی شخصیت کو اس طرح ڈھالتی چلی جاتی ہیں جیسے کمہار کے ہاتھ میں گُندھی ہوئی مٹی ڈھلتی ہے۔

ہمیں تسلیم ہے کہ یقیناً یہ شخصیتوں کی تعمیر و تخریب کا واحد سبب نہیں اور ہم باخبر ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے وسیع کارخانہ مشیت میں اَن گنت اسباب اور محرکات نامعلوم طور پر اپنا اپنا کام کر رہے ہیں جو کچھ انسان کے محدود علم کے احاطہ میں داخل ہے، اسے دیکھتے ہوئے ہم مذکورہ بالا ایک سبب کو اگر سب

دوسرے ظاہری اسباب سے قوی تر قرار دیں تو ہرگز مبالغہ نہ ہوگا۔

اس زاویہ نگاہ سے حضرت صاحبزادہ صاحب کی شخصیت کا جائزہ لیں تو یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ آپ اپنے والد کو گہرے اندرونی مشاہدہ کے بعد اور لمبے عرصہ پر پھیلے ہوئے ظاہر و باطن آثار کے مطالعہ کے نتیجہ میں مخلص، صادق القول اور حق پرست یقین کرتے تھے اور اس یقین کے نتیجہ میں جس قسم کے مثبت اثرات آپ کی شخصیت پر مترتب ہونے چاہیئے تھے وہ اسی طرح مترتب ہوئے۔

اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ اسی مقصد کے لئے ہمہ تن وقف ہوگئے جس کے حصول کی خاطر آپ کے عظیم باپ کا ایک ایک لمحہ وقف تھا۔ آپ نے اس راہ میں اسی طرح جانی اور مالی اور جذباتی قربانیاں دیں جسطرح جلیل القدر باپ زندگی بھر دیتا رہا اور اسی طرح اس راہ میں دُکھ پر دُکھ جھیلے اور مشقتوں پر مشقتیں اٹھائیں۔ غرضیکہ وہ تمام آثار اس کے فکر و عمل میں ظاہر ہوئے جو قوی یقین اور پختہ ایمان کے بغیر ظاہر نہیں ہو سکتے۔

ظاہر ہے کہ وہ بچپن کا زمانہ جو کسی سوانح نگار کے دمِ تحریر سے ستر برس پیچھے رہ چکا ہو۔ اس کے تمام خدّوخال تو کیا، اُن کے ایک حصہ کو بھی از سرِ نو اُجاگر کرنا کوئی آسان امر نہیں۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ مختلف راویوں اور مضمون لکھنے والوں نے جو آپ کے بچپن کے ساتھی تھے، مختلف وقتوں میں مختلف واقعات پر روشنی ڈالی ہے لیکن نہ تو اُن کا حضرت مرزا محمود احمد سے ملاپ کا زمانہ آپ کے تمام بچپن پر حاوی ہو سکتا تھا نہ ہی اُن کی یادداشت از سرِ نو ہر نقش کو اُجاگر کر سکتی تھی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ہمیں بار بار خود حضرت مرزا محمود احمد صاحب کے اُن بیانات اور فرمودات کا سہارا لینا پڑتا ہے جو آپ نے اپنی بڑی عمر کے زمانہ میں کسی مضمون کے تعلق میں بیان کئے۔ یہ بیانات چونکہ خود اپنی صداقت کی اندرونی شہادتیں لئے ہوتے ہیں۔ لہٰذا کسی اہلِ بصیرت اور صاحبِ فراست انسان کے لئے اُن کی صداقت پر شک کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ نمونہ کے طور پر دو واقعات پیش ہیں۔ ایک چھوٹا سا سادہ سا واقعہ ہے جو بہت بچپن کا معلوم ہوتا ہے اور دوسرا نسبتاً پختہ عمر یعنی عنفوانِ شباب کا واقعہ معلوم ہوتا ہے۔

پہلے کی اہمیّت اس کی سادگی اور تصنّع سے پاک معصومانہ بیان میں ہے اور دُوسرے کی اہمیّت اس بنا پر بڑی بھاری ہے کہ ایک خطرناک اور اچانک بُحران کے وقت حضرت صاحبزادہ صاحب کے فوری اور بے ساختہ ردِّعمل کا اس میں ذکر ہے اور اس سے بھی بڑھ کر قابلِ غور اور انمول وہ تبصرہ ہے جو آپ نے ایک عجیب محویّت کے عالم میں ڈوب کر خود اس واقعہ پر کیا ہے۔

پہلا واقعہ یوں ہے:

"میری عمر جب نو یا دس برس کی تھی۔ میں اور ایک اور طالب علم گھر میں کھیل رہے تھے۔ وہیں الماری میں ایک کتاب پڑی ہوئی تھی جس پر نیلا جزدان تھا اور وہ ہمارے دادا صاحب کے وقت کی تھی۔ نئے نئے علوم ہم پڑھنے لگے تھے اس کتاب کو جو کھولا تو اس میں لکھا تھا کہ اب جبرائیل نازل نہیں ہوتا۔ میں نے کہا یہ غلط ہے۔ میرے ابا پر تو نازل ہوتا ہے۔ اس لڑکے نے کہا جبرائیل نہیں آتا، کتاب میں لکھا ہے۔ ہم میں بحث ہوگئی۔ آخر ہم دونوں حضرت صاحب کے پاس گئے اور دونوں نے اپنا اپنا بیان پیش کیا۔ آپ نے فرمایا۔ کتاب میں غلط لکھا ہے۔ جبرائیل اب بھی آتا ہے۔"[1]

دوسرا واقعہ یوں ہے:-

"بیوقوفی کے واقعات میں مجھے بھی اپنا ایک واقعہ یاد ہے۔ کئی دفعہ اس واقعہ کو یاد کر کے میں ہنسا بھی ہوں اور بسا اوقات میری آنکھوں میں آنسو بھی آگئے ہیں۔ مگر میں اسے بڑی قدر کی نگاہ سے بھی دیکھا کرتا ہوں اور مجھے اپنی زندگی کے جن واقعات پر ناز ہے، اُن میں وہ ایک حماقت کا واقعہ بھی ہے وہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانے میں ایک رات ہم سب صحن میں سو رہے تھے۔ گرمی کا موسم تھا کہ آسمان پر بادل آیا۔ اور زور سے گرجنے لگا۔ اسی دوران میں قادیان کے قریب ہی کہیں بجلی گر گئی۔ مگر اس کی کڑک اس زور کی تھی کہ قادیان کے ہر گھر کے لوگوں نے یہ سمجھا کہ یہ بجلی شاید اُن کے گھر میں ہی گری ہے.... اس کڑک اور کچھ بادلوں کی وجہ سے تمام لوگ کمروں میں چلے گئے۔ جس وقت بجلی کی یہ کڑک ہوئی، اس وقت ہم بھی جو صحن میں سو رہے تھے، اُٹھ کر اندر چلے گئے۔ مجھے آج تک وہ نظارہ یاد ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام جب اندر کی طرف جانے لگے تو میں نے اپنے دونوں ہاتھ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے سر پر رکھ دیئے کہ اگر بجلی گرے تو مجھ پر گرے، ان پر نہ گرے۔ بعد میں جب میرے ہوش ٹھکانے آئے تو مجھے اپنی اس حرکت پر ہنسی آئی کہ ان کی وجہ سے

---

[1] الحکم جوبلی نمبر دسمبر ۱۹۳۹ء صفحہ ۶۶

تو ہم نے بجلی سے بچنا تھا نہ یہ کہ ہماری وجہ سے وہ بجلی سے محفوظ رہتے
میں سمجھتا ہوں میری وہ حرکت ایک مجنون کی حرکت سے کم نہیں
تھی۔ مگر مجھے ہمیشہ خوشی ہوا کرتی ہے کہ اس واقعہ نے مجھ پر بھی اس
محبت کو ظاہر کر دیا جو مجھے حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے تھی۔
بسا اوقات انسان خود بھی نہیں جانتا کہ مجھے دوسرے سے کتنی محبت ہے
جب اس قسم کا کوئی واقعہ ہو تو اسے بھی اپنی محبت کی وسعت اور اس
کی گہرائی کا اندازہ ہو جاتا ہے تو جس وقت محبت کا انتہائی جوش اٹھتا ہے
عقل اس وقت کام نہیں کرتی۔ محبت پرے پھینک دیتی ہے عقل کو اور
محبت پرے پھینک دیتی ہے فکر کو اور وہ آپ سامنے آجاتی ہے۔"[۱]

اس واقعہ اور اس سے متعلق آپ کے تاثرات کو پڑھ کر اس بارہ میں کسی شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ آپ کو اپنے عظیم باپ کی صداقت پر کتنا گہرا اور پختہ ایمان تھا۔ اور اس کے نتیجہ میں ایسی گہری محبت آپ کی ذات سے اور آپ کی ایسی عظمت آپ کے دل پر قائم تھی کہ اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ گو محبت بھی بچوں کو اپنے باپ سے ہوتی ہے اور بعض والدین کی عظمت کا احساس بھی ان کے بعض بچوں کے دل میں ہوتا ہے، لیکن بیک وقت ایسی شدید محبت اور تقدیس اور عظمت کے ایسے قوی احساس کا امتزاج یقیناً انسانی تجربات میں آئے دن کا مشاہدہ نہیں ہے۔

اس گہرے ایمان اور محبت کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ آپ اسی راہ پر دلی وابستگی اور کامل خلوص کے ساتھ چل پڑے جو غلبۂ اسلام کے جلد تر ظہور کے لئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خود اختیار فرمائی تھی اور اپنی تمام طاقتیں بچپن ہی سے اس راہ میں وقف کر دیں۔ دنیاوی علم کے مقابل پر دینی علم کے حصول میں امتیازی رغبت اسی یقین کامل کا ایک نتیجہ تھا حالانکہ جہاں تک حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی ذاتی توجہ کا تعلق تھا۔ آپ اپنی شبانہ روز شدید مصروفیات کے باعث اپنے کسی بھی بچے کی تعلیم کی طرف ذاتی توجہ نہیں دے سکتے تھے۔ دوسرا گہرا اثر اس ایمان کا یہ ظاہر ہوا کہ بچپن ہی سے آپ کو عبادتِ الٰہی کا ذوق و شوق پیدا ہوا اور کم سنی ہی میں آپ نیم شبی عبادتوں کے عادی ہو گئے۔ متعدد روایات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نماز پنج وقتہ کے علاوہ تہجد کی نماز بھی بالالتزام ادا کیا کرتے تھے اور نماز کی ادائیگی محض رسمی اور ظاہری نہ تھی بلکہ بڑے خشوع و خضوع اور سوز و گداز کی حامل ہوا کرتی تھی

---

[۱] الفضل ۲۵ر جنوری ۱۹۴۰ء

ایک بچے یا نوجوان کا نمازوں میں گریہ وزاری کرنا اور سجدوں میں دیر تک پڑے رہنا یقیناً بڑوں کے لئے باعثِ تعجب ہوتا ہے۔ خصوصاً اس وقت جبکہ ایسے بچے کو کوئی ظاہری صدمہ نہ پہنچا ہو اور فکر کی کوئی دوسری وجہ بھی نظر نہ آئے یہ تعجب اور بھی بڑھ جاتا ہے اور دل میں سوال اٹھتا ہے کہ آخر اس بچے پر کیا بیتی ہے جو راتوں کو چھپ چھپ کر اٹھتا اور بلک بلک کر اپنے رب کے حضور روتے ہوئے اپنے معصوم آنسوؤں سے سجدہ گاہ کو تر کر دیتا ہے !

یہی تعجب شیخ غلام احمد صاحب واعظ رضی اللہ عنہ کے دل میں بھی پیدا ہوا جو ایک نومسلم تھے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ہاتھ پر اسلام میں داخل ہوئے تھے اور اخلاص اور ایمان میں ایسی ترقی کی کہ نہایت عابد و زاہد اور صاحبِ کشف و الہام بزرگوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ :

> "ایک دفعہ میں نے یہ ارادہ کیا کہ آج کی رات مسجد مبارک میں گزاروں گا' اور تنہائی میں اپنے مولا سے جو چاہوں گا' مانگوں گا۔ مگر جب میں مسجد میں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ کوئی شخص سجدے میں پڑا ہوا ہے اور الحاح سے دعا کر رہا ہے۔ اس کے اس الحاح کی وجہ سے میں نماز بھی نہ پڑھ سکا۔ اور اس شخص کی دعا کا اثر مجھ پر بھی طاری ہو گیا۔ اور میں بھی دعا میں محو ہو گیا ' اور میں نے دعا کی کہ یا الٰہی ! یہ شخص تیرے حضور سے جو کچھ بھی مانگ رہا ہے وہ اس کو دے دے اور میں کھڑا کھڑا تھک گیا کہ یہ شخص سر اٹھائے تو معلوم کروں کہ کون ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھ سے پہلے وہ کتنی دیر سے آئے ہوئے تھے مگر جب آپ نے سر اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت میاں محمود احمد صاحب ہیں۔ میں نے السلام علیکم کہا اور مصافحہ کیا اور پوچھا میاں ! آج اللہ تعالیٰ سے کیا کچھ لے لیا ؟ تو آپ نے فرمایا کہ میں نے تو یہی مانگا ہے کہ الٰہی ! مجھے میری آنکھوں سے اسلام کو زندہ کر کے دکھا اور یہ کہہ کر آپ اندر تشریف لے گئے۔"[1]

اسلام کی فتح کا دن دیکھنے کی یہ بے قرار تمنا جو اس نوعمری میں آپ کے دل میں پیدا ہوئی نوعمری ہی میں پھل بھی لانے لگی۔ چنانچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے معصوم دل سے اٹھنے

---

[1] الفضل ۱۶ / فروری ۱۹۶۸ء

والی پاکیزہ دعاؤں کو رحمت اور شفقت کی نظر سے دیکھا اور اس دِل کی تسلّی کے خود انتظامات فرمائے۔ یہ تسلّی رویائے مُبشّرہ کی صورت میں بھی دی گئی اور الہام کی زبان میں بھی اور کشفی رویت کے کے ذریعے بھی۔

حضرت سید سرور شاہ صاحب رضؓ جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ایک جلیل القدر صحابی اور جیّد عالم تھے اور جن کے علم و فضل کا شہرہ دُور دُور تک پھیلا ہُوا تھا اور حضرت صاحبزادہ صاحب کے اساتذہ میں سے تھے، بیان فرماتے ہیں:۔

"حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ مجھ سے پڑھا کرتے تھے تو ایک دن میں نے کہا کہ میاں! آپ کے والد صاحب کو تو کثرت سے الہام ہوتے ہیں۔ کیا آپ کو بھی الہام ہوتا اور خوابیں وغیرہ آتی ہیں؟ تو میاں صاحب نے فرمایا کہ: مولوی صاحب! خوابیں تو بہت آتی ہیں اور میں ایک خواب تو تقریباً روز ہی دیکھتا ہوں اور جونہی میں تکیہ پر سر رکھتا ہوں اس وقت سے لے کر صبح کو اُٹھنے تک یہ نظارہ دیکھتا ہوں کہ ایک فوج ہے جس کی میں کمان کر رہا ہوں اور بعض اوقات ایسا دیکھتا ہوں کہ سمندروں سے گزر کر آگے جا کر حریف کا مقابلہ کر رہے ہیں اور کئی بار ایسا ہُوا ہے کہ اگر میں نے پار گزرنے کے لئے کوئی چیز نہیں پائی تو سرکنڈے وغیرہ سے کشتی بنا کر اور اس کے ذریعہ پار ہو کر حملہ آور ہو گیا ہوں۔ میں نے جس وقت یہ خواب آپ سے سنا اسی وقت سے میرے دل میں یہ بات گڑی ہوئی ہے کہ یہ شخص کسی وقت یقیناً جماعت کی قیادت کرے گا اور میں نے اسی وجہ سے کلاس میں بیٹھ کر آپ کو پڑھانا چھوڑ دیا۔ آپ کو اپنی کرسی پر بٹھاتا اور خود آپ کی جگہ بیٹھ کر آپ کو پڑھاتا۔ اور میں نے خواب سُن کر آپ سے یہ بھی عرض کر دیا تھا کہ میاں! آپ بڑے ہو کر مجھے بھُلا نہ دیں اور مجھ پر بھی نظرِ شفقت رکھیں۔"[1]

بچپن میں آپ کے الہام کے بارہ میں آپ کے ساتھ کھیلے ہوئے ایک پرانے دوست جو بفضلہٖ تعالیٰ تادمِ تحریر زندہ موجود ہیں، بیان فرماتے ہیں:۔

"شاید یہ امر کسی دوسری جگہ شائع شدہ یا ریکارڈ میں آچکا ہو لیکن میں اس

---

[1] الفضل ۱۶؍ فروری ۱۹۶۰ء

کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کو بچپن کے زمانہ میں جب کہ وہ مدرسہ تعلیم الاسلام میں میرے ساتھ پڑھتے تھے۔ آپ نے ذکر فرمایا کہ اُن کو یہ آیت الہام ہوئی ہے:

"جَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ"

اور یہ بھی فرمایا کہ انہوں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی خدمت میں عرض کر دیا تھا کہ یہ یہ الہام مجھے ہوا ہے۔" [1]

نوعمری ہی کے عالم میں اللہ تعالیٰ کی رویت کا شرف بھی آپ کو نصیب ہوا۔ چنانچہ مسجد احمدیہ لنڈن کی تعمیر کے لئے چندہ کی تحریک کرتے ہوئے ایک خطبہ جمعہ کے دوران اس رویتِ الٰہی کا ذکر کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں:۔

"مجھے آج تک تین اہم معاملات میں خدا تعالیٰ کی رویت ہوئی ہے۔ پہلے پہل اس وقت کہ ابھی میرا بچپن کا زمانہ تھا۔ اس وقت میری توجہ کو دین کے سیکھنے اور دین کی خدمت کی طرف پھیرا گیا اس وقت مجھے خدا نظر آیا اور مجھے تمام نظارہ حشر ونشر کا دکھایا گیا۔ یہ میری زندگی میں بہت بڑا انقلاب تھا۔" [2]

معلوم ہوتا ہے کہ خود حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام کو بھی یہ احساس تھا کہ اس بچے کے ساتھ خدا تعالیٰ کا خاص تعلق اس کم عمری کے زمانہ ہی میں شروع ہو چکا ہے چنانچہ خود حضرت مرزا محمود احمد صاحب بیان فرماتے ہیں کہ:۔

"جن دنوں کلارک کا مقدمہ تھا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اَوروں کو دُعا کے لئے کہا تو مجھے بھی کہا کہ دُعا اور استخارہ کرو۔ میں نے اسوقت رویا میں دیکھا کہ ہمارے گھر کے ارد گرد پہرے لگے ہوئے ہیں۔ میں اندر گیا جہاں سیڑھیاں ہیں وہاں ایک تہ خانہ ہوتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ حضرت صاحبؑ کو وہاں کھڑا کرکے آگے اُپلے چن دیئے گئے ہیں اور اُن پر مٹی کا تیل ڈال کر کوشش کی جارہی ہے کہ آگ لگا دیں۔ مگر جب دیا سلائی سے آگ لگاتے ہیں تو آگ

---

[1] روایت حضرت مرزا احمد بیگ صاحب [2] الفضل ۲۲ رجنوری ۱۹۲۰ء

نہیں لگتی۔ وہ بار بار آگ لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر کامیاب نہیں ہوتے۔ میں اس سے بہت گھبرایا۔ لیکن جب میں نے اس دروازے کی چوکھٹ کی طرف دیکھا تو وہاں لکھا تھا کہ :

"جو خدا کے بندے ہوتے ہیں اُن کو کوئی آگ نہیں جلا سکتی" لہ

لہ الفضل ۱۶ر فروری ۱۹۶۸ء

پُرہول اور پُرخطر فضاؤں تلے

حضرت صاحبزادہ مرزا محمود احمد صاحب کی ابتدائی زندگی کے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے آپ ایک مرتبہ پھر ذرا اس بالائی سطح کے منظر پر بھی ایک نظر ڈالیں جس پر حضرت مرزا صاحب علیہ السلام اور آپ کے مخلص متبعین ایک عظیم جہاد میں مصروف تھے۔ اس سطح کی فضا بڑی طوفان خیز، متموّج اور متلاطم تھی گویا ایک شورِ قیامت بپا تھا۔

تعارفی باب میں قبل ازیں یہ ذکر گزر چکا ہے کہ حضرت اقدس مرزا غلام احمد علیہ السلام نے اسلام کی تائید میں تمام مدِمقابل مذاہب کے ساتھ زبردست قلمی اور لسانی جہاد شروع کرکے اُن کی دشمنی تو پہلے ہی مول لے رکھی تھی۔ اب جب یہ دعویٰ کیا کہ پہلے مسیح فوت ہو چکے ہیں اور اُمّتِ محمدیہ میں نازل ہونے والا مسیح مَیں ہی ہوں تو مسلمان بھی آپ کے شدید دشمن ہو گئے بلکہ اس دشمنی میں غیروں پر بازی لے جانے لگے۔ تب آپ کے خلاف بَرِّصغیر پاک و ہند میں مخالفت کی ایک ایسی خوفناک آگ بھڑکائی گئی جس نے تمام بَرِّصغیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور کیا ہندو اور کیا مسلمان بلاتمیز مذہب و ملّت سبھی اس آگ میں بُغض و حسد کا ایندھن جھونکنے لگے۔ آپ کی مثال ایک ایسے جرنیل کی سی تھی جو دشمنوں کے نرغے میں پھنس کر جوکھی لڑائی لڑ رہا ہو جس کے سامنے بھی دشمن ہو اور پیچھے بھی، دائیں بھی ہو اور بائیں بھی۔ یہاں تک کہ اس قلعے کی فصیل کے اندر بھی دشمن ہوں جس کی حفاظت کی خاطر اس نے چند مُٹھی بھر جانثاروں کے ساتھ سَردھڑ کی بازی لگا رکھی ہو۔

اس جنگ میں کوئی توازن نہ تھا اور ہر سبب جو مددگار ہو سکتا تھا بظاہر دشمن کے ساتھ تھا۔ یہاں تک کہ اس امر پر بھی دشمن کے ہر کیمپ کا سو فیصدی اتفاق تھا کہ خدا بھی اس شخص کے ساتھ نہیں۔ اگرچہ یہ امر وہ طے نہ کر پاتے تھے کہ پھر اُن میں سے خدا کس کے ساتھ ہے۔ ویسے ہر ایک کا زعم اپنی اپنی جگہ یہی تھا کہ خدا بس اسی کے کیمپ میں رونق افروز ہے۔ یہ سبھی کہتے تھے کہ اور کسی کے ساتھ ہو یا نہ ہو، مرزا صاحب کے ساتھ تو خدا بہر حال نہیں۔ بلکہ اُن کا تو وہ ایسا دشمن ہے کہ آج نہیں تو کل سخت عبرتناک سزائیں دے کر اُن کو اور اُن کے سلسلہ کو اپنے بے پناہ غضب کی چکی میں پیس ڈالے گا اور خاک تک ہواؤں میں اس طرح بکھیر دے گا کہ ڈھونڈے سے تاریخ دان کو ان کا نشان نہ ملے۔

دشمن کی خواہش بھی یہی تھی اور ارادے بھی یہی تھے۔ چنانچہ مسلمان علماء میں سے مولوی ثناء اللہ صاحب جو آپ کے دشمنوں کی صفِ اوّل میں تھے' اس خواہش کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

> "مسلمانوں سے ہو سکے تو مرزا صاحب کی کل کتابیں سمندر میں نہیں کسی جلتے تنور میں جھونک دیں۔ اسی پر بس نہیں بلکہ آئندہ کوئی مسلم یا غیر مسلم مورخ تاریخ ہند یا تاریخ اسلام میں اُن کا نام تک نہ لے"[1]

اگرچہ ہندوؤں، سکھوں، مسلمانوں اور عیسائیوں کے دیرینہ اختلافات اپنی جگہ پر تھے لیکن اس "مشترک دشمن" کے عناد نے متحارب گروہوں کو بھی ایک قسم کی وقتی وحدت عطا کر دی تھی۔

خلاصۂ کلام یہ کہ صاحبزادہ مرزا محمود احمد صاحب کا بچپن جس بالا فضا کے سایہ تلے پروان چڑھ رہا تھا وہ شدید مخالفت کے تاریک بادلوں کے اجتماع کے باعث برق و رعد کا ایک دل ہلا دینے والا منظر پیش کر رہی تھی۔ اس میں تہہ بہ تہہ ظلمتیں بھی تھیں اور پے بہ پے بجلی کے کڑکے بھی۔ اُفق تا اُفق لہراتی ہوئی عداوت کی بے نیام تلواریں تھیں اور سر بفلک سیاہ بادلوں کے سینے سے پھوٹتا ہوا بغض کا لاوا۔ کتنی بھیانک تھی یہ فضا! کوئی مخالفت سی مخالفت تھی!۔۔۔ کوئی شور سا شور تھا!!۔۔۔ یہ وہ گھٹا تھی جو چاروں سمت سے اُمڈ آئی تھی۔ کبھی آریہ سماج کے خیل در خیل بادل مشرق سے چنگھاڑتے ہوئے حملہ آور ہوتے' تو کبھی عیسائیت کی تہ بہ تہ کثافتیں اُفقِ مغرب سے بجلیاں گراتیں۔ دیکھنا اب یہ ہے کہ شدید مخالفت کا یہ طوفان احمدیت کے قافلے کا رُخ موڑنے میں یا اس کے قدم تھامنے میں یا اس کی جمعیت کو پراگندہ کرنے میں کس حد تک کامیاب ہو سکا۔

یہ درست ہے کہ مخالفت کے شور و غوغا کے باوجود قافلے منزل بمنزل رواں دواں رہتے ہیں۔ لیکن کیا یہ کہنا بھی درست ہوگا کہ سفاک لٹیروں اور بے باک رہزنوں کے خوفناک حملے بھی کسی قافلے کے قدم روکنے یا اس کی جمعیت کو پریشان کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے؟ یا بڑے بڑے پُر ہیبت بادشاہوں کی فوج کشی بھی قافلوں کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی؟ نہیں۔ یقیناً درست نہیں۔ کیونکہ فوجوں کی یلغار کے راستوں پر تو قافلوں کے تصور سے بھی مسافروں کے دل دہلتے اور پتے پانی ہوتے ہیں۔ احمدیت کا قافلہ رواں دواں رہا۔۔ کوئی خوف اِن خدا پرستوں کی راہ میں حائل نہ ہو سکا۔ کوئی حملہ احمدیت کی رفتارِ ترقی کو روک نہ سکا۔ کوئی یلغار اسے تنزل کی جانب پسپا نہ کر سکی۔ بجلیاں گرتی رہیں۔ لیکن یہ آگ انہیں جلانے پر قدرت نہ پا سکی بادل گرج گرج کر فضا کا سینہ چاک کرتے رہے۔ لیکن مجاہدینِ احمدیت کے دلوں پر کوئی لرزہ پیدا نہ کر سکے

---

[1] الحکم ۱۸؍ جون ۱۹۰۸ء

ظلمات کے پردے تہ بہ تہ ہونے کے باوجود وہ نُورِ بصیرت اُن آنکھوں سے چھین نہ سکے جو اندھیروں کے پردے پھاڑ کر صراطِ مستقیم کی طرف ہر آن رہنمائی کرتا ہے۔ حضرت صاحبزادہ صاحب اور اس شاندار مستقبل کے درمیان جس کا پیشگوئی میں وعدہ دیا گیا تھا پھولوں کی کوئی سیج نہیں بچھی ہوئی تھی' بلکہ قدم قدم پر کانٹے بھی تھے اور پتھر بھی اور لاتعداد ایسے خطرناک موڑ بھی جن پر "اگر یہاں سے بچ نکلے ... اور اگر یہاں سے بچ نکلے..." کی سُرخ حروف میں لکھی ہوئی تختیاں آویزاں تھیں۔ عمر کے ساتھ آپ کی زندگی کی بڑھتی ہوئی مشکلات کا بیان تو بعد میں آئے گا بچپن کے جس دَور پر ہم نظر ڈال رہے ہیں' اس وقت تو ابھی "دُنیا" کے قانونِ فتح و شکست کے لحاظ سے ہرگز یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ احمدیت کا کوئی وجود باقی بھی رہے گا۔ بلکہ اگر مخالف اور موافق تمام اسباب و عوامل کو کسی کمپیوٹر میں ڈالا جاتا بس صرف الٰہی مشیت کا خانہ خالی چھوڑ دیا جاتا تو ہر بار بلا استثناء و بلا شبہ کمپیوٹر کا جواب یہی نکلتا کہ احمدیت چند سانسوں کی مہمان ہے۔ پس پر اگر خدا تعالیٰ کی تائید کو بھی مخالف خانے میں ڈال دیا جاتا تو پھر جو نتیجہ نکل سکتا تھا' وہ ظاہر ہے۔

جو قارئین اس تاریخ ساز معرکہ حق و باطل کی تفاصیل میں دلچسپی رکھتے ہیں' انہیں تاریخ احمدیت کی جلد سوم کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ ہم یہاں صرف ایک نہایت مختصر خاکہ پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔ اس کی ضرورت بھی محض اس لئے پیش آ رہی ہے کہ حضرت صاحبزادہ صاحب کی زندگی بعد ازاں کمل طور پر احمدیت میں جذب ہو کر ایک ہی وجود کے دو نام بن گئی تھی لہٰذا ربطِ مضمون کی خاطر تاریخ احمدیت کے اس دَور کے بنیادی ڈھانچے سے شناسائی بھی ضروری ہے۔

۱۸۹۰ء کے آخر میں پہلی مرتبہ حضرت مرزا صاحب نے خدا تعالیٰ سے واضح اذن پا کر اپنے مسیح موعود ہونے کا اعلان فرمایا اور اس سلسلہ میں ایک رسالہ بنام "فتح اسلام" تحریر فرمایا۔ "فتح اسلام" امرتسر میں ابھی زیرِ طبع ہی تھی کہ مولوی محمد حسین بٹالوی نے اتفاقاً اس کے پروف پریس سے منگوا کر دیکھے اور دیکھتے ہی آگ بگولا ہو گئے۔ عقیدت معاً عداوت میں بدل گئی اور پھر یہ عداوت اتنی شدت اختیار کر گئی کہ جلد ہی جناب مولوی صاحب نے حضرت مرزا صاحب کے خلاف یہ واشگاف اعلانِ جنگ کر دیا:۔

> "اشاعۃ السنہ کا فرض اور اس کے ذمہ یہ ایک فرض تھا کہ اس نے جیسا کہ اس کو (یعنی حضرت مسیح موعود علیہ السلام۔ناقل) دعاوی قدیمہ کی نظر سے آسمان پر چڑھایا تھا' ویسا ہی ان دعاوی جدیدہ کی نظر سے زمین پر گرا دے گا۔"[1]

---

[1] اشاعۃ السنۃ جلد ۱۳ نمبر ا صـــ ۴

نیز مسلمانانِ ہند کو اشتعال دلانے کے لئے لکھا کہ :

"فتنۂ قادیانی ابھی فتنہ ہے کوئی دن میں قیامت ہوگا۔ اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے مذہب دامن میں زبردست انقلاب واقع ہونے کا اندیشہ ہے اس لئے اشاعۃ السنۃ کا رسالہ اس کی سرکوبی کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔" [۱]

اس اعلان کے منظرِ عام پر آنے سے ملک بھر میں مخالفت کا طوفان بے تمیزی کھڑا ہوگیا۔ خود مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی نے حق کی آواز کو دبانے کا فیصلہ کرکے ہر لمحہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی مخالفت میں وقف کر دیا اور اپنی مہم کو کامیاب بنانے کے لئے اسی پرانے حربہ کو آزمانے کی ٹھانی جو ہر مامور من اللہ اور امامِ ربانی کے خلاف استعمال ہوتا آیا ہے یعنی زورِ بازو سے اس سلسلہ کو مٹانے اور منہ کی پھونکوں سے اس چراغ کو بجھانے کے درپے ہوگئے چنانچہ پہلی کوشش اس سلسلہ میں آپ نے یہ فرمائی کہ ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک طوفانی دورہ کیا اور علماء سے حضرت مرزا صاحب کے خلاف کفر و ارتداد کے فتوے حاصل کئے۔ پھر ان فتاویٰ کو قریہ بقریہ مشتہر کیا اور حضرت مرزا صاحب کے خلاف عوام کے دلوں میں شدید نفرت کا زہر بھر دیا۔ خود مولوی صاحب کے اپنے ارشاد کے مطابق :

"اس عرصہ میں مسلمانوں کے اس دوست نما دشمن عقائد قدیمہ اسلامی کے رہزنِ دبیخ کن (کادیانی) کے تعاقب میں رہا اور بمشکل اور بطائف الحیل جولائی ۱۸۹۱ء میں بمقام لدھیانہ اس کو جا پکڑا اور بارہ دن تک خوب رگیدا اور پچھاڑا اور ۳۱ر جولائی کو ذلت کی شکست دیکر مار بھگایا۔۔ پھر دہلی میں پچھاڑا۔ پھر جب وہ لاہور اور سیالکوٹ پہنچا تو وہاں اس کا پیچھا کیا اور مباحثہ سے صاف وصریح انکار کرا کر بھگا دیا۔" [۲]

مسلمان علماء میں سے مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی اور مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسری پر ہی اکتفا نہیں ہندوستان کا شاید ہی کوئی ایسا عالمِ دین ہو جو حضرت مرزا غلام احمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مخالفت میں سرگرمِ عمل نہ رہا ہو۔ اور شاید ہی کوئی حربہ مخالفت کا ایسا رہ گیا ہو جو حضرت اقدس کے خلاف استعمال نہ کیا گیا ہو۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہندوستان کی اکثر مسجدیں آپ کی مخالفت کا اکھاڑہ بن گئیں اور اکثر منبر و محراب آپ ہی کے خلاف سب وشتم اور افتراء پردازی کے لئے استعمال ہونے لگے۔ یہ مخالفت صرف مسلمان علماء

---

[۱] اشاعۃ السنۃ جلد ۱۳ نمبر ۱ صفحہ ۲-۴ [۲] اشاعۃ السنۃ جلد ۱۴ نمبر ۱ صفحہ ۴

تک محدود نہیں تھی بلکہ غیر مسلموں کے معابدیں سے بھی بہت سے مندر اور کلیسا آپ کے خلاف سازشوں کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ کلیسا اور آریہ سماج کے اکثر مذہبی راہنما اس مخالفت میں پیش پیش تھے۔ چنانچہ ان تین شدید معاندانہ قوتوں نے آپ کے خلاف ہر سمت سے یلغار کر دی۔

یہاں یہ اظہارِ تعجب بے جا نہ ہوگا کہ ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا انوکھا اور حیران کن واقعہ تھا کہ تین قومیں جو باہم شدید مذہبی عناد رکھتی تھیں یعنی ہندو، عیسائی اور مسلمان کسی مدِمقابل سے مشترک مذہبی عناد کی بناء پر باہم متحد ہوتے ہوں۔

پس حضرت مرزا صاحب کی دشمنی نے یہ عجیب معجزہ بھی دُنیا کو دکھایا کہ کیا عیسائی اور کیا آریہ اور کیا دوسرے مذہبی رہنما بھائیوں کی طرح باہم شیر وشکر ہو کر حضرت مرزا صاحب کو ہلاک کرنے کے منصوبے بنانے لگے اور ایک متحدہ طاقت کے ساتھ آپ کو نیست و نابود کرنے کے درپے ہُوئے۔ اگرچہ یہ جنگ مذہب کے نام پر لڑی جارہی تھی لیکن یہ امر بھی بڑا تعجب انگیز ہے کہ حضرت مرزا صاحب کے ان مذہبی معاندین کے نزدیک کوئی اخلاقی ضابطۂ حیات درخورِ اعتناء نہ تھا۔ اس مخالفت میں انہوں نے ہر حربہ کو جائز سمجھا، ہر غلط اقدام کو راست جانا اور ہر بدخلقی پر جسارت کی اور ہر بے باکی کو درست تصور کیا۔

غرضیکہ اخلاقی اور مذہبی قیود سے کلیۃً آزاد یہ ایک انوکھی جنگِ مقدس تھی جو انوکھے انداز میں لڑی گئی۔ اس مقدس جنگ میں حضرت مرزا صاحب کے خلاف ہر طرح کا جھوٹ اور بہتان اور لاف زنی، حق کی خدمت متصور ہو رہے تھے گویا جھوٹ کے کاندھوں پر بٹھا کر سچائی کا بول بالا کرنے کی کوشش کی جارہی تھی۔

اسی طرح حضرت مرزا صاحب کے خلاف جھوٹے مقدمے گھڑ کر اور جھوٹے گواہ پیش کرکے بزعمِ خود انصاف کو قائم کیا جارہا تھا۔ شرافت اور نجابت کی اقدار کی حفاظت کے نام پر آپ کے خلاف ہر قسم کی مغلظات کا استعمال نہ صرف جائز بلکہ مستحسن شمار کیا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ آپ کو قتل کرنے کی ترغیب کھلم کھلا محراب و منبر سے یہ بتا کر دی جاتی تھی کہ آپ کا قاتل اگر مارا گیا تو بلا روک ٹوک اور بلا تکلف سیدھا جنت الفردوس میں جائے گا۔

علاوہ ازیں ایذا رسانی کے دوسرے تمام ممکنہ ذرائع بھی آپ کے خلاف استعمال کئے گئے۔ آپ کے متبعین کو کبھی سوسائٹی سے خارج کرکے اچھوتوں سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور کیا گیا اور کبھی اُن کے اَموال و اسباب لُوٹ کر فقیرانہ حالت میں گھروں سے بے گھر اور وطنوں سے بے وطن کرکے خالی ہاتھ اس کارگاہِ عالم میں دھکیل دیا گیا۔ پھر کبھی اُن کی بیویوں کو اُن پر حرام قرار دے کر رَستے بستے

گھروں کو اجاڑا گیا اور کبھی ماں باپ، بہن بھائیوں سے جُدا کر کے یکہ و تنہا اس دنیا کی تلخیاں سہنے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ بارہا اُن کو زدو کوب بھی کیا گیا اور دردناک جسمانی اذیتیں بھی پہنچائی گئیں اور بسا اوقات انہیں قتل یا سنگسار کر کے احمدیت کو نابود اور اپنے بُغض و حسد کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی گئی حضرت مرزا صاحب کے جلسوں پر پتھراؤ کیا گیا اور انہیں ناکام بنانے کے لئے انجان عوام الناس کو غول در غول بھجوایا گیا جو شور و غوغا کر کے حضرت مرزا صاحب کو گالیاں دے کر اور چھاتیاں پیٹ کر "مرزا ہائے ہائے" کے نعرے لگاتے ہوئے حاضرین جلسہ کو سماعت سے محروم رکھتے یا مرعوب کر کے منتشر کرنے کی کوشش کیا کرتے۔

فتاویٰ کفر کا یہ عالم تھا کہ صرف ایک مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی کا فتویٰ ہی ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل گالیوں کا ایک مرقع تھا۔ ہندوستان کا شاید ہی کوئی مشہور شہر یا قصبہ ایسا رہ گیا ہو جس کے علماء نے اس مغلظات سے پُر فتویٰ کفر و الحاد پر اپنے دستخط کر کے مُہرِ تصدیق ثبت نہ کی ہو۔ اس مخالفت کی کہانی طویل اور افسوسناک ہے۔ مختصر یہ کہ مخالفین کی غوغا آرائی اور شور و شر نے ہندوستان کی مذہبی فضا میں ایک تہلکہ مچا رکھا تھا۔[1]

انفرادی طور پر بھی آپ کے قتل کی کوششیں کی گئیں۔ عدالت کے دروازے کھٹکھٹا کر آپ کو بحیثیت ایک قاتل سزا دلوانے کی کوشش بھی کی گئی اور حکومتِ وقت کو بھی آپ سے بدظن کرنے کی خاطر آپ کو ایک خونی مہدی اور باغی سردار کے طور پر پیش کیا گیا۔ یہاں تک کہ آپ کو ہلاک کرنے کی یہ کوششیں دنیاوی ذرائع کی حد تک ہی محدود نہ رہیں بلکہ عرش کے خدا کو بھی اپنی مدد کے لئے بلایا گیا۔ پس چشمِ فلک نے یہ عجیب نظارہ دیکھا کہ ایک طرف مسلمان علماء آپ پر لعنتیں بھیجتے اور سجدہ گاہوں پر پیشانیاں رگڑتے ہوئے اپنے رب سے یہ التجا کر رہے تھے کہ اے خدا! اس دشمنِ دین کو ہماری آنکھوں کے سامنے ہلاک کر کے اس کے نام و نشان تک کو اس دُنیا سے مٹا دے اور ہمیں دل اور آنکھوں کی ٹھنڈک نصیب فرما تو دوسری طرف بڑے بڑے عیسائی جُبّہ پوش پادری اس مزعومہ دشمنِ دین کی ہلاکت کے لئے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ پھر ان دُعا کرنے والوں کی صف میں پنڈت لیکھرام اور اس کے چیلے چانٹے بھی بھجن گاتے ہوئے شریک تھے۔ بلکہ یہ اعلان بھی کر رہے تھے کہ پرماتما نے مرزا قادیانی کی ہلاکت آسمان پر لکھ دی ہے اور یہ خود اور اس کی تمام اولاد ہماری آنکھوں کے سامنے رسوا اور ذلیل اور ہلاک اور نابود ہو جائے گی یہاں تک کہ قادیان کی بستی میں بھی کوئی ان کا نام جاننے والا باقی نہ رہے گا۔

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھیں تاریخ احمدیت جلد دوم صہ ۱۹۴

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی

صداقت پر آپ کا روز و شب بڑھتا ہُوا ایمان

حضرت مرزا محمود احمد صاحب نے جس فضا میں بچپن گزارا اس کا ایک مختصر نقشہ گذشتہ باب میں کھینچا گیا ہے۔ دو برعکس اور متقابل زاویوں سے آپ نے اپنے باپ کو دیکھا۔ ایک طرف معاندین اور اعداء کی یہ کثرت اور عداوت کی یہ شدت تھی تو دوسری طرف یقین و معرفت کے ہتھیاروں سے مسلح ایک روز و شب بڑھنے والی عاشقوں اور جاں نثاروں کی وہ چھوٹی سی جماعت تھی جو پروانہ وار آپ کے گرد جمع ہو رہی تھی۔ ایک زاویۂ نگاہ سے آپ کے والد دنیا والوں کی نظر میں ہی مغضوب و مقہور نہیں بلکہ خود عرش کے خدا کی شدید نفرت اور قہر کا نشانہ تھے تو دوسرے زاویہ کی رُو سے آپ خدا کے ایک فرستادہ اور محبوب بندے تھے جن پر خدا والوں کی ایک جماعت 'اِذن کی منتظر ہر دم جان نثار کرنے کو تیار کھڑی تھی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں متضاد زاویہ ہائے نگاہ سے کئے گئے ان مخالف نظاروں میں سے کس کا اثر آپ کی طبیعت پر غالب آیا؟ کس کو آپ نے ٹھوس حقیقت سمجھا اور کس کو محض نظر کا ایک فریب جانا؟ یہ فیصلہ آپ کے لئے چنداں مشکل نہ تھا۔ ایک کمزور فردِ بشر کے گرد جمع ہوتے ہوئے چند کمزور انسانوں کو آپ نے لاکھوں کروڑوں جابر انسانوں کے نرغے میں گھرے ہُوئے دیکھا جو یہ دعویٰ بھی رکھتے تھے کہ عرش کا خدا اُنہی کے ساتھ ہے۔ لیکن ہر بار جب وہ حضرت مرزا صاحب اور ان کے مُٹھی بھر ساتھیوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی کوئی کوشش کرتے تو بُری طرح ناکام اور خائب و خاسر ہو جاتے۔ نابُود کرنا تو درکنار وہ اُن کی جمعیّت کو ذرّہ بھر پریشان کرنے پر بھی قُدرت نہ پا سکے۔ اس کے برعکس ہر حملے اور ہر یلغار کے بعد حضرت مرزا صاحب اور آپ کے متبعین کی طاقت 'کیا بلحاظ کمیّت اور کیا بلحاظ کیفیت پہلے سے بڑھتی ہی چلی گئی اور ہر بار معرکہ آرائی کا گرد و غبار چھٹنے کے بعد آپ نے اس بظاہر کمزور اور ناتواں جماعت کو خاکِ ذلّت میں لوٹتا ہوا دیکھنے کی بجائے عزّت و مرتبت کے بلند تر مقامات پر جلوہ افروز پایا یکے بعد دیگرے آپ نے اپنے بزرگ والد کے مخالفین کو اُن کی بربادی کی حسرت لئے ہُوئے اس دُنیا سے

رُخصت ہوتے دیکھا۔ کیا مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی اور کیا ڈوئی اور کیا لیکھرام ایک کے بعد دُوسرے نے آپ کو نیچا دکھانے کا دعویٰ کیا اور خدا تعالیٰ کی نُصرت کا اِدّعاء کر کے اُٹھا لیکن ایک کے بعد دُوسرا اپنی تمام کوششوں کی ناکامی اور اپنی تمام دُعاوں کی نامُرادی کا مُنہ دیکھتا ہُوا اِس عظیم مذہبی اکھاڑے سے رُخصت ہُوا۔

پھر وہ دن بھی آیا جب کہ حضرت مرزا صاحب کو اپنے ربّ کے حضور حاضر ہونا تھا۔ ایک روز افزوں ترقی کرتی ہوئی بڑھتی ہوئی، پھیلتی، پھولتی اور پھلتی ہوئی جماعت آپ کو میسر آ چکی تھی جو تنزّل کے نام سے ناآشنا تھی۔ بلند حوصلے لئے ہوئے ستاروں پر کمندیں ڈالتی ہوئی وہ ہر لحظہ قدم آگے اور صرف آگے بڑھانا جانتی تھی۔ حضرت صاحبزادہ مرزا محمود احمد صاحب نے یہ دن بھی دیکھا۔ یہ وہ دن تھا جب کہ خود آپ کی ہلاکت اور بربادی کی پیشگوئیاں کرنے والے پنڈت لیکھرام کو خائب و خاسر اور بے اولاد مرے ہُوئے گیارہ برس گزر چکے تھے۔ خدا کس کے ساتھ تھا اور کس کے ساتھ نہیں۔ کیا ان حالات میں یہ فیصلہ کرنا اس زیرک نوجوان کے لئے بلکہ دنیا کے کسی بھی صاحبِ فراست کے لئے کچھ مشکل ہو سکتا تھا۔ نہیں اور یقیناً نہیں۔

اس شدید دنیوی مخالفت کے مقابل پر اللہ تعالیٰ کی قطعی اور لافانی تائیدی شہادت نے حضرت صاحبزادہ صاحب کے قلب و رُوح پر جو اثر ڈالا وہ اپنے والد کی سچائی پر ایک غیر متزلزل، کُرے اور محکم ایمان کی صورت میں ظاہر ہُوا جسے دُنیا کی کوئی قوت، کوئی طوفان اور کوئی زلزلہ جنبش نہ دے سکتے تھے۔ چنانچہ باپ کی مقدس لاش کے سرہانے کھڑے ہو کر آپ نے اپنے جذبات کے لاوے کو ایک عزم صمیم کی صورت میں ڈھالا اور ایک ایسا عہد کیا جو تاریخی بھی تھا اور تاریخ ساز بھی! یہ ایک عظیم میثاق تھا جس نے آپ کی بقیہ زندگی کو اپنے مضبوط بندھنوں میں جکڑ دیا اور ایک خاص قوت اور ایک خاص والہیت اور ایک خاص جذبۂ شوق کے ساتھ ایک خاص سمت میں ایک خاص راہ پر ہمیشہ ہمیش کے لئے گامزن کر دیا۔ اس عہد کا تفصیلی ذکر اگلے باب میں کیا جا رہا ہے۔

باب سوم

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا وصال

خلافتِ اُولیٰ کا قیام

حضرت صاحبزادہ صاحب کی

استحکامِ خلافت کیلئے عظیم خدمات

دیگر مشاغل اور مصروفیات

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا وصال اور تدفین۔

حضرت صاحبزادہ صاحب کا ایک تاریخی عہد۔

جماعت احمدیہ میں نظامِ خلافت کا قیام۔

نظامِ خلافت کے استحکام کے لئے جدوجہد۔

حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ سے کامل اطاعت اور وفا کا تعلّق۔

حضرت صاحبزادہ صاحب کا ایک اہم رویا۔

تقریر و تحریر۔

طرزِ خطابت اور اس کے گہرے اثرات۔

رشحاتِ قلم کے چند نمونے۔

بعض دیگر اہم اور دُور رس علمی خدمات:

- رسالہ تشحیذ الاذہان کا اجرا
- احمدیہ دارالمطالعہ لائبریری کا قیام
- اخبار "الفضل" کا اجرا
- مالی مشکلات

حضرت صاحبزادہ صاحب کا منظوم کلام۔

مختلف سفروں کی روئداد۔

محمود کی کہانی۔ محمود کی زبانی۔

حج بیت اللہ اور سفرِ مصر۔

حضرت مسیحِ موعود علیہ السلام

کا وصال اور تدفین

حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کے وصال کے ساتھ ہی حضرت صاحبزادہ مرزا بشیرالدین محمود احمد صاحب کی ابتدائی تربیت کا عہد آفریں دَور ختم ہُوا اور آپ نے ایک نئے دَور میں قدم رکھا جو آپ کے عہد کی آزمائشوں کا دَور تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہم اس دَور کی تفاصیل پر نظر ڈالیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے وصال کے عظیم سانحہ کے متعلق کچھ اور تفاصیل بیان کریں۔ کیونکہ یہ واقعہ اس دَور کا ایک ایسا تاریخی واقعہ ہے جس کا محض اُچٹتا ہُوا ذکر نہ تو لکھنے والے کی پیاس بجھا سکتا ہے اور نہ پڑھنے والے کی۔

گذشتہ صفحات میں قارئین جگہ جگہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے خلاف ایسی پیشگوئیوں یا تمناؤں کا ذکر پڑھ چکے ہیں جن کے پُورا ہونے کی صورت میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی وفات (معاذاللہ) ایک انتہائی مایوسی، ناکامی اور نامرادی کی وفات ہونی چاہیئے تھی۔ احمدیت یعنی اسلام کے از سرِ نو زندہ ہونے کی وہ عالمگیر تحریک جس کی باقاعدہ بنیاد حضرت مرزا غلام احمد علیہ السلام نے ۱۸۸۹ء میں رکھی آپ کے دعویٰ کے مطابق یہ کوئی انسانی تحریک نہیں تھی بلکہ الٰہی منشاء کے مطابق یہ وہی تحریک تھی جس کی خوشخبری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی حضرت مسیحؑ کے نزول اور کبھی مہدی کے ظہور کے طور پر فرمائی تھی۔ یہ تحریک جیسا کہ ظاہر ہے انتہائی کمزوری کے عالم میں شروع ہُوئی جب کہ ہندوستان بھر میں صرف گنتی کے چند حق شناس بزرگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کرکے اس کی ابتداء کی۔ ظاہر ہے کہ یہ وقت احمدیت کی تاریخ میں انتہائی کمزوری کا وقت تھا اور اس کے مقابل پر احمدیت کا دشمن اپنی نوعیت، کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے اتنا قوی اور غالب نظر آتا تھا کہ باہمی نسبت کے لحاظ سے ایسی قوت اسے پھر کبھی نصیب نہ ہوئی۔

مختصراً اب ہم دیکھیں گے کہ حضرت مرزا صاحب کے وصال کے وقت احمدیت کس مقام پر کھڑی تھی۔ کیا اس کی کمزوری میں دشمن کے پے بہ پے حملوں کی وجہ سے اضافہ ہُوا تھا یا برعکس صورتِ حال تھی۔

حضرت مرزا صاحب علیہ السلام کا وصال ۲۶ر مئی ۱۹۰۸ء کو لاہور کے مقام پر ہُوا۔ آپ نے یہ سفر ایک دینی اور تبلیغی مہم کے سلسلہ میں اختیار فرمایا تھا۔ اگرچہ اس سفر سے قبل اللہ تعالیٰ نے آپ کو بار بار

قربِ وصال کی خبر دی تھی لیکن احبابِ جماعت اپنی بے پناہ محبّت کی وجہ سے یہ وہم بھی نہ کر سکتے تھے کہ ان کے رُوحانی آقا عنقریب انہیں داغِ مفارقت دینے والے ہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے قُربِ وصال کی جو خبریں دیں' اُن میں ایک خاص قابلِ ذکر خبر یہ بھی تھی :

"اَلرَّحِیْلُ ثُمَّ الرَّحِیْل" [۱]

یعنی سفرِ آخرت ایک سفر میں پیش آئے گا۔ ان واضح الہامات کے نتیجہ میں یا ویسے ہی گہرے قلبی اور رُوحانی تعلق کی وجہ سے حضرت صاحبزادہ مرزا بشیرالدین محمود احمد صاحب کو اس سفر میں ایک دھڑکا سا لگ گیا تھا اور طبیعت میں سخت بے کلی' بے چینی اور غم کے جذبات پیدا ہو گئے تھے جیسا کہ مندرجہ ذیل روایت سے ظاہر ہے :۔

"حضرت صاحبؑ کی وفات سے پہلے ایام کا ذکر ہے کہ ملک مبارک علی صاحب تاجر لاہور' روز شام کو اس مکان پر آجاتے جس میں حضرت صاحبؑ ٹھہرے ہوئے تھے اور جب حضرت صاحب باہر سیر کو جاتے تو وہ اپنی بگھی میں بیٹھ کر ساتھ ہو جاتے تھے۔ مجھے سیر کے لئے حضرت صاحب نے ایک گھوڑی منگوا دی ہوئی تھی۔ میں بھی اس پر سوار ہو کر جایا کرتا تھا اور سواری کی سڑک پر گاڑی کے ساتھ ساتھ گھوڑی دوڑاتا چلا جاتا تھا اور باتیں بھی کرتا جاتا تھا۔ لیکن جس رات کو حضرت صاحبؑ کی بیماری میں ترقی ہو کر دوسرے دن آپ نے فوت ہونا تھا' میری طبیعت پر کچھ بوجھ سا معلوم ہوتا تھا۔ اس لئے میں گھوڑی پر سوار نہ ہُوا۔ ملک صاحب نے کہا میری گاڑی میں ہی آجائیں۔ چنانچہ میں اُن کے ساتھ بیٹھ گیا لیکن بیٹھتے ہی میرا دل افسردگی کے ایک گہرے گڑھے میں گر گیا اور یہ مصرعہ میری زبان پر جاری ہو گیا کہ : ع

راضی ہیں ہم اسی میں جس میں تری رضا ہو

ملک صاحب مجھے اپنی باتیں سُنائیں۔ میں کسی ایک آدھ بات کا جواب دے دیتا۔ تو پھر اسی خیال میں مشغول ہو جاتا۔ رات کو ہی حضرت صاحب کی بیماری یکدم ترقی کر گئی اور صبح آپ فوت ہو گئے۔ یہ بھی ایک تقدیرِ خاص تھی۔ جس نے مجھے وقت سے پہلے اس ناقابلِ برداشت صدمہ کے برداشت کرنے

---

[۱] تذکرہ طبع سوم صفحہ ۵۹۵

کے لئے تیار کر دیا۔" ؎

علاوہ ازیں جب آپ اپنی حرم محترمہ حضرت اُمّ ناصر صاحبہ رضی اللہ عنہا کو اپنے سُسرال سے بلانے کے لئے تشریف لے گئے تو اس وقت بھی آپ کے دِل میں یہی کھٹکا لگا ہُوا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وصال ہو جائے اور میری بیوی وہاں موجود نہ ہو۔

بہر حال حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وصال حسبِ الہامات ایک سفر کے دَوران ہُوا جب کہ آپ لاہور میں ڈاکٹر سید محمد حسین شاہ صاحب کے ہاں قیام پذیر تھے۔

یہ وصال مذکورہ بالا استثناء کو چھوڑ کر اپنوں اور غیروں۔ دونوں کے لئے اچانک اور غیر متوقع تھا۔ آپ کے متبعین اور محبّان پر آپ کے وصال کے سانحہ کی خبر بجلی بن کر گری اور ایک ایسا شدید غم آپکی جماعت کو پہنچا جس کی مثال کسی دُنیوی رشتہ میں نظر نہیں آتی۔ ماں باپ بچوں اور بہن بھائیوں کے وفات کے منظر بڑے رُوح فرسا ہوتے ہیں لیکن دیکھنے والے بتاتے ہیں کہ جیسا غم آپ کے ماننے والوں کو آپ کی جُدائی کا تھا اس کی کوئی نظیر دنیوی رشتوں میں نہیں ملتی۔ اس غم کے ساتھ فکر کا پہلو بھی نمایاں تھا۔ اور بکثرت ذہنوں میں سوال اُٹھ رہے تھے کہ اب کیا ہوگا اور احمدیت کا کیا بنے گا۔ اس کے مقابل پر آپ کے دُشمنوں کے کیمپ میں اس خبر کے نتیجہ میں خوشی کے شادیانے بجنے لگے اور مولویوں کے بہکاتے ہوئے سادہ لوح عوام تو اس غلط فہمی میں کہ نعوذ باللہ اسلام کا کوئی بڑا دُشمن مرا ہے' ناچتے اور شور مچاتے شہر کی گلیوں میں نکل آئے اور تالیاں پیٹتے ہوئے حضرت مسیح موعودؑ کے وصال کے سانحہ کو ایک عظیم الشّان تہوار کی طرح منایا۔ اُنکی خوشی بھی محبّان کے غم کی طرح دوہری خوشی تھی کیونکہ اس وفات میں دشمن کو صرف آپ ہی کی وفات نظر نہیں آئی بلکہ انہوں نے اس میں گویا احمدیت کو مرتا ہُوا گمان کیا اور یقین کر لیا کہ اب چند ہی دن میں وہ اس تحریک کا جنازہ نکلتا ہُوا دیکھ لیں گے۔

پس ایک طرف دوہرے غم و فکر میں مبتلا ایک اندوہ گیں جماعت تھی اور دوسری طرف دوہری مسرتوں میں سرشار ایک انبوہِ کثیر ہندوستان کے متعدد قصبات کی گلیوں اور بازاروں میں نکل کر تالیاں پیٹتے، سیٹیاں بجاتے اور آوازے کستے ہُوئے اپنی بے پناہ مسرّت کا اظہار کر رہا تھا۔

آیئے اب دیکھیں کہ احمدیت اس وقت کس مقام پر کھڑی تھی۔ وہ جماعت جس کی ابتداء ۱۸۸۹ء میں لُدھیانہ کے مقام پر صرف چالیس افراد کے عہدِ بیعت سے ہُوئی تھی' آپ کے وصال کے وقت سینکڑوں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں تک پہنچ چکی تھی۔ آپ کی طرف عوام و خواص کا بعض دنوں میں تو اس شدّت سے

؎ "تقدیر الٰہی" تقریر حضرت مصلح موعودؓ جلسہ سالانہ ۱۹۱۹ء صہ ۱۸۹'۱۹۰

رجُوع ہوتا تھا کہ بیعت کے خطوط لانے والا ہرکارہ ایک وقت میں اس بوجھ کو نہیں اُٹھا سکتا تھا چنانچہ دو دو یا تین تین دفعہ تھیلے بھر بھر کر حضرت مرزا صاحب علیہ السلام کی خدمت میں لے کر آیا کرتا تھا۔

قادیان میں آنے والے زائرین کی تعداد میں روز بروز اضافہ آخر مہمان خانے اور دارالضیافت کے قیام پر منتج ہُوا۔ اس میں بیسیوں مہمان قیام فرماتے جو حضرت صاحب کی زیارت کے لئے دُور دراز مقامات سے حاضر ہُوا کرتے تھے۔ ان دِنوں بٹالہ سے قادیان تک کا بارہ میل کا سفر پیدل یا یکّے کے ذریعہ کیا جاتا تھا۔ زائرین یکّہ مہیانہ ہونے کی صورت میں بٹالہ میں انتظار کرنے کی بجائے پیدل سفر کو ترجیح دیتے اور شوقِ زیارت میں کشاں کشاں پیدل ہی قادیان کی سمت روانہ ہو جاتے۔

آپ کی طرف خَلقت کا یہ رجُوع دشمنوں کے لئے اس قدر فکر اور تشویش کا موجب تھا کہ مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی نے تو اپنا یہ دستور بنا لیا تھا کہ جب فرصت ملتی۔ بٹالہ ریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر قادیان کی سمت جانے والے زائرین کو سمجھا بُجھا کر آپ کی زیارت سے باز رکھنے کی کوشش کرتے لیکن زیارت کا یہ سلسلہ دن بدن بڑھتا ہی رہا اور کوئی مخالفانہ کوشش ہجومِ خلائق کو آپ تک رسائی پانے سے روک نہ سکی۔

اِس ضمن میں یہ دلچسپ واقعہ لکھنے کے لائق ہے کہ ایک بیعت کرنے والے نے تو اپنی بیعت کی وجہ ہی یہ بیان کی کہ میں اللہ تعالیٰ کی اس فعلی تائید کو دیکھ کر حضرت مرزا صاحب کی صداقت پر ایمان لے آیا ہوں کہ ایک طرف تو مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی ہیں جن کی جوتیاں گھس گئیں لوگوں کو حضرت مرزا صاحب کی زیارت سے روکنے کی کوشش میں اور دوسری طرف یہ حال ہے کہ حضرت مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کے شوق نے لوگوں کی جوتیاں گھسا دی ہیں اور وہ قادیان کے چکّر لگاتے ہُوئے نہیں تھکتے۔

ہجومِ خلائق کا رجُوع قادیان کی جانب اتنا بڑھا کہ بٹالہ سے قادیان کو جانے والی سڑک پر زائرین کی آمد و رفت کی کثرت سے گڑھے پڑ گئے اور حضرت مرزا صاحب علیہ السلام کا وہ الہام معناً اور لفظاً پورا ہُوا جس میں سالہا سال پہلے یہ خبر دی گئی تھی کہ:

يَأْتِيْكَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْق
وَيَأْتُوْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْق [۱]

یعنی تیری طرف آنے والے لوگ اور تیری طرف آنے والے سامان گہرے گڑھوں والے راستوں پر سے گزر کر آئیں گے۔

---

[۱] تذکرہ طبع سوم صفحہ ۳۵۶

خلائق کا یہ رُجوع صرف پنجاب تک محدود نہیں تھا بلکہ شمال، جنوب، مشرق اور مغرب غرض ہندوستان کا کوئی ایسا خِطّہ باقی نہیں رہا جہاں سے حضرت مرزا صاحب کی زیارت کی غرض سے لوگ حاضر نہ ہوتے ہوں۔ پھر ہندوستان تک ہی یہ بات محدود نہ تھی بلکہ مشرقِ وُسطیٰ، یورپ اور امریکہ کے دُور دراز ممالک کے باشندے بھی قادیان کی اِس گمنام بستی میں حاضر ہونے لگے۔ اسی رجُوعِ خلائق کا ذکر کرتے ہُوئے حضرت مرزا صاحب علیہ السلام اپنی ایک نظم میں فرماتے ہیں :

مَیں تھا غریب و بے کس و گمنام و بے ہنر
کوئی نہ جانتا تھا کہ ہے قادیاں کدھر
لوگوں کی اس طرف کو ذرا بھی نظر نہ تھی
میرے وجود کی بھی کسی کو خبر نہ تھی
اب دیکھتے ہو کیسا رجوعِ جہاں ہُوا
اک مرجعِ خواص یہی قادیاں ہُوا
ـــــــ لہ ـــــــ

آپ کے وصال سے قبل ہندوستان کے ہر گوشہ میں آپ کی جماعت کی شاخ قائم ہو چکی تھی۔ جنوبی ہندوستان کے دُور دراز علاقوں میں بھی آپ کے دعاوی کو برحق تسلیم کر لیا گیا تھا اور ہندوستان سے باہر بعض عرب ممالک میں بھی آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مُرسل اور مامورِ ربّانی کے طور پر قبول کیا جا رہا تھا۔ اسی طرح امریکہ میں بھی آپ کے متبعین کی جماعت قائم ہو چکی تھی اور افغانستان کی سنگلاخ سرزمین میں تو نہ صرف یہ جماعت قائم ہوئی بلکہ بعض مخلصین نے اپنے خُون کی قربانی دے کر آپ کے دعاوی اور اپنے ایمان کی صداقت پر شہادت کی ابدی مُہرِ تصدیق ثبت کر دی تھی۔

جہاں تک نظامِ جماعت کا تعلق ہے، وہ بھی آپ کی زندگی ہی میں مضبوط خطوط پر قائم کیا جا چکا تھا بچّوں اور نوجوانوں کی تربیت کے لئے ایک دینی مدرسہ اور تعلیم الاسلام سکول کا اِجرا ہو چکا تھا۔ کثرت سے آنے والے مہمانوں کے لئے ایک باقاعدہ مہمان خانہ کا قیام عمل میں آ چکا تھا۔ متعدد اخبارات و رسائل شائع ہو رہے تھے اور سلسلہ کے عظیم مقاصد کی تکمیل کے لئے چندہ جات کے ایک باقاعدہ نظام کی بنیاد بھی ڈال دی گئی تھی جس کی رُو سے جماعت میں شامل ہونے والے ہر شخص پر یہ لازم آتا تھا کہ وہ اپنی آمد میں سے کچھ نہ کچھ مقررہ رقم باقاعدہ پابندی کے ساتھ اشاعتِ اسلام کی غرض سے چندہ کے طور پر ادا کیا کرے۔

لہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صہ ۱۲

مالی قربانی کے علاوہ جانی قربانی کا بھی اس رنگ میں مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ مخلصین جماعت اشاعتِ اسلام کی خاطر اپنی زندگیاں وقف کریں۔ چنانچہ اس آواز پر لبیک کہتے ہوئے بہت سی سعید روحیں نذرِ جاں لئے ہوئے قادیان میں حاضر ہو رہی تھیں۔

ایک اور انقلاب آفریں نظام جو حضرت مرزا صاحب علیہ السلام نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں جماعت احمدیہ کو عطا فرمایا "نظامِ وصیت" تھا۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے رویاء میں ایک ایسا مقبرہ دکھایا جس میں آپ کے علاوہ آپ کے ایسے متبعین نے دفن ہونے کی توفیق پائی تھی جو تقویٰ اور طہارت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوں اور اسلام کے عالمگیر جہاد کی خاطر قربانی کا ایسا شاندار نمونہ پیش کرنے والے ہوں کہ تازندگی اپنی آمد کا کم از کم ۱/۱۰ حصہ خدمتِ دین کے لئے پیش کریں اور یہ وصیت کریں کہ اُن کی وفات کے بعد اُن کی جائیداد کا کم از کم ۱/۱۰ حصہ جماعت احمدیہ کو اس غرض سے پیش کر دیا جائیگا کہ اسے خدمتِ دینِ محمدؐ پر خرچ کیا جائے۔ چنانچہ اس منشائے الٰہی کی تعمیل میں آپ نے نظامِ وصیت کی بنیاد رکھی۔

یہ تمام امور بڑے امید افزا تھے اور اس لہلہاتی کونپل میں ایک عظیم شجرۂ طیبہ کی جھلک ہر صاحبِ فراست کو نظر آ رہی تھی۔ اس پر احمدیت کے نقطہ نگاہ سے ایک بہت ہی باعث تسکین امر یہ تھا کہ جس موعود بیٹے کی خبر دے کر اس کی ترقی کے ساتھ احمدیت اور اسلام کی ترقی وابستہ کی گئی تھی وہ زندہ صحت و عافیت کے ساتھ صحیح رنگ میں تربیت پاتا ہُوا ایسے راستہ پر چل پڑا تھا جس کا رُخ پہلے سے مقرر کردہ مقصود کی جانب تھا۔

احمدیت اس مقام سے گزر رہی تھی جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وصال ہُوا اور اس اچانک صدمہ کے نتیجہ میں الّا ماشاء اللہ اکثر مخلصینِ جماعت بشری تقاضے کے ماتحت گھبرا گئے اور سخت پریشان ہو گئے کہ اس عظیم آسمانی وجود کی جدائی کے بعد اب اس جماعت کا کیا بنے گا جو اس کے سایۂ عاطفت کے نیچے پرورش پا رہی تھی۔ یہی وہ وقت تھا جب کہ مخالفینِ جماعت کی امیدوں میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ لیکن اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو دونوں جماعتوں کے جذبات میں بُعد المشرقین ہونے کے باوجود زبانِ حال سے دونوں کا فیصلہ ایک ہی تھا کہ جب تک حضرت مرزا صاحب زندہ تھے آپ کی قیادت و سیادت کی عظمت کے نتیجہ میں آپ کے مشن کا کوئی بال بیکا نہ کر سکتا تھا لیکن آپ کے وصال کے بعد دشمنوں کے لئے نقصان دہی کے مواقع اور دوستوں کیلئے خطرات کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ دوسرے لفظوں میں احمدیت کے دشمنوں اور محبّوں دونوں ہی نے مذکورہ بالا بے اختیار

ردِ عمل کے اظہار سے حضرت مرزا صاحب علیہ السلام کی عظیم شخصیت کو اپنے اپنے رنگ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔

اگرچہ کئی متعصب اخبارات نے اس موقع پر سخت غیر شریفانہ رویہ اختیار کیا لیکن دُنیائے صحافت میں ابھی وسعتِ حوصلہ باقی تھی اور انصاف عنقا نہیں ہُوا تھا۔ چنانچہ مشاہیر اہلِ قلم نے جو اظہار کیا۔ اس کے چند نمونے ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا :-

"وہ شخص بہت بڑا شخص جس کا قلم سحر تھا اور زبان جادُو۔ وہ شخص جو دماغی عجائبات کا مجسمہ تھا۔ جس کی نظر فتنہ اور آواز حشر تھی۔ جس کی انگلیوں سے انقلاب کے تار اُلجھے ہُوئے تھے اور جس کی دو مُٹھیاں بجلی کی دو بیٹریاں تھیں۔ وہ شخص جو مذہبی دُنیا کے لئے تیس برس تک زلزلہ اور طوفان رہا جو شورِ قیامت ہو کے خفتگانِ خوابِ ہستی کو بیدار کرتا رہا۔ خالی ہاتھ دُنیا سے اُٹھ گیا ...... مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی رحلت اس قابل نہیں کہ اس سے سبق حاصل نہ کیا جاوے اور مٹانے کے لئے اُسے امتدادِ زمانہ کے حوالے کرکے صبر کر لیا جائے۔ ایسے لوگ جن سے مذہبی یا عقلی دُنیا میں انقلاب پیدا ہو ہمیشہ دُنیا میں نہیں آتے۔ یہ نازشِ فرزندانِ تاریخ بہت کم منظرِ عالم پر آتے ہیں اور جب آتے ہیں دُنیا میں انقلاب پیدا کرکے دکھا جاتے ہیں۔

میرزا صاحب کی اس رفعت نے اُن کے بعض دعاوی اور بعض معتقدات سے شدید اختلاف کے باوجود ہمیشہ کی مفارقت پر مسلمانوں کو' ہاں تعلیم یافتہ اور روشن خیال مسلمانوں کو محسوس کرا دیا ہے کہ اُن کا ایک بڑا شخص اُن سے جُدا ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ مخالفینِ اسلام کے مقابلہ پر اسلام کی اس شاندار مُدافعت کا' جو اس کی ذات سے وابستہ تھی' خاتمہ ہو گیا۔

اُن کی یہ خصوصیت کہ وہ اسلام کے مخالفین کے برخلاف ایک فتح نصیب جرنیل کا فرض پُورا کرتے رہے' ہمیں مجبور کرتی ہے کہ اس احساس کا کھلم کھُلا اعتراف کیا جاوے تاکہ وہ مہتم بالشان تحریک جس نے ہمارے دشمنوں کو عرصہ تک پست اور پامال بنائے رکھا' آئندہ بھی جاری رہے۔

مرزا صاحب کا لٹریچر جو مسیحیوں اور آریوں کے مقابلہ پر اُن سے

ظہور میں آیا، قبولِ عام کی سند حاصل کر چکا ہے اور اس خصوصیت میں وہ کسی تعارف کے محتاج نہیں اس لٹریچر کی قدر و عظمت آج جبکہ وہ اپنا کام پورا کر چکا ہے ہمیں دل سے تسلیم کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے کہ وہ وقت ہرگز لوحِ قلب سے نسیاً منسیاً نہیں ہو سکتا جب کہ اسلام مخالفین کی یورشوں میں گھر چکا تھا اور مسلمان جو حافظِ حقیقی کی طرف سے عالمِ اسباب و وسائط میں حفاظت کا واسطہ ہو کر اس کی حفاظت پر مامور تھے اپنے قصوروں کی پاداش میں پڑے سسک رہے تھے اور اسلام کے لئے کچھ نہ کرتے تھے یا نہ کر سکتے تھے۔ ایک طرف حملوں کے امتداد کی یہ حالت تھی کہ ساری مسیحی دنیا اسلام کی شمع عرفان حقیقی کو سرِراہِ منزل مزاحمت سمجھ کے مٹا دینا چاہتی تھی اور عقل و دولت کی زبردست طاقتیں اس حملہ آور کی پشت گری کے لئے ٹوٹی پڑتی تھیں اور دوسری طرف ضعفِ مدافعت کا یہ عالم تھا کہ توپوں کے مقابلہ پر تیر بھی نہ تھے اور حملہ اور مدافعت دونوں کا قطعی وجود ہی نہ تھا۔۔۔ کہ مسلمانوں کی طرف سے وہ مدافعت شروع ہوئی جس کا ایک حصہ مرزا صاحب کو حاصل ہوا۔ اس مدافعت نے نہ صرف عیسائیت کے اس ابتدائی اثر کے پرخچے اڑائے جو سلطنت کے سایہ میں ہونے کی وجہ سے حقیقت میں اس کی جان تھا اور ہزاروں اور لاکھوں مسلمان اسکے اس زیادہ خطرناک اور مستحق کامیابی حملہ کی زد سے بچ گئے بلکہ خود عیسائیت کا طلسم دھواں ہو کر اڑنے لگا۔۔۔ غرض مرزا صاحب کی یہ خدمت آنے والی نسلوں کو گرانبارِ احسان رکھے گی کہ انہوں نے قلمی جہاد کرنے والوں کی پہلی صف میں شامل ہو کر اسلام کی طرف سے فرضِ مدافعت ادا کیا اور ایسا لٹریچر یادگار چھوڑا جو اس وقت تک کہ مسلمانوں کی رگوں میں زندہ خون رہے اور حمایتِ اسلام کا جذبہ اُن کے شعارِ قومی کا عنوان نظر آئے، قائم رہے گا۔

اس کے علاوہ آریہ سماج کی زہریلی کچلیاں توڑنے میں مرزا صاحب نے اسلام کی بہت خاص خدمت انجام دی ہے۔ مرزا صاحب اور مولوی محمد

قاسم صاحب نے اُس وقت سے کہ سوامی دیانند نے اسلام کے متعلق اپنی دماغی مفلسی کی نوحہ خوانی جابجا آغاز کی تھی، اُن کا تعاقب شروع کر دیا تھا۔ ان حضرات نے عُمر بھر سوامی جی کا قافیہ تنگ رکھا۔ جب وہ اجمیر میں آگ کے حوالے کر دیئے گئے اُس وقت سے اخیر عمر تک برابر مرزا صاحب آریہ سماج کے چہرہ سے انیسویں[۱۹] صدی کے ہندو ریفارمر کا چڑھایا ہوا مُلمع اُتارنے میں مصروف رہے۔ اُن کی آریہ سماج کے مقابلہ کی تحریروں سے اس دعویٰ پر نہایت صاف روشنی پڑتی ہے کہ آئندہ ہماری مدافعت کا سلسلہ خواہ کسی درجہ تک وسیع ہو جائے، ناممکن ہے کہ یہ تحریریں نظرانداز کی جا سکیں۔

فطری ذہانت، مشق و مہارت اور مسلسل بحث و مباحثہ کی عادت نے مرزا صاحب میں ایک شانِ خاص پیدا کر دی تھی۔ اپنے مذہب کے علاوہ مذہبِ غیر پر بھی اُن کی نظر نہایت وسیع تھی اور وہ اپنی ان معلومات کا نہایت سلیقہ سے استعمال کر سکتے تھے۔ تبلیغ و تلقین کا یہ ملکہ اُن میں پیدا ہو گیا تھا کہ مخاطب کسی قابلیت یا کسی مَشرب و مِلّت کا ہو۔ اُن کے برجستہ جواب سے ایک دفعہ ضرور گہرے فکر میں پڑ جاتا تھا۔ ہندوستان آج مذاہب کا عجائب خانہ ہے اور جس کثرت سے چھوٹے بڑے مذاہب یہاں موجود ہیں اور باہمی کشمکش سے اپنی موجودگی کا اعلان کرتے رہتے ہیں، اُس کی نظیر غالباً دنیا میں کسی جگہ سے نہیں مل سکتی۔ مرزا صاحب کا دعویٰ تھا کہ میں ان سب کے لئے حَکَم و عدل ہوں لیکن اس میں کلام نہیں کہ ان مختلف مذاہب کے مقابلہ پر اسلام کو نمایاں کر دینے کی اُن میں بہت مخصوص قابلیت تھی اور یہ نتیجہ تھی اُن کی فطری استعداد کا، ذوقِ مطالعہ اور کثرتِ مشق کا۔ آئندہ امید نہیں ہے کہ ہندوستان کی مذہبی دُنیا میں اِس شان کا شخص پیدا ہو جو اپنی اعلیٰ خواہشیں محض اس طرح مذاہب کے مطالعہ میں صرف کر دے۔"

(بحوالہ "بدر" قادیان ۱۸ جون ۱۹۰۸ء صفحہ ۲، ۳)

"تہذیبِ نسواں" لاہور میں سیّد ممتاز علی صاحب نے لکھا:-

"مرزا صاحب مرحوم نہایت مقدس اور برگزیدہ بزرگ تھے اور نیکی کی ایسی قوّت رکھتے تھے جو سخت سے سخت دِلوں کو تسخیر کر لیتی تھی۔ وہ نہایت باخبر عالم، بلند ہمّت مُصلح اور پاک زندگی کا نمونہ تھے۔ ہم انہیں مذہباً مسیح موعود تو نہیں مانتے تھے لیکن اُن کی ہدایت و رہنمائی مُردہ رُوحوں کے لئے واقعی مسیحائی تھی۔"[1]

منشی سراج الدین صاحب (والد ماجد مولانا ظفر علی خاں صاحب) ایڈیٹر اخبار "زمیندار" نے لکھا:

"آپ بناوٹ اور افترا سے بَری تھے۔ مسیح موعود یا کرشن کا اَوتار ہونے کے دعاوی جو آپ نے کئے، اُن کو ہم ایسا ہی خیال کرتے ہیں جیسا کہ منصُور کا دعوٰی اَنا الحق تھا۔۔۔ گو ہمیں ذاتی طور پر مرزا صاحب کے دعاوی یا الہامات کے قائل اور معتقد ہونے کی عزّت حاصل نہ ہوئی۔ مگر ہم اُن کو ایک پکّا مسلمان سمجھتے تھے۔"[2]

"کرزن گزٹ" دہلی کے ایڈیٹر مرزا حیرت دہلوی صاحب نے لکھا:

"مرحوم کی وہ اعلٰے خدمات جو اُس نے آریوں اور عیسائیوں کے مقابلہ میں اسلام کی کی ہیں، وہ واقعی بہت ہی تعریف کی مستحق ہیں۔ اُس نے مناظرہ کا بالکل رنگ ہی بدل دیا اور ایک جدید لٹریچر کی بنیاد ہندوستان میں قائم کر دی۔ بحیثیت ایک مسلمان ہونے کے بلکہ محقق ہونے کے ہم اِس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ کسی بڑے سے بڑے آریہ اور بڑے سے بڑے پادری کو یہ مجال نہ تھی کہ وہ مرحوم کے مقابلہ میں زبان کھول سکتا۔۔۔ اگرچہ مرحوم پنجابی تھا مگر اُس کے قلم میں اس قدر قوّت تھی کہ آج سارے پنجاب بلکہ بلندیٔ ہند میں بھی اس قوّت کا کوئی لکھنے والا نہیں۔۔۔ اُس کا پُرزور لٹریچر اپنی شان میں بالکل نرالا ہے اور واقعی اُس کی بعض عبارتیں پڑھنے سے ایک وجد کی سی حالت طاری ہو جاتی ہے۔۔۔ اس نے ہلاکت کی پیشگوئیوں، مخالفتوں اور نکتہ چینیوں کی آگ میں سے ہو کر اپنا رستہ صاف

---

[1] بحوالہ تشحیذ الاذہان جلد ۳ نمبر ۱۰ ۱۹۰۸ء صفحہ ۳۸۳ [2] بحوالہ "بدر" قادیان ۲۵ جون ۱۹۰۸ء صفحہ ۱۳

کیا اور ترقی کے انتہائی عروج تک پہنچ گیا"۔[۱]

"آریہ پتر کا" نے لکھا:

"عام طور پر جو اسلام دُوسرے مسلمانوں میں پایا جاتا ہے اُس کی نسبت آپ کے خیالات اسلام کے متعلق زیادہ وسیع اور زیادہ قابلِ برداشت تھے۔ مرزا صاحب کے تعلقات آریہ سماج سے کبھی بھی دوستانہ نہیں ہوئے اور جب ہم آریہ سماج کی گذشتہ تاریخ کو یاد کرتے ہیں تو اُن کا وجود ہمارے سینوں میں بڑا جوش پیدا کرتا ہے"۔[۲]

"اِندر" لاہور نے لکھا:۔

"اگر ہم غلطی نہیں کرتے تو مرزا غلام احمد صاحب ایک صفت میں حضرت محمد (صلعم) صاحب سے بہت مُشابہت رکھتے تھے اور وہ صفت اُن کا استقلال تھا۔ خواہ وہ کسی مقصود کو۔۔۔ لے کر تھا۔ اور ہم خوش ہیں کہ وہ آخری دَم تک اس پر ڈٹے رہے اور ہزاروں مخالفتوں کے باوجود ذرا بھی لغزش نہیں کھائی"۔[۳]

"برمھ پرچارک" نے لکھا:۔

"ہم یہ تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ وہ کیا بلحاظ لیاقت اور کیا بلحاظ اخلاق اور شرافت کے ایک بڑے پایہ کے انسان تھے"۔[۴]

"پاؤنیر" الہ آباد نے لکھا:۔

"اگر پچھلے زمانہ کے اسرائیلی نبیوں میں سے کوئی نبی عالم بالا سے واپس آکر دُنیا میں اس وقت تبلیغ کرے تو بیسویں صدی کے حالات میں اس سے زیادہ غیر موزوں نہ ہوگا جیسے کہ مرزا غلام احمد قادیانی معلوم ہوتے تھے۔۔۔ مرزا غلام احمد صاحب کو اپنے متعلق کبھی کوئی شک نہیں ہُوا۔ اور وہ کامل صداقت اور خلوص سے اس بات کا یقین رکھتے تھے کہ اُن کو خارقِ عادت طاقت بخشی گئی ہے ۔۔۔ انہوں نے بشپ ویلڈن (بشپ لیفرائے چاہیئے۔ ناقل) کو۔۔۔ چیلنج دیا کہ نشانوں میں اُن کا مقابلہ کریں۔۔۔ اور اس مقابلہ کا یہ نتیجہ قرار دیا کہ تا فیصلہ ہو کہ

۱؎ بحوالہ "سلسلہ احمدیہ" ص۱۸۹ ۲؎ ۳؎ بحوالہ تشحیذ الاذہان ۱۹۰۸ء ص۳۴۴ ۴؎ بحوالہ تشحیذ الاذہان ۱۹۰۸ء ص۳۸۲

سچا مذہب کون سا ہے ... بہرحال قادیان کا نبی ایک ایسا انسان تھا جو ہر روز دُنیا پر نہیں آیا کرتے۔ اُن پر سلامتی ہو۔"[۱]

مولوی نور محمد صاحب نقشبندی نے لکھا:-

"اُسی زمانہ میں پادری لیفرائے پادریوں کی ایک بہت بڑی جماعت لے کر اور حلف اُٹھا کر ولایت سے چلا کہ تھوڑے عرصہ میں تمام ہندوستان کو عیسائی بنا لُوں گا۔ ولایت کے انگریزوں سے روپیہ کی بہت بڑی مدد اور آئندہ کی مدد کے مسلسل وعدوں کا اقرار لے کر ہندوستان میں داخل ہو کر بڑا تلاطم برپا کیا۔ اسلام کی سیرۃ و احکام پر جو اس کا حملہ ہُوا تو وہ ناکام ثابت ہُوا کیونکہ احکامِ اسلام و سیرۃ رسولؐ اور احکامِ انبیاء بنی اسرائیل اور اُن کی سیرۃ جن پر اس کا ایمان تھا یکساں تھے۔ پس الزامی و نقلی و عقلی جوابوں سے ہار گیا۔ مگر حضرت عیسےٰ کے آسمان پر بجسمِ خاکی زندہ ہونے اور دُوسرے انبیاء کے زمین میں مدفُون ہونے کا حملہ عوام کے لئے اس کے خیال میں کارگر ہُوا۔ تب مولوی غلام احمد قادیانی کھڑے ہو گئے اور لفرائے اور اس کی جماعت سے کہا کہ عیسیٰؑ جس کا تم نام لیتے ہو دُوسرے انسانوں کی طرح سے فوت ہو کر دفن ہو چکے ہیں اور جس عیسیٰؑ کے آنے کی خبر ہے وہ مَیں ہوں۔ پس اگر تم سعادت مند ہو تو مجھ کو قبول کر لو۔ اس ترکیب سے اس نے لفرائے کو اس قدر تنگ کیا کہ اس کو اپنا پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا۔ اور اس ترکیب سے اس نے ہندوستان سے لے کر ولایت تک کے پادریوں کو شکست دے دی۔"[۲]

---

[۱] بحوالہ تشحیذ الاذہان جلد ۳ نمبر ۹ ستمبر ۱۹۰۸ء صفحہ ۳۸۰-۳۸۲

[۲] دیباچہ بر ترجمہ قرآن مجید مولوی اشرف علی صاحب تھانوی از مولوی نور محمد صاحب نقشبندی۔ مالک اصح المطابع صفحہ ۳۰

حضرت صاحبزادہ مرزا محمود احمد صاحب

کا ایک تاریخی عہد

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تدفین کے بعد حضرت صاحبزادہ صاحب صبر و عزم کا پیکر بنے ہوئے نہایت وقار کے ساتھ اپنے خالی گھر واپس تشریف لائے۔ وہ گھر جو اپنے پیارے باپ اور مقدس امام کے وجود سے خالی ہو چکا تھا جس میں نہ تو امامت ورثے کے طور پر پیچھے چھوڑی گئی تھی نہ ہی دُنیا کے اموال و اسباب اور نعمتوں کے سامان۔ لیکن جیسا کہ آپ کی بزرگ والدہ نے اپنے سب بچوں کو جمع کر کے وصیت فرمائی، حقیقت میں یہ گھر خالی نہ تھا۔ آپ نے فرمایا:

> "بچو! گھر خالی دیکھ کر یہ نہ سمجھنا کہ تمہارے ابّا تمہارے لئے کچھ نہیں چھوڑ گئے۔ انہوں نے آسمان پر تمہارے لئے دُعاؤں کا بڑا بھاری خزانہ چھوڑا ہے جو تمہیں وقت پر ملتا رہے گا" [۱]

پس اس دن کے بعد کی تاریخ اسی بھاری خزانے کی تقسیم کی تاریخ ہے جو اللہ تعالیٰ کے فضلوں کی صورت میں اس نوجوان پر خصوصیت کے ساتھ اور باقی بہن بھائیوں پر بالعموم حسبِ مراتب اللہ تعالیٰ کی طرف سے قدرِ معلوم کے مطابق نازل ہوتا رہا۔

صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب کی زندگی کا ایک نیا دَور شروع ہوتا ہے اور اس سفر کا آغاز ہوتا ہے جو اپنے مرحوم آقا سے جُدائی کے بعد اس کی دُعاؤں کے سائے تلے آپ کو تنِ تنہا طے کرنا تھا۔ یہ سفر ایک مخصوص منزل کی جانب اور ایک معیّن قبلہ کی طرف تھا جس کی تعیین خود حضرت صاحبزادہ صاحب نے اپنے مرحوم باپ کی نعش مبارک کے سرہانے کھڑے ہو کر کی تھی۔ یہ ایک مقدس عہد تھا جو آپ نے اپنے ربّ سے کیا اور پھر تا زندگی پوری وفا اور عزم اور ہمت کے ساتھ اس پر قائم رہے۔ اپنی زندگی کے اُن عہد آفریں لمحات کا ذکر کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں:۔

---

[۱] الفضل ۱۹ر جنوری ۱۹۶۲ء روایت حضرت سیدہ نواب مبارکہ بیگم صاحبہ مدظلہا

"حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے آخری لمحے تھے اور آپ کے ارد گرد مرد ہی مرد تھے۔ مستورات وہاں سے ہٹ گئی تھیں۔ چارپائی کے تینوں طرف مرد کھڑے تھے۔ میں وہاں جگہ بناکر آپ کے سرہانے کی طرف چلا گیا یا شاید وہاں نسبتاً کم آدمی ہوں۔

میں وہاں کھڑا ہُوا اور میں نے دیکھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی آنکھ کھولتے' اِدھر اُدھر پھیرتے اور پھر بند کر لیتے۔ پھر کھولتے' اُن کی پتلیاں اِدھر اُدھر مڑتیں اور پھر تھک کر آپ اپنی آنکھوں کو بند کر لیتے۔ کئی دفعہ آپ نے اسی طرح کیا۔ آخر آپ نے زور لگا کر کیونکہ آخری وقت طاقت نہیں رہتی' اپنی آنکھ کو کھولا اور نگاہ کو چکر دیتے ہوئے سرہانے کی طرف دیکھا۔ نظر گھومتے گھومتے جب آپ کی نظر میرے چہرے پر پڑی تو مجھے اس وقت ایسا محسوس ہُوا جیسے آپ میری ہی تلاش میں تھے اور مجھے دیکھ کر آپ کو اطمینان ہوگیا۔ اس کے بعد آپ نے آنکھیں بند کر لیں۔ آخری سانس لیا اور وفات پا گئے۔ اس وقت میں نے سمجھا کہ آپ کی نظر مُجھ کو ہی تلاش کر رہی تھی اور میں نے اپنے ذہن میں سمجھا کہ میں جو دُعائیں کر رہا تھا اس کا یہ نتیجہ ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرما دی کہ میں آخری وقت میں آپ کی آنکھوں کو دیکھ سکوں۔

آپ کی وفات کے معاً بعد کچھ لوگ گھبرائے کہ اب کیا ہوگا۔ انسان انسانوں پر نگاہ کرتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ دیکھو یہ کام کرنے والا موجود تھا یہ تو اب فوت ہوگیا' اب سلسلہ کا کیا بنے گا؟ جب ... اس طرح بعض اَور لوگ مجھے پریشان حال دکھائی دیئے اور میں نے اُن کو یہ کہتے سُنا کہ اب جماعت کا کیا حال ہوگا تو مجھے یاد ہے گو میں اس وقت اُنیس ۱۹ سال کا تھا مگر میں نے اُسی جگہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سرہانے کھڑے ہوکر کہا کہ ــــ

اے خُدا! میں تجھ کو حاضر ناظر جان کر تجھ سے سچے دِل سے یہ عہد کرتا ہوں کہ اگر ساری جماعت احمدیت سے پھر جائے تب بھی وہ پیغام جو

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام
کے ذریعہ تُو نے نازل فرمایا ہے، میں اِس کو
دُنیا کے کونے کونے میں پھیلاؤں گا۔

انسانی زندگی میں کئی گھڑیاں آتی ہیں۔ سُستی کی بھی، چُستی کی بھی۔ علم کی بھی جہالت کی بھی۔ اطاعت کی بھی، غفلت کی بھی۔ مگر آج تک میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ میری گھڑی ایسی چُستی کی گھڑی تھی، ایسی علم کی گھڑی تھی، ایسی عرفان کی گھڑی تھی کہ میرے جسم کا ہر ذرّہ اِس عہد میں شریک تھا اور اس وقت میں یقین کرتا تھا کہ دُنیا اپنی ساری طاقتوں اور قوتوں کے ساتھ مل کر بھی میرے اِس عہد اور اِس ارادہ کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ شاید اگر دُنیا میری باتوں کو سُنتی تو وہ اُن کو پاگل کی بڑ قرار دیتی بلکہ شاید کیا، یقیناً وہ اُسے جنون اور پاگل پن سمجھتی۔ مگر میں اپنے نفس میں اِس عہد کو سب سے بڑی ذمہ داری اور سب سے بڑا فرض سمجھتا تھا اور اِس عہد کے کرتے وقت میرا دل یہ یقین رکھتا تھا کہ میں اِس عہد کے کرنے میں اپنی طاقت سے بڑھ کر کوئی وعدہ نہیں کر رہا بلکہ خدا تعالیٰ نے جو طاقتیں مجھے دی ہیں، انہیں کے مطابق اور مناسبِ حال یہ وعدہ ہے۔"[1]

---

[1] الفضل ۲۱ر جون ۱۹۴۴ء

جماعتِ احمدیہ میں نظامِ خلافت کا قیام

آیئے اب ہم مبصرین اور اُن کی قیاس آرائیوں کو اُن کے حال پر چھوڑتے ہُوئے اس پہلو پر نظر کریں کہ جماعت احمدیہ نے اس نازک موڑ پر کیا رَوش اختیار کی۔ ایک بہت اہم سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ جماعت کے مستقبل کی قیادت کی شکل کیا ہوگی؟ کیا یہ اُن گدّیوں کی نہج پر چل پڑے گی جن میں پیروں کا رُوحانی ورثہ پُر اسرار طریق پر خُود بخود اولاد میں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا رہتا ہے۔ یا جمہوریت کی اس ڈگر پر چل پڑے گی کہ طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں، لہٰذا مذہبی امور میں بھی عوام ہی کا اقتدار چلے گا اور جمہوری طریق پر ایک ایسی مذہبی قیادت کو جنم دیا جائے گا جو نہ صرف عوام کے سامنے جواب دہ ہو بلکہ عوام کی منشا کے رحم وکرم پر رہے۔ جب تک وہ اُسے قابل سمجھیں قیادت پر فائز رکھیں، جب نا اہل تصور کرنے لگیں یا اپنے مزاج کے خلاف پائیں تو اسے ردّ کر دیں۔

تیسرا سوال یہ تھا کہ کیا یہ قیادت وہ طریق اختیار کرے گی جو انبیاءؑ علیھم السلام کی پروردہ جماعتوں کا طریق ہوتا چلا آیا ہے اور جسے سیّد ولد آدم حضرت خاتم النبیّین صلّے اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے وصال پر صحابہ رضوان اللہ علیھم کی جماعت نے اختیار کیا۔ اس طریق کا فلسفہ یہ ہے کہ مذہبی قیادت جب بگڑ جائے تو کسی جمہوری یا آمرانہ طریق پر اس کی اصلاح نہیں ہُوا کرتی بلکہ ایسے مواقع پر ہمیشہ اللہ تعالیٰ خود قیادت کے اہل کسی انسان کو قیادت کے لئے چُنتا اور اپنی نظر کے نیچے اسے ایک جماعت کی تربیت کی توفیق عطا کرتا ہے۔ پس اس کے بعد وہ تربیت یافتہ جماعت اللہ تعالیٰ کے تصرف اور منشا کے مطابق اپنے درمیان سے ایک ایسے متقی شخص کا انتخاب کرتی چلی جاتی ہے جو خدا تعالیٰ کے فرستادہ مامور کی نیابت کرتا ہے۔ اس طریق پر جب اللہ تعالیٰ کی منشا اور مشیّت کے مطابق ایک دفعہ وہ اُن کا امام مقرر ہو جاتا ہے تو پھر تاحینِ حیات وہ اُن کا امام رہتا ہے اور کوئی دنیوی طاقت قیادت کی یہ چادر اس سے چھین نہیں سکتی۔

یہ نائب الرّسول جسے خلیفہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، انسانوں کے سامنے نہیں بلکہ صرف اپنے ربّ کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے۔ گویا جہاں تک مذہبی جمہوریّت کا تعلق ہے اس میں جمہور اللہ تعالیٰ کی مشیت کا آلۂ کار تو ضرور بنائے جاتے ہیں مگر اقتدارِ اعلیٰ خدا ہی کے ہاتھ میں رہتا ہے اور وہی ایک

مقتدر ہستی ہے جس کے سامنے یہ مذہبی قیادت ہمیشہ جواب دہ رہتی ہے۔ یہ بعینہٖ وہی نظامِ خلافت ہے جو حضرت نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیچھے چھوڑا اور حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ اور حضرت علی رضوان اللہ علیھم ایک دوسرے کے بعد مسندِ خلافت پر متمکن ہوئے۔

پس سوال یہ تھا کہ ان تینوں میں سے کون سا نظام اس جماعت کے لئے مناسب اور مفید ہوگا جو حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چل کر اسلام کے احیائے نو کی خاطر قائم کی تھی۔

جماعت احمدیہ نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وصال پر متفقہ طور پر جس طریق پر اجماع کیا وہ خلافتِ راشدہ کا طریق تھا۔ اس کے مقابل پر پیری مُریدی یا بادشاہی کے فرسودہ نظام کو بھی رد کر دیا گیا اور دنیاوی جمہوریت کے اس نظام کو بھی ٹھکرا دیا گیا جو مغربی فلسفہ کی پیداوار ہے

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حضورؑ کے وصال کے بعد آپ کی تدفین سے پہلے جب آپ کی نعش مبارک بہشتی مقبرہ میں تدفین کے لئے لائی گئی تو جماعت کے برسرآوردہ لوگوں نے باہم مشورہ سے نئے امام کی جانشینی کے مسئلے پر غور کرنا شروع کیا۔ مکرم خواجہ کمال الدین صاحب نے جن کو اللہ تعالیٰ نے حضرت صاحب کی وفات سے دو چار روز پہلے رویا میں یہ دکھایا تھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے وصال کے بعد حضرت حکیم نورالدین صاحب آپ کی جانشینی کریں گے۔ بزرگانِ جماعت اور انجمن کے سرکردہ ممبروں میں حضرت حکیم مولوی نورالدین صاحب کو خلیفہ منتخب کرنے کے بارہ میں رائے ظاہر کی۔ تمام احبابِ جماعت کی نظریں پہلے ہی اس بزرگ اور عاشقِ صادق غلام پر پڑ رہی تھیں چنانچہ بلا توقف ہر ایک نے آپ کے حق میں رائے دی۔ البتہ مولوی محمد احسن صاحب سے جب پوچھا گیا تو انہوں نے مشورہ دیا کہ حضرت مرزا بشیرالدین محمود احمد صاحب سے بھی مشورہ کر لینا ضروری ہے۔ چنانچہ جب آپ سے مشورہ لیا گیا تو آپ نے نہایت شرح صدر سے اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے فرمایا:۔

> "حضرت مولانا سے بڑھ کر کوئی نہیں اور خلیفہ ضرور ہونا چاہیئے اور حضرت مولانا ہی خلیفہ ہونے چاہئیں ورنہ اختلاف کا اندیشہ ہے اور حضرت اقدسؑ کا ایک الہام ہے کہ اس جماعت کے دو گروہ ہوں گے ایک کی طرف خدا ہوگا" [1]

حضرت حکیم مولوی نورالدین صاحب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں اکابرینِ جماعت نے جب متفقہ طور پر یہ درخواست کی کہ وہ خلافت کی ذمہ داریاں سنبھال لیں تو آپ نے ایک نہایت پُراز معرفت

---

[1] اصحاب احمد جلد دوم صفحہ ۵۸۹۔ طبع اول ۱۹۵۲ء

تقریر فرمائی جس میں جماعت کو توحید کا سبق دے کر الٰہی خوشخبریوں کے پُورا ہونے کے فلسفہ کے بارہ میں کچھ فرمایا اور پھر اپنے امام منتخب ہونے سے متعلق اپنے دِلی جذبات اور خیالات کا ان الفاظ میں اظہار فرمایا:-

"میری پچھلی زندگی پر غور کر لو۔ میں کبھی امام بننے کا خواہشمند نہیں ہُوا۔ مولوی عبدالکریم مرحوم امام الصّلوٰۃ بنے تو مَیں نے بھاری ذمہ داری سے اپنے تئیں سُبکدوش خیال کیا تھا۔ میں اپنی حالت سے خُوب واقف ہوں اور میرا ربّ مجھ سے بھی زیادہ واقف ہے میں دُنیا میں ظاہرداری کا خواہشمند نہیں۔ میں ہرگز ایسی باتوں کا خواہشمند نہیں۔ اگر خواہش ہے تو یہ کہ میرا مولیٰ مجھ سے راضی ہو جائے۔ اس خواہش کے لئے میں دعائیں کرتا ہوں۔ قادیان بھی اسی لئے رہا اور رہتا ہوں اور رہوں گا۔ میں نے اس فکر میں کئی دن گزارے' کہ ہماری حالت حضرت صاحبؑ کے بعد کیا ہوگی۔ اسی لئے میں کوشش کرتا رہا کہ میاں محمود کی تعلیم اس درجہ تک پہنچ جائے ... اگر تم میری بیعت ہی کرنا چاہتے ہو تو سُن لو کہ بیعت بِک جانے کا نام ہے"

آخر میں آپ نے ارشاد فرمایا:-

"اب تمہاری طبیعتوں کے رُخ خواہ کسی طرف ہوں تمہیں میرے احکام کی تعمیل کرنی ہوگی۔ اگر یہ تمہیں منظور ہو تو میں طوعاً وکرہاً اس بوجھ کو اٹھاتا ہوں۔ وہ بیعت کے دس شرائط بدستور قائم ہیں۔ ان میں خصوصیت سے میں قرآن کو سیکھنے اور زکوٰۃ کا انتظام کرنے' واعظین کے بہم پہنچانے اور ان امُور کو جو وقتاً فوقتاً اللہ میرے دل میں ڈالے' شامل کرتا ہوں۔ پھر تعلیم دینیات' دینی مدرسے کی تعلیم میری مرضی اور منشا کے مطابق کرنا ہوگی اور میں اس بوجھ کو صرف اللہ کے لئے اُٹھاتا ہوں جس نے فرمایا:

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ اُمَّةٌ يَدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ (آل عمران: ۱۰۵)

یاد رکھو کہ ساری خُوبیاں وحدت میں ہیں جس کا کوئی رئیس نہیں وہ مرچکی"۔[1]

---

[1] الحکم ۶ر جون ۱۹۰۸ء صٓ ۸

اس تقریر کے بعد بیک زبان حاضرین نے بآوازِ بلند یہ عہد کیا کہ ہم آپ کے تمام احکام مانیں گے آپ ہمارے امیر ہیں اور مسیح موعودؑ کے جانشین۔ چنانچہ اس اقرار کے بعد الحاج حضرت حکیم نور الدین خلیفۃ المسیح الاوّلؓ نے جملہ حاضرین سے جنکی تعداد بارہ۱۲ سو تھی۔ بیعتِ خلافت لی اور سلسلہ عالیہ احمدیہ کی تاریخ میں ایک نیا دن طلوع ہوا۔

یہ دن قدرتِ ثانیہ کا دن تھا جس نے تا ابد جماعت احمدیہ کے ساتھ رہنا تھا اور جس کی خوشخبری حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے جماعت کو دی تھی۔ چنانچہ "شہادت القرآن" میں آپ فرماتے ہیں :۔

"چونکہ کسی انسان کے لئے دائمی طور پر بقا نہیں لہٰذا خدا تعالیٰ نے یہ ارادہ کیا کہ رسولوں کے وجود کو جو کہ تمام دنیا کے وجودوں سے اشرف و اَولیٰ ہیں ظلّی طور پر ہمیشہ کے لئے تا قیامت قائم رکھے۔ سو اسی غرض سے خدا تعالیٰ نے خلافت کو تجویز کیا تا دُنیا کبھی اور کسی زمانہ میں برکاتِ رسالت سے محروم نہ رہے۔"

اسی طرح رسالہ الوصیّت میں آپ فرماتے ہیں :۔

"خدا تعالیٰ کی سُنّت ہے اور جب سے اس نے انسان کو زمین میں پیدا کیا ہمیشہ اس سُنّت کو ظاہر کرتا رہا کہ وہ اپنے نبیوں اور رسولوں کی مدد کرتا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے :

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ (المجادلہ : ۲۲)

اور غلبہ سے مراد یہ ہے کہ جیسا کہ رسولوں اور نبیوں کا منشاء ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی حُجّت زمین پر پُوری ہو جائے اور اس کا مقابلہ کوئی نہ کر سکے اس طرح خدا تعالیٰ قوی نشانوں کے ساتھ ان کی سچائی ظاہر کر دیتا ہے اور جس راستبازی کو وہ دُنیا میں پھیلانا چاہتے ہیں اس کی تخمریزی انہیں کے ہاتھ سے کر دیتا ہے لیکن اس کی پُوری تکمیل اُن کے ہاتھ سے نہیں کرتا بلکہ ایسے وقت میں اُن کو وفات دے کر جو بہ ظاہر ایک ناکامی کا خوف اپنے ساتھ رکھتا ہے، مخالفوں کو ہنسی اور ٹھٹھے اور طعن اور تشنیع کا موقعہ دے دیتا ہے اور جب وہ ہنسی ٹھٹھا کر چکتے ہیں تو پھر ایک دُوسرا ہاتھ اپنی قدرت کا دکھاتا ہے اور ایسے اسباب پیدا کر دیتا ہے جن کے ذریعہ

وہ مقاصد جو کسی قدر ناتمام رہ گئے تھے اپنے کمال کو پہنچتے ہیں۔
غرض دو قسم کی قدرت ظاہر کرتا ہے۔ اوّل خود نبیوں کے ہاتھ سے اپنی قدرت کا ہاتھ دکھاتا ہے۔ دوسرے ایسے وقت میں جب نبی کی وفات کے بعد مشکلات کا سامنا پیدا ہو جاتا ہے اور دشمن زور میں آجاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اب کام بگڑ گیا اور یقین کر لیتے ہیں کہ اب یہ جماعت نابود ہو جائے گی۔ اور خود جماعت کے لوگ بھی تردّد میں پڑ جاتے ہیں اور اُن کی کمریں ٹوٹ جاتی ہیں اور کئی بدقسمت مرتد ہونے کی راہیں اختیار کر لیتے ہیں۔ تب خدا تعالیٰ دوسری مرتبہ اپنی زبردست قدرت ظاہر کرتا ہے اور گرتی ہوئی جماعت کو سنبھال لیتا ہے۔ پس وہ جو اخیر تک صبر کرتا ہے خدا تعالیٰ کے اس معجزہ کو دیکھتا ہے جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے وقت میں ہُوا جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی موت ایک بے وقت موت سمجھی گئی اور بہت سے بادیہ نشین نادان مُرتد ہو گئے اور صحابہ بھی مارے غم کے دیوانہ کی طرح ہو گئے۔ تب خدا تعالیٰ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو کھڑا کر کے دوبارہ اپنی قدرت کا نمونہ دکھایا اور اسلام کو نابود ہوتے ہوتے تھام لیا۔"

نظامِ خلافت کے استحکام کے لئے جد وجہد

حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ سے کامل اطاعت اور وفا کا تعلّق

ذکر گزر چکا ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے وصال پر جماعت احمدیہ نے سو فی صد اجماع کے ساتھ یہ فیصلہ کیا بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ خدا کی اٹل تقدیر نے خود جماعت کو اس امر پر اکٹھا کر دیا کہ جماعتِ احمدیہ خلافتِ راشدہ کے طریق ہی کو اپنائے گی۔ چنانچہ فیصلہ کے مطابق بفضلہ تعالیٰ تمام جماعت نے حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر کے اپنے عہد کی تجدید کی۔ اس کے باوجود بیعت کرنے والوں میں بعض احباب ایسے بھی شامل تھے جو دل سے نظامِ خلافت کے اختیار کرنے پر راضی نہ تھے اور اگرچہ جماعت کی بہت بھاری اکثریت کے رجحان سے مرعوب ہو کر اُن کی یہ رائے وقتی طور پر دب گئی لیکن اس حد تک بھی مغلوب نہ ہو سکی کہ وہ اُسے ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیتے۔ چنانچہ پہلے پہل دبی زبان سے یہ لوگ اپنی رائے کا اظہار کرتے رہے اور بعد میں ایک باقاعدہ گروہ کی صورت میں اس قسم کا پروپیگنڈہ کرتے لگے جس سے نظامِ خلافت کو شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔

حضرت صاحبزادہ مرزا محمود احمد صاحب جو دل کی گہرائیوں کے ساتھ نظامِ خلافت پر کامل یقین رکھتے تھے۔ اور جانتے تھے کہ اسلام کا اِحیائے نو نظامِ خلافت کے استحکام سے وابستہ ہے، ابتداً ہی سے اس بارہ میں فکرمند اور نگران تھے۔ آپ کی فطری ذہانت نے آپ کو اسی لمحہ اس بارہ میں متنبّہ کر دیا تھا جب ابھی اس فتنہ نے پہلی انگڑائی لی تھی۔ اس صورتِ حال کا ذکر کرتے ہوئے آپ تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی وفات کو ابھی پندرہ دن بھی نہ گزرے تھے کہ خواجہ صاحب (خواجہ کمال الدین صاحب) نے مولوی محمد علی صاحب کی موجودگی میں مجھ سے سوال کیا کہ میاں صاحب! آپ کا خلیفہ کے اختیارات کے متعلق کیا خیال ہے۔ میں نے کہا کہ اختیارات کے فیصلہ کا وہ وقت تھا جب کہ ابھی بیعت نہ ہوئی تھی جب کہ حضرت خلیفہ اوّل نے صاف صاف کہہ دیا کہ بیعت کے بعد تم کو پوری پوری اطاعت کرنی ہوگی۔ اور اس تقریر کو سُن کر ہم نے بیعت کی تو اب آقا کے اختیار مقرر کرنے کا حق غلاموں کو کب حاصل ہے؟ میرے اس جواب کو سُن کر خواجہ صاحب بات کا رُخ بدل گئے اور کہا بات تو ٹھیک ہے۔ میں نے یونہی علمی طور پر بات دریافت کی تھی اور تُرکوں کی خلافت کا حوالہ دے کر کہا کہ چونکہ آج کل لوگوں میں اس کے متعلق بحث شروع ہے اس لئے میں نے بھی آپ سے اس کا ذکر کر دیا، یہ معلوم کرنے کے لئے کہ آپ کی کیا رائے ہے۔ اور اس پر ہماری گفتگو ختم ہو گئی۔ لیکن اس سے بہرحال مجھ پر اُن کا عندیہ ظاہر ہو گیا اور میں نے سمجھ لیا کہ ان لوگوں کے دلوں میں حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کا کوئی ادب اور احترام نہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح خلافت کے اس طریق کو مٹا دیں جو ہمارے سلسلہ میں جاری ہوا ہے۔"[1]

حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداً ہی سے جماعت میں بعض سرکردہ اور دنیاوی تعلیم سے آراستہ احباب کا ایک گروہ ایسا پیدا ہو چکا تھا جو بظاہر تو نظامِ خلافت کی بجائے دنیوی جمہوری نظام کو سلسلہ عالیہ احمدیہ میں رائج کرنے کا خواہشمند نظر آتا تھا لیکن جیسا کہ آئندہ حالات کے تجزیہ سے ظاہر ہوگا' درحقیقت جمہوریت کا دعویٰ محض ایک آڑ تھی جس کے پیچھے ایک مخصوص گروہ کے ذاتی اقتدار کی تمنا کارفرما تھی۔ چنانچہ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے جن میں سرِفہرست مکرم مولانا محمد علی صاحب ایم۔ اے اور مکرم خواجہ کمال الدین صاحب تھے حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کی بیعت بھی بادلِ نخواستہ کی تھی۔ ورنہ بیعت کے بعد

---

[1] اختلافاتِ سلسلہ کی تاریخ کے صحیح حالات صہ۱۳ و خلافتِ احمدیہ کے مخالفین کی تحریک صہ۹

پندرہ دن ہی کے اندر اندر ان کے خیالات میں ایسی نمایاں تبدیلی نہیں آسکتی تھی۔ دراصل یہ لوگ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عمر کے آخری ایام میں آپ کے وصال سے قبل ہی جمہوریت کے ذریعہ جماعت احمدیہ پر قابض ہونے کے خواب دیکھنے لگے تھے۔

اس خیال کے پیدا ہونے کی ایک وجہ یہ تھی کہ وصال سے قریباً تین سال قبل حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے الٰہی منشاء کے تحت ایک ایسا نظام جاری فرمایا تھا جسے نظامِ وصیت کہا جاتا ہے۔ اس نظام کا خاکہ یہ ہے کہ ایسے تمام متقی اور پرہیز گار مخلصین جماعت کو بعد از وفات ایک علیحدہ قبرستان میں دفن کیا جائے جو تادمِ مرگ شریعتِ اسلامیہ کے ظاہر و باطن پر عمل پیرا رہے ہوں اور جو اسلام کو ازسرِ نو دنیا میں غالب کرنے کی خاطر اس حد تک مالی قربانی کرنے کا عہد کریں کہ زندگی بھر اپنی آمد کا ۱/۱۰ حصہ سلسلہ عالیہ احمدیہ کو خدمتِ دین کے لئے پیش کرتے رہیں اور یہ وصیت بھی کریں کہ اُن کی وفات کے بعد اُن کی تمام جائداد کا ۱/۱۰ حصہ سلسلہ عالیہ احمدیہ کی تحویل میں دینی مقاصد پر خرچ کرنے کی غرض سے پیش کر دیا جائے گا۔ ایسے مخلصین کے لئے چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنت کی بشارت تھی اس لئے آپ نے اس مقبرہ کا نام بہشتی مقبرہ تجویز فرمایا۔ اس نظام کو چلانے کے لئے اور اس مخصوص آمد اور جائداد کے انتظام و انصرام کی خاطر آپ نے ایک ایسی انجمن بھی قائم فرمائی جو آپ کی زندگی میں بھی اور آپ کے بعد بھی اس کام کو باحسن طریق سرانجام دیتی رہے۔

اس انجمن کے ممبران میں بہت سے دیگر احباب کے علاوہ مذکورہ بالا دو بزرگان یعنی مولانا محمد علی صاحب اور خواجہ کمال الدین صاحب بھی شامل تھے۔ لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سے اُن کے ذہن میں کچھ اس قسم کا تصوّر قائم ہو گیا کہ گویا یہ انجمن اُن تمام اختیارات میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جانشین ہو گی جو آپ کو بحیثیت مامور من اللہ حاصل تھے۔

اوّل تو اس انجمن کے قیام سے یہ خیال پیدا ہونا کہ گویا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام دُنیا میں کوئی جانشین مقرر فرما رہے ہیں جو آپ کے تمام فرائضِ منصبی کو ادا کرے گا' اس لئے غلط تھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تو یہ انجمن اپنی زندگی ہی میں قائم فرما دی تھی اور آپ کی زندگی ہی میں اس انجمن نے اپنے محدود دائرہ کار میں کام شروع کر دیا تھا۔ پس اس انجمن کو نہ تو اس وقت امام جماعت احمدیہ کا جانشین ہونے کا مقام حاصل ہُوا اور نہ آپ کے وصال کے بعد اس بارہ میں سوچا جا سکتا تھا۔ دوسرے انجمن کے متعلق یہ خیال کر لینا کہ یہ جدید جمہوری نظام کے مشابہ کوئی ادارہ تھا' اس لئے بھی بالبداہت غلط تھا کہ انجمن کے تمام ممبران کو خود حضرت مسیح موعود علیہ السلام

ہی نے مقرر فرمایا تھا اور کوئی ایک ممبر بھی جمہوری طریق پر منتخب نہیں ہوا تھا۔ اس لئے اس انجمن کو کسی جمہوری ادارہ کے مشابہ سمجھ لینا ان لوگوں کے ذہنی اِبہام اور انتشار کی غمازی تو کر سکتا ہے، انجمن کے جمہوری ہونے کے حق میں کوئی دلیل نہیں بن سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ جس طرح جمہوریت کی راہ میں ایسی کوئی روک نہیں کہ چند آدمیوں کی بجائے ایک ہی آدمی کے ہاتھ میں سارے یا اکثر اختیارات سونپ دیئے جائیں۔ اسی طرح شخصی سیادت کے نظام میں بھی ایسی کوئی روک نہیں کہ ایک کی بجائے چند آدمیوں کو بعض اختیارات تفویض کر دیئے جائیں۔ پس محض اس بنا پر کہ چند امور کی نگرانی کے لئے کوئی انجمن قائم کر دی گئی تھی، جمہوریت کا اِستنباط کرنا کم فہمی تھی۔ اگر بفرضِ محال حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا منشاء انجمن کے قیام سے جمہوری نظام کا قیام ہی تھا تو آپ کے وصال کے معاً بعد جمہوری روایت کے مطابق ہی جماعت کو چند اشخاص پر مشتمل ایک نئی انجمن کا انتخاب کرنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ جمہوری اصول کے مطابق آپ کے وصال کے ساتھ ہی آپ کی قائم کردہ انجمن کی قانونی حیثیت ختم ہو جانی چاہیئے تھی اور نئی انتظامیہ چُننے کا حق جمہور کی طرف لَوٹ جانا چاہیئے تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہُوا۔ تاریخ احمدیّت گواہ ہے کہ جماعت نے نئی انجمن کا انتخاب نہیں کیا۔ ہاں نئے امام کا انتخاب ضرور کیا اور انجمن جس طرح حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی زندگی میں آپ کے تابع فرمان تھی، آپؑ کے وصال کے بعد بھی اسی طرح نئے منتخب شدہ امام یعنی حضرت خلیفۃ المسیح الاوّلؓ کے تابع فرمان ہو گئی، اور یقیناً یہ الٰہی تصرّف تھا کہ کسی ایک شخص کو بھی اُس وقت یہ جرأت نہ ہوئی کہ اس کے خلاف کوئی آواز بلند کرتا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے نزدیک اس انجمن کی جو حیثیت تھی اُسے مزید واضح کرنے کے لئے حضرت صاحبزادہ صاحب کی حسب ذیل روایت پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے:۔

> "ایک دن حضرت صاحب اندر آئے تو والدہ صاحبہ سے کہا کہ انہیں (یعنی مجھے) انجمن کا ممبر بنا دیا ہے۔ نیز ڈاکٹر محمد اسماعیل صاحب کو اور مولوی صاحب کو تا کہ اَور لوگ کوئی نقصان نہ پہنچاویں ... آپ کو کہا گیا ۱۴ نام لکھ لئے ہیں۔ حضرت نے فرمایا اَور چاہئیں، باہر کے آدمی بھی ہوں ... اس پر کہا گیا کہ زیادہ آدمیوں سے کورم نہیں پورا ہو گا۔ آپ نے فرمایا اچھا تھوڑے سہی۔ پھر کہا اچھا ایک اَور تجویز کرتا ہوں اور وہ یہ کہ مولوی صاحب کی رائے چالیس آدمیوں کی رائے کے برابر ہو۔
>
> اس وقت میرے سامنے ان لوگوں نے حضرت صاحبؑ کو دھوکا

دیا کہ حضرت! ہم نے مولوی صاحب کو پریذیڈنٹ بنایا ہے اور پریذیڈنٹ کی رائیں پہلے ہی زیادہ ہوتی ہیں۔ حضرت صاحب نے کہا ہاں یہی میرا منشاء ہے کہ ان کی رائیں زیادہ ہوں۔ مجھے اس وقت انجمنوں کا علم نہ تھا کہ کیا ہوتی ہیں ورنہ بول پڑتا کہ پریذیڈنٹ کی ایک ہی زائد رائے ہوتی ہے تو انہوں نے یہ دھوکا دیا۔ پھر تفصیلی قواعد مجھے ہی دیئے گئے تھے اور میں ہی حضرت صاحب کے پاس لے کر گیا تھا۔ اس وقت آپ کوئی ضروری کتاب لکھ رہے تھے۔ آپ نے پوچھا کیا ہے؟ میں نے کہا انجمن کے قواعد ہیں۔ فرمایا لے جاؤ۔ ابھی فرصت نہیں۔ گویا آپ نے اُن کو کوئی وقعت نہ دی۔"[1]

مندرجہ بالا حوالوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے وصال کے معاً بعد بعض اکابرین کی گفتگو سے یہ خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ بعض لوگ جنہوں نے نظامِ خلافت کو دل سے تسلیم نہیں کیا تھا بلکہ حضرت مولوی نور الدین صاحب کے بلند مرتبہ اور جماعت کے عمومی رجحان سے مرعوب ہو کر بیعتِ خلافت میں شامل ہوئے تھے کسی وقت بھی جماعت کے لئے فتنہ کا موجب بن سکتے ہیں اور ایسے خیالات کی ترویج کر سکتے ہیں جو جماعت میں خلافت کی قدر و منزلت کو کم کریں اور جماعت میں نفاق اور افتراق کے بیج بوئیں۔

خلافتِ اُولیٰ پر ابھی بمشکل ایک سال گزرا تھا کہ آپ کے خدشات حقیقت کا جامہ اوڑھ کر سامنے آ گئے اور جماعت میں منظم طریق پر بعض ایسی چہ میگوئیاں کی جانے لگیں جس سے خلافت کے وقار اور مقام کو سخت صدمہ پہنچنے کا احتمال تھا۔

اس صورتِ حال سے متاثر ہو کر حضرت میر محمد اسحاق صاحب رضی اللہ عنہ نے مقامِ خلافت سے متعلق مندرجہ ذیل سوالنامہ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بھجوایا:

۱ صدر انجمن احمدیہ کے تعلقات اس زمانہ میں اور آئندہ زمانہ میں خلافت کے منصب پر بیٹھنے والے (یعنی خلیفہ) کے ساتھ کیسے ہیں اور کیسے ہوں گے۔ یعنی آپس میں کیا فرق ہے اور ہو گا؟

۲ خلیفہ ... بطور خود اشاعتِ اسلام وغیرہ و جماعت احمدیہ کی مدات کا انتظام

---

[1] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۲۲ء صفحہ ۳۷، ۳۸

کرسکتا ہے یا نہیں ؟

۲ خلیفہ کے حکم صدر انجمن مسترد کر سکتی ہے یا نہیں ؟

حضرت خلیفۃُ المسیحِ الاوّل رضی اللہ عنہ نے یہ سوالات سیکرٹری صدر انجمن احمدیہ جناب مولوی محمد علی صاحب ایم۔اے کو بغرض جواب بھجوا دیئے۔ مولوی صاحب موصوف نے ان سوالات سے متعلق اپنا جو جواب بھجوایا، وہ یہ ہے :-

"۱ ـــــ اس وقت خلافت کے منصب پر بیٹھنے والا صدر انجمن احمدیہ کا صدر ہے۔ یعنی جس شخص کو حضرت صاحب نے مجلس معتمدین صدر انجمن احمدیہ کا میرِ مجلس منتخب فرمایا تھا، اسی کو ساری قوم نے اتفاق کے ساتھ خلیفہ منتخب کیا ہے۔ پس وہ اور صدر انجمن احمدیہ ایک ہی چیز ہیں۔ آئندہ جیسا خلیفہ ہوگا ویسے ہی اس کے ساتھ تعلقات ہوں گے۔ علمِ غیب کوئی نہیں جانتا۔ لیکن حضرت صاحب کی وصیّت سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ خلیفہ کا کوئی فردِ واحد ہونا ضروری ہے۔ گو بعض صورتوں میں ایسا ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ اب ہے بلکہ حضرت صاحب نے انجمن کو اپنا خلیفہ بنایا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ خلیفہ ایک ہی شخص ہو بلکہ ایک جماعت بھی ہو سکتی ہے اور یہ اس واسطے بھی ہے کہ انجمن کے واسطے حضرت اقدسؑ نے دُعا کی ہے کہ ایسے امین ہمیشہ اس سلسلہ کو ہاتھ آتے رہیں جو خدا کے لئے کام کریں اور خاص طور پر اگر اس امانت کے قابل کسی ایک فردِ واحد کو سمجھا ہے تو وہ حضرت مولوی نورالدین صاحب ہی ہیں۔

۲ ـــــ انجمن کو ایک مامُور من اللہ نے الہامِ الٰہی کے مطابق قائم کیا ہے اگر کوئی خلیفہ مامُور من اللہ ہو تو وہ مطابق منشاءِ الٰہی اس میں جو چاہے گا تغیّر کر سکے گا، دُوسرے کے واسطے جائز نہیں۔

۳ ـــــ حضرت صاحب نے جائدادوں اور مالوں اور مکانوں کا صرف محافظ ہی نہیں بنایا بلکہ ان کا مالک بھی قرار دیا ہے۔ ہاں صرف یہ روک

ہے کہ اس انجمن کا کوئی ممبر کسی جائداد یا مال کو اپنے ذاتی
اغراض میں خرچ نہیں کرسکتا۔ اور نہ ہی خود انجمن سوائے اغراضِ
سلسلہ کے کسی طرح پر خرچ کرسکتی ہے۔"[۱]

جناب مولوی صاحب کا یہ جواب حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کو حیرت میں ڈالنے والا تھا۔ کیونکہ اس میں خلیفہ کی حیثیت کو اس قدر گرا کر پیش کیا گیا تھا کہ جیسے سوائے بیعت لینے کے اس کا کوئی اور کام ہی نہیں۔

بہرحال مولوی صاحب موصوف کا جواب پڑھ کر حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ نے فرمایا:۔ اِن سوالات کو جواب کے لئے چالیس ایسے آدمیوں کے پاس بھی بھیجا جائے جو جماعت میں نمائندہ حیثیت کے مالک ہوں۔ اور اُن کی رائے سے آپ کو اطلاع دی جائے۔ نیز یہ نمائندے ۳۱؍ جنوری ۱۹۰۹ء کے دن بغرض مشورہ جمع ہوں۔[۲]

یہ سوالات جب دوسرے لوگوں کے پاس پہنچے تو ہر ایک نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق جواب لکھا۔ ممبرانِ انجمن میں سے خواجہ کمال الدین صاحب، ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب، شیخ رحمت اللہ صاحب اور ڈاکٹر سیّد محمد حسین شاہ صاحب کا جواب مولوی محمد علی صاحب کے جواب کے مطابق تھا۔ انہوں نے لکھا:۔

"حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی وصیّت کی رُو سے اُن کی جانشین
انجمن ہے۔ حضرت صاحبؑ نے کسی فردِ واحد کو اپنا جانشین نہیں بنایا۔ یہ
اَور بات ہے کہ اس انجمن نے بالاتفاق آپ کے ہاتھ پر بیعت کرکے آپ
کو اپنا مطاع بنالیا۔ تو اس کا اپنا ذاتی فعل ہے۔ وہ وصیّت کے ماتحت
ایسا کرنے پر مجبور نہ تھی۔"[۳]

علاوہ ازیں خواجہ کمال الدین صاحب نے اپنے مکان پر لاہور کے احمدیوں کا ایک جلسہ بُلوایا، جس میں تقریر کی کہ:۔

"سلسلہ کی تباہی کا خطرہ ہے۔ اصل جانشین حضرت مسیح موعود علیہ السلام
کی انجمن ہی ہے۔ اور اگر یہ بات نہ رہی تو جماعت خطرہ میں پڑجائے گی۔

---

[۱] حقیقتِ اختلاف حصہ اوّل صفحہ ۳۹ تا ۴۱ [۲] حقیقتِ اختلاف صفحہ ۴۱
[۳] تاریخ احمدیت جلد ۴ صفحہ ۲۷۲

اور سلسلہ تباہ ہو جائے گا۔"

اور سب لوگوں سے دستخط لئے گئے کہ حسبِ فرمان حضرت مسیح موعود علیہ السلام جانشین حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی انجمن ہی ہے۔ صرف دو شخص یعنی حکیم محمد حسین صاحب قریشی سیکرٹری انجمن احمدیہ لاہور اور بابو غلام محمد صاحب فورمین ریلوے دفتر لاہور نے دستخط کرنے سے انکار کیا اور جواب دیا کہ ہم تو ایک شخص کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں۔ وہ ہم سے زیادہ عالم اور زیادہ خشیۃ اللہ رکھتا ہے۔ اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا ادب ہم سے زیادہ اس کے دل میں ہے۔ جو کچھ وہ کہے گا ہم اس کے مطابق عمل کریں گے[1]

خلیفۂ وقت کے خلاف اس شورش اور ساز باز کے دوران یہ سوالنامہ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب کی خدمت میں بھی پہنچا۔ آپ اسے پڑھ کر بہت متفکر ہوئے۔ آپ نے بشرح صدر خلیفہ اوّل رضؓ کی بیعت کی تھی اور دل و جان سے عہدِ اطاعت باندھا تھا اور عقلاً بھی آپ خلافت کی ضرورت کے قائل تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپ نے مناسب سمجھا کہ جواب دینے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے حضور بڑی عاجزی اور تضرّع کے ساتھ رجوع کریں اور اسی سے رہنمائی چاہیں۔ اسی حالتِ اضطراب اور دعا میں کئی دن گزر گئے اور آپ کوئی جواب نہ لکھ سکے۔

آخر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی زبان پر یہ آیت جاری ہوئی:

"قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ"

اِس آیت سے آپ کو یہ تفہیم ہوئی کہ جو لوگ خلافتِ احمدیہ کے خلاف ہیں اُن کو خداوند تعالیٰ کی طرف سے کہہ دو کہ یورپ کی تقلید میں کامیابی اور فلاح نہیں۔ یہ دینی سلسلہ ہے اس لئے جس طرح خدا کے نبیوں کے خلیفے ہوتے رہے ہیں، اسی طرح یہاں بھی خلافت ہی ہوگی۔ لیکن اگر وہ باز نہیں آئیں گے تو خدا کو اُن کی کوئی پرواہ نہیں۔ کامیابی اسی میں ہے کہ وہ خدا کے حضور گر جائیں اور زاری کریں۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو خدا کا عذاب موجود ہے ـــ غرض اس طرح سے جب خدا نے آپ پر حقیقت واضح کر دی تو آپ نے اپنی رائے لکھ کر بھیج دی کہ خلیفہ انجمن پر حاکم ہے نہ کہ انجمن خلیفہ پر۔"[2]

نام نہاد علمبردارانِ جمہوریت اور معتقدینِ نظامِ خلافت کے مابین یہ نزاع اتنی اہمیت اختیار کر گیا کہ

---

[1] اختلافاتِ سلسلہ کی تاریخ کے صحیح حالات صہ ۱۹، ۲۰

[2] اختلافاتِ سلسلہ کی تاریخ کے صحیح حالات صہ ۲۲، الفضل ۲۸ ستمبر ۱۹۱۸ء صہ ۱

بالآخر حضرت خلیفۃ المسیح الاوّلؓ کے حکم کے مطابق جماعت کے دو اڑھائی سو نمائندے تاریخِ مقررہ پر اس اہم اور بنیادی مگر انتہائی نازک مسئلہ کے متعلق رائے دینے کے لئے مرکز میں جمع ہوئے۔ ۳۱؍جنوری ۱۹۰۹ء کو شوریٰ منعقد ہونی تھی۔ ۳۰؍تاریخ کو نمائندگان مرکز میں پہنچ چکے تھے۔ ہر ایک دِل آنے والے دِن کے انتظار میں بے چین تھا۔ ۳۱؍تاریخ کی رات بڑی ہی عجیب رات تھی اور یہ دن بڑا ہی نازک دن تھا۔ بہتوں نے قریباً جاگتے ہوئے یہ رات کاٹی۔ اور قریباً سب کے سب تہجّد کے وقت مسجد مبارک میں جمع ہو گئے تاکہ دعا کریں اور اللہ تعالیٰ سے مدد اور رہنمائی چاہیں۔ اس دن اس قدر درد مندانہ دعائیں کی گئیں کہ قادیان کی فضا میں سوائے گریہ و بکا کے کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ جبینیں آستانۂ اُلوہیت پر جھکی ہوئی تھیں اور سجدہ گاہیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ فجر کی اذان کے بعد حضرت خلیفہ اوّلؓ نماز پڑھانے کے لئے مسجد مبارک میں تشریف لائے اور نماز شروع ہوئی۔ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ صبح کی نماز سے قبل آپ کو الہاماً سورۃ بروج کے پڑھنے کا حکم دیا گیا تھا اور بتایا گیا تھا کہ اس کے پڑھنے سے اکثر لوگوں کے دل نرم ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس کے مطابق آپ نے نماز میں اس سورۃ کی تلاوت فرمائی۔ اگرچہ شروع سے لے کر آخر تک ساری ہی نماز سوز و گداز، عجز و نیاز، گریہ و بکا اور تضرّع و خشوع کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ مگر جب آپ اس آیت پر پہنچے کہ :

اِنَّ الَّذِیْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ
ثُمَّ لَمْ یَتُوْبُوْا فَلَھُمْ عَذَابُ جَھَنَّمَ
وَلَھُمْ عَذَابُ الْحَرِیْقِ ۝ (البروج ۸۵:۱۱)

تو مسجد میں دردناک چیخوں سے ایک کہرام مچ گیا اور قلوب خشیتِ الٰہی سے پارہ پارہ ہونے لگے۔ خود حضرت خلیفہ اوّلؓ کی آواز بھی شدّتِ گریہ سے رُک رُک جاتی تھی۔ آپ نے جب دوبارہ اس آیت کی تلاوت فرمائی تو مخلصین جماعت کا دفورِ گریہ سے یہ عالم ہُوا کہ کسی خون میں نہاتے ہوئے مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگے۔ فرشِ مسجد سے کنگرہ ہائے عرش تک آہوں اور چیخ و پکار کا ایک شور بپا تھا۔

اس واقعہ سے متعلق حضرت صاحبزادہ صاحب کا ایک اہم رویا

اُنہی دِنوں حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب نے ایک رویا دیکھا جسے بعد میں

حضرت خلیفہ اوّلؓ کو بھی سُنا دیا گیا تھا۔ آپ فرماتے ہیں :۔

"میں نے رویا میں دیکھا کہ مسجد میں جلسہ ہو رہا ہے اور حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ تقریر فرما رہے ہیں۔ مگر آپ اس حصۂ مسجد میں کھڑے ہیں جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بنوایا تھا۔ اُس حصۂ مسجد میں کھڑے نہیں ہوتے جو بعد میں جماعت کے چندہ سے بنوایا گیا تھا۔ آپ تقریر مسئلہ خلافت پر فرما رہے تھے اور میں آپ کے دائیں طرف بیٹھا ہوں۔ آپ کی تقریر کے دوران میں خواب میں ہی مجھے رقت آگئی اور بعد میں کھڑے ہو کر میں نے بھی تقریر کی جس کا خلاصہ قریباً اس رنگ کا تھا کہ آپ پر لوگوں نے اعتراض کر کے آپ کو سخت دُکھ دیا ہے مگر آپ یقین رکھیں کہ ہم نے آپ کی سچے دِل سے بیعت کی ہوئی ہے اور ہم آپ کے ہمیشہ وفادار رہیں گے۔ پھر خواب میں ہی مجھے انصار کا واقعہ یاد آگیا۔ جب اُن میں سے ایک انصاری نے کھڑے ہو کر کہا تھا' یا رسول اللہ! ہم آپ کے دائیں بھی لڑیں گے اور بائیں بھی لڑیں گے' آگے بھی لڑیں گے اور پیچھے بھی لڑیں گے اور دشمن آپ تک نہیں پہنچ سکے گا جب تک وہ ہماری لاشوں کو روندتا ہوا نہ آوے۔ اُسی رنگ میں مَیں بھی کہتا ہوں کہ ہم آپ کے وفادار ہیں اور لوگ خواہ کتنی بھی مخالفت کریں ہم آپ کے دائیں بھی لڑیں گے اور بائیں بھی لڑیں گے اور آگے بھی لڑیں گے اور پیچھے بھی لڑیں گے۔ اور دشمن آپ کے پاس اس وقت تک نہیں پہنچ سکے گا جب تک وہ ہم پر حملہ کر کے پہلے ہمیں ہلاک نہ کرے۔ قریباً اسی قسم کا مضمون تھا جو رویا میں مَیں نے اپنی تقریر میں بیان کیا۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ جب حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ تقریر کرنے کے لئے مسجد میں تشریف لائے تو اس وقت میرے ذہن سے یہ رویاء بالکل نکل گیا اور بجائے دائیں طرف بیٹھنے کے بائیں طرف بیٹھ گیا۔ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ نے جب مجھے اپنے بائیں طرف بیٹھے دیکھا تو فرمایا' میرے دائیں طرف آ بیٹھو۔ پھر خود ہی فرمانے لگے تمہیں معلوم ہے کہ میں نے تمہیں دائیں طرف کیوں بٹھایا ہے؟ میں نے کہا مجھے تو معلوم

نہیں۔ آپ نے فرمایا تمہیں اپنی خواب یاد نہیں رہی۔ تم نے تو خود ہی خواب میں اپنے آپ کو میرے دائیں طرف دیکھا تھا"[1]

بہرحال مسجد مبارک میں جب لوگ جمع ہو گئے تو اس کے تھوڑی دیر بعد حضرت خلیفۃ المسیح رضی اللہ عنہ گھر سے مسجد میں تشریف لائے۔ کوئی دو اڑھائی سو کا مجمع تھا جس میں اکثر احمدیہ جماعتوں کے نمائندے تھے۔ بے شک ایک دُنیا دار نا واقف کی نظر میں وہ دو اڑھائی سو بے زر اور بے زور معمولی انسانوں کا ایک مجمع تھا جو کرسیوں اور مسندوں سے عاری ارزاں چٹائیوں کے ایک ادنیٰ فرش پر بیٹھا تھا۔ ممکن ہے یہ اس کی نظر میں ایک معمولی اور ناقابلِ التفات نظارہ ہو۔ لیکن ایک دنیا دار کو کیا خبر کہ خدا کی رضا کی نگاہیں اُن فدائینِ اسلام پر کیسے پیار اور التفات سے پڑ رہی ہوں گی، جن کے دل ایمان کی دولت سے مالا مال اور یقین کی قوت سے پُر تھے اور جو خدا کے وعدوں پر ایک غیر فانی اور غیر متزلزل ایمان رکھتے تھے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ اس مجلس کے ساتھ حقیقی اسلام یعنی احمدیت کی ترقی اور غلبہ کی تقدیر وابستہ ہے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر ایک دِل ہلا دینے والی تقریر کی۔ آپ نے فرمایا

"تم نے اپنے عمل سے مجھے اتنا دُکھ دیا ہے کہ میں اس حصہ مسجد میں بھی کھڑا نہیں ہُوا جو تم لوگوں کا بنایا ہُوا ہے بلکہ میں اپنے مرزا کی مسجد میں کھڑا ہُوا ہُوں

آپ نے اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا۔ میرا فیصلہ ہے کہ قوم اور انجمن دونوں کا خلیفہ مطاع ہے۔ اور یہ دونوں خادم ہیں۔ انجمن مشیر ہے۔ اس کا رکھنا خلیفہ کے لئے ضروری ہے۔ جس نے یہ لکھا ہے کہ خلیفہ کا کام بیعت لینا ہے اصل حاکم انجمن ہے وہ توبہ کرے۔ خدا نے مجھے خبر دی ہے کہ اگر اِس جماعت میں سے کوئی تجھے چھوڑ کر مرتد ہو جائے گا تو میں اس کے بدلے تجھے ایک جماعت دُوں گا۔

کہا جاتا ہے کہ خلیفہ کا کام صرف نماز پڑھانا یا جنازہ یا نکاح پڑھا دینا اور یا بیعت لے لینا ہے۔ یہ کام تو ایک مُلاّ بھی کر سکتا ہے۔ اس لئے کسی خلیفہ کی ضرورت نہیں اور میں اس قسم کی بیعت پر تھُوکتا بھی نہیں بیعت

---

[1] خلافت احمدیہ کے مخالفین کی تحریک صہ ۱۵-۱۷

وہی ہے جس میں کامل اطاعت کی جائے اور جس میں خلیفہ کے ایک حکم سے بھی انحراف نہ کیا جائے۔ حضرت خلیفۃ المسیحؓ نے اپنی تقریر میں یہ بھی فرمایا کہ میں ان لوگوں کے طریق کو بھی پسند نہیں کرتا جنہوں نے خلافت کے قیام کی تائید میں جلسہ کیا ہے[۱] اور فرمایا جب ہم نے لوگوں کو جمع کیا تھا تو اُن کا کوئی حق نہ تھا کہ وہ الگ جلسہ کرتے۔ ہم نے اُن کو اس کام پر مقرر نہیں کیا تھا اور پھر جبکہ خُدا نے مجھے یہ طاقت دی ہے کہ میں اس فتنہ کو مٹا سکوں تو اُنہوں نے یہ کام خود بخود کیوں کیا۔"[۲]

حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کی یہ تقریر اتنی پُرجوش اور مویّد من اللہ تھی کہ اکثر دِل موم کی طرح پگھل گئے اور سامعین پر خُوب واضح ہو گیا کہ خلافت کی کیا عظمت ہے اور خلیفہ کا مقام کیا ہے مجلس پر رقّت کا ایک عجیب سماں طاری تھا۔ حتّٰی کہ درد و کرب کی شدّت سے مغلوب ہو کر بعض احباب تو زخمی پرندوں کی طرح زمین پر گر کر لوٹنے اور تڑپنے لگے۔

تقریر کے بعد آپ نے خواجہ کمال الدین صاحب، مولوی محمد علی صاحب اور ایک دو اور احمدیوں سے فرمایا کہ اس فتنے کے بانی ہونے کی بنا پر آپ لوگ دوبارہ بیعت کریں۔ اسی طرح قادیان میں حضرت صاحب کے منشائے کے خلاف جلسہ کرنے کی وجہ سے حضرت شیخ یعقوب علی صاحب عرفانی کو بھی ارشاد ہُوا کہ وہ تجدیدِ بیعت کریں۔ چنانچہ یہ سب دوست دستِ خلافت پر تجدیدِ بیعت کر کے گویا نئے سرے سے سلسلہ عالیہ احمدیہ میں داخل ہُوئے۔

حضرت صاحبزادہ مرزا بشیرالدین محمود احمد صاحب نے بھی یہ سمجھ کر کہ یہ عام بیعت ہے، اپنا ہاتھ بیعت کے لئے بڑھایا مگر حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ نے آپ کے ہاتھ کو پرے کر دیا اور فرمایا:
"یہ بات تمہارے متعلق نہیں"[۳]

خواجہ کمال الدین صاحب نے اس بیعت کے وقت صاف لفظوں میں یہ اقرار کیا کہ
"میں آپ کا حکم بھی مانوں گا اور آنے والے خلیفوں کے حکم بھی مانوں گا۔"[۴]

---

[۱] یہ اشارہ اس جلسہ کی طرف ہے جو حضرت شیخ یعقوب علی صاحب عرفانی نے خلافت کی تائید میں اپنے گھر میں بعض دوستوں کو مدعو کر کے کیا تھا اور اس میں خلافت سے وفاداری کے عہد و پیمان کئے گئے تھے۔

[۲، ۳] خلافت احمدیہ کے مخالفین کی تحریک صہ ۱۹

[۴] اندرونی اختلافاتِ سلسلہ احمدیہ کے اسباب، مؤلفہ خواجہ کمال الدین صاحب، صہ

افسوس کہ اس واقعہ پر ابھی چند ماہ ہی گزرے تھے کہ بعض طبیعتیں پھر کجی پر مائل ہوگئیں اور نفاق کی وہ باتیں پھر دوہرائی جانے لگیں جن سے توبہ کرکے حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی تجدید کی گئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خلیفۃ المسیحؓ پر متفرق اعتراضات کرنے کے بعد جماعت میں یہ پروپیگنڈہ بھی کیا جارہا تھا کہ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کو معزول کرکے انجمن کی بالادستی قائم کی جانی چاہیئے۔ اگرچہ اس قسم کی باتوں کا تحریری ریکارڈ موجود نہیں لیکن حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کے ۱۶؍اکتوبر ۱۹۰۹ء کے عید الفطر کے خطبہ سے یہ بات بڑی وضاحت سے مترشح ہوتی ہے کہ منافقین اس حد تک بے باک ہوگئے تھے کہ انہوں نے عزلِ خلیفہ کا مطالبہ شروع کردیا تھا۔ آپ فرماتے ہیں :۔

> ”خدا نے جس کام پر مجھے مقرر کیا ہے۔ میں بڑے زور سے خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اب میں اس کُرتے کو ہرگز نہیں اتار سکتا۔ اگر سارا جہان بھی اور تم بھی میرے مخالف ہوجاؤ تو میں تمہاری بالکل پرواہ نہیں کرتا اور نہ کروں گا ... تم معاہدہ کا حق پُورا کرو۔ پھر دیکھو کس قدر ترقی کرتے ہو اور کیسے کامیاب ہوتے ہو! ... مجھے ضرورتاً کچھ کہنا پڑا ہے۔ اُس کا میرے ساتھ وعدہ ہے کہ میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ مجھے دوبارہ بیعت لینے کی ضرورت نہیں۔ تم اپنے پہلے معاہدہ پر قائم رہو۔ ایسا نہ ہو کہ نفاق میں مبتلا ہوجاؤ۔ اگر تم مجھ میں کوئی اعوجاج دیکھو تو اس کی استقامت کی دعا سے کوشش کرو۔ مگر یہ گمان نہ کرو کہ تم مجھ بڈھے کو آیت یا حدیث یا مرزا صاحب کے کسی قول کے معنے سمجھا لوگے۔ اگر میں گندہ ہوں تو یوں دعا مانگو کہ خدا مجھے دُنیا سے اُٹھا لے۔ پھر دیکھو کہ دُعا کس پر اُلٹی پڑتی ہے۔
>
> توبہ کرو اور دُعا کرو اور پھر دُعا کرو۔ میں فروری گویا نو ماہ سے اس دُکھ میں مُبتلا ہوں۔ اب تم اس بُڈھے کو تکلیف میں نہ ڈالو۔ اس پر رحم کرو۔ اگر میں نے کسی کا مال کھایا تو میں دس گنا دینے کی طاقت رکھتا ہوں۔ اگر میں نے کسی سے طمع کیا ہے تو میں لعنت کرکے کہوں گا کہ ایسا آدمی ضرور لوٹائے
>
> .... ایک اور غلطی ہے' وہ طاعت درمعرُوف کے سمجھنے میں ہے کہ جن کاموں کو ہم معروف نہیں سمجھتے' اس میں اطاعت نہ کریں گے۔ یہ لفظ نبیؐ کریم

صلے اللہ علیہ وسلم کے لیئے بھی آیا ہے وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ
اب کیا ایسے لوگوں نے حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عیوب
کی بھی کوئی فہرست بنالی ہے ؟ اسی طرح حضرت صاحب نے بھی
شرائطِ بیعت میں طاعت در معروف لکھا ہے۔ اس میں ایک سرّ ہے
مَیں تم میں سے کسی پر ہرگز بدظن نہیں۔ میں نے اس لئے ان باتوں کو کھولا ہے تا
تم میں کسی کو اندر ہی اندر دھوکا نہ لگ جائے ... میں ایسے لوگوں کو جماعت
سے الگ نہیں کرتا کہ شاید وہ سمجھیں، پھر سمجھ جائیں، پھر سمجھ جائیں۔ ایسا نہ
ہو کہ اُن کی ٹھوکر کا باعث بنوں۔ میں اخیر میں پھر کہتا ہوں کہ آپس میں تباغض
وتحاسد کا رنگ چھوڑ دو۔ کوئی امرامن یا خوف کا پیش آجاوے، عوام
کو نہ سناؤ۔ ہاں جب کوئی امر طے ہو جائے تو پھر بے شک اشاعت کرو۔

اب میں تمہیں کہتا ہوں کہ یہ باتیں تمہیں ماننی پڑیں گی طوعاً و کرھاً
اور آخر یہ کہنا پڑے گا اَتَيْنَا طَائِعِيْنَ۔ جو کچھ مَیں کہتا ہوں تمہارے بھلے
کی کہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور تمہیں راہِ ہدایت پر قائم رکھے اور خاتمہ
بالخیر کرے۔ آمین۔"[1]

حضرت خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ عنہ کی اس تقریر کے قریباً ڈیڑھ سال کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت صاحبزادہ صاحب کو ایک دفعہ پھر رویا کے ذریعہ خبردار فرمایا کہ جماعتِ احمدیہ کے ایک کمزور حصّے کا ٹوٹ کر الگ ہو جانا مقدر ہے۔ لہٰذا باقی عمارت کی مضبوطی اور تعمیرِ نو کی طرف توجہ ہونی ضروری ہے۔ اس تنبیہہ کے نتیجہ میں آپ نے بعض احتیاطی تدابیر اختیار فرمائیں اور ایک باقاعدہ انجمن کا قیام فرمایا جو خلافت کے ساتھ کامل وابستگی کا عہد کرتے ہوئے سلسلہ عالیہ احمدیہ میں اتحاد و اتفاق قائم رکھنے کے لئے کوشاں رہے۔ اِس کا ذکر کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں :-

"چند دن کا ذکر ہے کہ صُبح کے قریب میں نے دیکھا کہ ایک بڑا محل ہے اور
اس کا ایک حصہ گر رہے ہیں اور اس محل کے پاس ایک میدان ہے۔ اور
اس میں ہزاروں آدمی پتھیروں کا کام کر رہے ہیں اور بڑی سُرعت سے اینٹیں
پاتھتے تھے۔ میں نے پوچھا کہ یہ کیسا مکان ہے اور یہ کون لوگ ہیں، اور اس

---

[1] بدر جلد ۸ نمبر ۵۲ و الحکم ۲۸ اکتوبر ۱۹۰۹ء (بحوالہ تاریخ احمدیت جلد ۴ صفحہ ۲۹۰، ۲۹۱)

مکان کو کیوں گرا رہے ہیں؟ تو ایک شخص نے جواب دیا کہ یہ جماعتِ احمدیہ ہے اور اس کا ایک حصہ اس لئے گرا رہے ہیں تا پُرانی اینٹیں خارج کی جائیں (اللہ رحم کرے) اور بعض کچی اینٹیں پکّی کی جائیں۔ اور یہ لوگ اینٹیں اس لئے پاتھتے ہیں تا اس مکان کو بڑھایا جائے اور وسیع کیا جائے۔ یہ ایک عجیب بات تھی کہ سب پتھیروں کا منہ مشرق کی طرف تھا۔ اس وقت دل میں خیال گزرا کہ یہ پتھیرے فرشتے ہیں اور معلوم ہُوا کہ جماعت کی ترقی کی فکر ہم کو بہت کم ہے بلکہ فرشتے ہی اللہ تعالیٰ سے اِذن پا کر کام کر رہے ہیں۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ جو کوئی کسی کے کام میں اُسے مدد دیتا ہے تو وہ اس کا دوست اور پیارا بن جاتا ہے۔ تو اگر ہم اس وقت ملائکہ کے کاموں میں مدد دیں گے جو خود اپنی ہی مدد ہے، تو ضرور ہے کہ ملائکہ کا ہم سے خاص تعلق ہو جائے اور اس تعلق کی وجہ سے خود ہمارے نفوس کی بھی اصلاح ہو اور ملائکہ ہمارے دلوں میں کثرت سے نیک تحریکیں شروع کر دیں چنانچہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں دو تحریکیں پیدا کیں کہ جن سے سلسلہ کی خدمت مدِّنظر ہے۔ . . .

دُوسری تحریک جو اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں ڈالی ہے کہ ایک انجمن قائم کی جائے جس کے ممبران خصوصیّت سے قرآن و حدیث اور سلسلہ عالیہ احمدیہ کی تبلیغ کی طرف توجہ رکھیں اور افرادِ جماعت میں صُلح و آشتی پیدا کرنے کی کوشش کریں اور اس کے ممبران اپنے دنیاوی کام کرتے ہوئے بھی اپنے آپ کو دین کے لئے وقف کر دیں . . .

. . . کام تو اللہ ہی نے کرنا ہے۔ ہماری تو کوششیں ہی ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ کوشش کی توفیق بھی اللہ تعالیٰ ہی دیتا ہے۔ یہ مت سمجھو کہ ہم اس کام کے لائق نہیں۔ اگر ہمّت و استقلال ہو اور خدا تعالیٰ سے سچا تعلق ہو تو پھر وہ خود ہی قرآن و حدیث کا علم سکھا دیتا ہے . . .

اِسلام کا سورج گہن کے نیچے ہے خدا کی حضوری میں تڑپو، آہ وزاری کرو تا وہ گہن دُور ہو اور دُنیا خدا تعالےٰ کا چہرہ دیکھے اور قرآن اور رسولِ

کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی عظمت اس پر ظاہر اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی سچائی سے وہ آگاہ ہو۔ صاف گو بنو اور پیچ اور دھوکے کو چھوڑ دو۔ اور صاف صاف الفاظ میں دُنیا پر وہ سچائیاں ظاہر کرو جو خدا نے تم کو دی ہیں تا قیامت کے دن سُبکدوش ہو کہ ہم نے اپنی طرف سے تبلیغ کر دی تھی۔ کون جانتا ہے کہ میں کل تک زندہ رہوں گا۔ پس ہر ایک انسان کا فرض ہے کہ وہ کل کے آنے سے پہلے ہی اپنے خیالات کا دنیا پر اظہار کرے اور مولیٰ سے جو کچھ ہدایت پائی اُس کو لوگوں پر پیش کرے۔ پھر جس کا دل چاہے مانے اور جو چاہے انکار کر دے۔ حضرت مسیحؑ نے اس تبلیغ کے کام کے لئے اپنے حواریوں کو کہا تھا کہ "مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ" آج میں بھی حضرت مسیحؑ کے تتبع کے طور پر اپنے دوستوں کے آگے یہی کلمہ دُہراتا ہوں کہ اپنی کمر ہمت باندھ کر میرے ساتھ اس کام میں شامل ہو اور جہاں تک ہو سکے اس کام کو کرو تا خدا تعالیٰ کی درگاہ سے انعام کے مستحق ہو۔ یہ سلسلہ تو ضرور پھیلے گا ہی لیکن ہم نے سُستی دکھائی تو ہم انصار کیونکر بنیں گے۔ لیکن چونکہ یہ ایک بڑا عظیم الشان کام ہے۔ اس لئے میں یہ شرط لگانی پسند کرتا ہوں کہ جس نے اس کام میں حصہ لینا ہو وہ پہلے سات دفعہ استخارہ کرے تاکہ اللہ تعالیٰ اس کے کام کا ذمہ دار ہو جائے اور اگر سات دفعہ استخارہ کرنے کے بعد اس کے دل کو اللہ تعالیٰ اس طرف جُھکا دے تو پھر شوق سے اس انجمن میں داخل ہو۔ چنانچہ میں نے بھی اس اعلان کے پہلے خود کئی دفعہ استخارہ کیا اور نہ صرف خود ہی کیا بلکہ کئی ایک نیک اور صالح دوستوں سے بھی استخارہ کروایا اور کئی ایک دوستوں کو اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارات بھی ہوئیں تب جا کر یہ کام میں نے شروع کیا اور استخارہ وغیرہ کرنے کے بعد حضرت خلیفۃ المسیحؓ سے بھی اجازت لی چنانچہ اس انجمن کے وہ قواعد جن کی پابندی ہر ایک ممبر کو لازمی ہوگی، وہ حضرت خلیفۃ المسیحؓ کے حضور پیش کر کے اجازت حاصل کر لی گئی ہے۔"

اس مجلس کے قواعد میں ایک اہم شق یہ بھی تھی کہ :-

"اس مجلس کے ممبر خصوصیت سے حضرت خلیفۃ المسیح کی فرمانبرداری کا خیال رکھیں... " [1]

افسوس! کہ یہ تنبیہات بعض بیمار دلوں پر اثر انداز نہ ہو سکیں بلکہ جُوں جُوں حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کی عمر بڑھتی اور صحت گرتی رہی' مخالفینِ خلافت کو یہ فکر بھی دامنگیر ہونے لگا کہ اگر خلافت کا نظام جاری رہا تو مبادا مرزا محمود احمد ہی کو جماعت اپنا خلیفہ منتخب کرلے۔ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کی اطاعت کا جُوا تو جُوں تُوں نبھایا جا رہا تھا لیکن ایک کم عمر نوجوان کی اطاعت کو قبول کرنا بعض ایسے علماء اور اکابرین کے لئے بہت مشکل تھا جو انجمن کے ممبر ہونے کی وجہ سے اپنے تئیں بہت بلند و بالا خیال کرنے لگے تھے۔ عمر کے ظاہری تفاوت نے مزید مہمیز کا کام دیا اور بڑی بڑی دنیوی ڈگریوں کا غرور اور بھی بیخ پائی کا مُوجب بنا۔ انہیں اپنے سامنے ایک ایسا کم عمر بچہ نظر آرہا تھا جو اگرچہ دنیوی تعلیم کے زیور سے آراستہ نہ تھا لیکن اس کی دینی خدمات اور علم قرآن اور عقل و فراست کا شہرہ اس سُرعت اور وُسعت کے ساتھ پھیل رہا تھا کہ حاسدین کے دِل اس خوف سے لرزاں تھے کہ اگر حضرت خلیفہ اوّلؓ کے وصال کے بعد حسبِ دستور جماعت کے نئے خلیفہ کا انتخاب ہُوا تو اس نوجوان کے سوا جماعت کی نظرِ انتخاب کسی اَور پر نہیں پڑے گی۔

ان حالات کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ایک باقاعدہ اور منظم سازش کے ذریعہ نظامِ خلافت کو سبوتاژ کرنے کی کوششیں ایک دفعہ پھر تیز تر کر دی گئیں اور وہ عہدِ بیعت جس کی تجدید ڈیڑھ سال قبل مسجد مبارک کے صحن میں کی گئی تھی' ایک مرتبہ پھر بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ اور بعینہٖ اس خبر کے موافق جو حضرت صاحبزادہ صاحب کو رویا میں دی گئی تھی' مقامِ خلافت کے بارہ میں ایسی گستاخانہ باتیں دُہرائی جانے لگیں جن کے نتیجہ میں لازماً تفرقہ اور نفاق کا بیج بویا جاتا۔ جب یہ دلآزار باتیں حضرت اقدس خلیفۃ المسیح الاوّلؓ کے کانوں تک پہنچیں تو آپ نے جلسہ سالانہ دسمبر ۱۹۱۱ء کے موقع پر جماعت کو اس بارہ میں نہایت دردمندانہ اور پاک نصائح فرمائیں اور مُقامِ خلافت کو خُوب کھول کھول کر حاضرینِ جلسہ پر واضح فرما دیا۔ آپ نے فرمایا :- "میں خلیفۃ المسیح ہوں۔ اور خُدا نے مجھے بنایا ہے' میری کوئی خواہش

اور آرزو نہ تھی اور کبھی نہ تھی -اب جب خدا تعالیٰ نے مجھے یہ ردا پہنا دی ہے میں اِن جھگڑوں کو ناپسند کرتا ہوں اور سخت ناپسند

---

[1] "بدر" قادیان ۲۳ فروری ۱۹۱۱ء صہ ۲

کرتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم میں ایسی باتیں پیدا ہوں جو تنازع کا موجب ہوں... تم کو کیا معلوم ہے کہ قوم میں تفرقہ کے خیال سے بھی میرے دل پر کیا گزرتی ہے؟ تم اس درد سے واقف نہیں۔ تم اس تکلیف کا احساس نہیں رکھتے جو مجھے ہوتی ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں اور خدا ہی کے فضل سے یہ ہوگا کہ میں تمہارے اندر کسی قسم کے تنازعہ اور تفرقہ کی بات نہ سنوں بلکہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھوں کہ تم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا عملی نمونہ ہو:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا

.... میں پھر تمہیں کہتا ہوں جو سنتا ہے وہ سن لے اور دوسروں کو پہنچا دے کہ جھگڑا مت کرو۔ ہم مر جائیں گے پھر تمہیں بہت سے موقعے جھگڑنے کے ہیں۔ تم سمجھتے ہو میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرح آسانی سے خلیفہ بن گیا ہوں؟ تم اس حقیقت کو سمجھ نہیں سکتے اور نہ اس دُکھ کا اندازہ کر سکتے ہو اور نہ اس بوجھ کو سمجھ سکتے ہو جو مجھ پر رکھا گیا ہے۔ یہ خدا کا فضل ہے کہ میں اس بوجھ کو برداشت کر سکا۔ تم میں سے کوئی بھی نہیں جو اس کو برداشت تو ایک طرف محسوس بھی کر سکے۔ کیا وہ شخص جس کے ساتھ لاکھوں انسانوں کا تعلق ہو آرام کی نیند سو سکتا ہے؟"[1]

نیز فرمایا:-

"میں اس مسجد میں قرآن کریم ہاتھ میں لے کر اور خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے پیر بننے کی ہرگز خواہش نہیں اور نہ تھی اور قطعاً خواہش نہ تھی۔ خدا تعالیٰ کے منشاء کو کون جان سکتا ہے۔ اس نے جو چاہا کیا۔ تم سب کو پکڑ کر میرے ہاتھ پر جمع کر دیا اور اس نے آپ، نہ تم میں سے کسی نے مجھے خلافت کا کُرتا پہنا دیا۔ میں اس کی عزت اور ادب کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں باوجود اس کے میں تمہارے مال اور تمہاری کسی بات کا بھی روادار نہیں اور میرے دل میں اتنی بھی خواہش نہیں کہ کوئی مجھے سلام کرتا ہے یا

---

[1] "بدر" قادیان ۲۵ رجنوری ۱۹۱۲ء صہ ۶

نہیں۔ تمہارا مال جو میرے پاس نذر کے رنگ میں آتا تھا۔ اس سے پہلے اپریل تک میں اسے مولوی محمد علی کو دے دیا کرتا تھا۔ مگر کسی کو غلطی میں ڈالا اور اس نے کہا کہ یہ ہمارا روپیہ ہے اور ہم اس کے محافظ ہیں۔ تب میں نے محض خدا کی رضا کے لئے اس روپیہ کو دینا بند کر دیا کہ میں دیکھوں یہ کیا کر سکتے ہیں۔ ایسا کہنے والے نے غلطی کی' نہیں' بے ادبی کی۔ اسے چاہیئے کہ وہ توبہ کرے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ وہ توبہ کرے۔ اب بھی توبہ کرلیں۔ ایسے لوگ اگر توبہ نہ کریں گے تو ان کے لئے اچھا نہ ہو گا ... تم خوب یاد رکھو کہ معزول کرنا اب تمہارے اختیار میں نہیں۔ تم مجھ میں عیب دیکھو' آگاہ کر دو مگر ادب کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ خلیفہ بنانا انسان کا کام نہیں۔ یہ خدا تعالیٰ کا اپنا کام ہے ... پس مجھے اگر خلیفہ بنایا ہے تو خدا نے بنایا ہے۔ اور اپنے مصالح سے بنایا' ہاں تمہاری بھلائی کے لئے بنایا ہے۔ خدا تعالیٰ کے بنائے ہوئے خلیفہ کو کوئی طاقت معزول نہیں کر سکتی' اس لئے تم میں سے کوئی مجھے معزول کرنے کی قدرت اور طاقت نہیں رکھتا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے معزول کرنا ہو گا تو وہ مجھے موت دے دے گا۔ تم اس معاملہ کو خدا کے حوالے کرو۔ تم معزول کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ میں تم میں سے کسی کا بھی شکر گزار نہیں ہوں۔ جھوٹا ہے وہ شخص جو کہتا ہے کہ ہم نے خلیفہ بنایا۔ مجھے یہ لفظ ہی دکھ دیتا ہے۔ جو کسی نے کہا کہ پارلیمنٹوں کا زمانہ ہے' دستوری حکومت ہے .... مجھے وہ لفظ خوب یاد ہیں کہ ایران میں پارلیمنٹ ہو گئی اور دستوری حکومت کا زمانہ ہے۔ انہوں نے اس قسم کے الفاظ بول کر جھوٹ بولا' بے ادبی کی ... خوب یاد رکھو اور سن رکھو میری امانت' دیانت کی حفاظت تم سے نہیں ہو سکتی۔ اور کوئی بھی نہیں کر سکتا ... مجھے تم میں سے کسی کا خوف نہیں اور بالکل نہیں۔ ہاں میں صرف خدا ہی کا خوف رکھتا ہوں۔ پس تم ایسی بدگمانی نہ کرو اور توبہ کرو۔ اگر ہمارا گناہ ہے' ہمارے ہی ذمہ رہنے دو۔ اگر میں غلطی کرتا ہوں اس بڑھاپے اور اس عمر میں قرآن مجید نے نہیں سمجھایا تو پھر تم کیا سمجھاؤ گے؟ میری حالت یہ ہے کہ بیٹھتا ہوں تو پیر دکھی ہوتے ہیں۔ کھڑا

ہوتا ہوں تو محض اِس نیت سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر خُطبہ پڑھتے تھے۔ میں نہیں جانتا میرا کتنا وقت ہے… مجھے کیا معلوم ہے کہ پھر کہنے کا موقعہ ملے گا یا نہیں؟ موقعہ ہو تو توفیق ہو یا نہ ہو۔ اس لئے میں نے ضروری سمجھا کہ تم کو حق پہنچا دُوں۔ پس میری سُنو اور خدا کے لئے سُنو۔ اسی کی بات ہے جو میں سنانا چاہتا ہوں، میری نہیں کہ:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا "[1]

حضرت اقدس خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کی اس نہایت پُر درد اور مؤثر تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ جو فتنہ ۱۹۰۹ء میں بظاہر دَب گیا تھا، وہ پھر بڑی شدت سے سر اُٹھانے لگا تھا اور نظامِ خلافت کو مٹانے کی کوششیں ایک بار پھر تیز کر دی گئی تھیں۔ افسوس کہ مسجد مبارک کے مقدس صحن میں مخلصین کی آہ و بکا کے درمیان عہدِ بیعت کی جو تجدید کی گئی تھی اُسے ایک بار پھر نسیاً منسیاً کر دیا گیا۔ اور جمہوریت کے نام پر انجمن کے اقتدارِ اعلیٰ کا ڈھول ایک مرتبہ پھر اُسی زور و شور سے پیٹا جانے لگا۔

اس فتنہ کا ایک پہلو تو وہی تھا جس کا حضرت خلیفۃ المسیح کی محولہ بالا تقریر میں صراحتاً ذکر ہے ایک اور پہلو یہ تھا کہ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود احمد کو نظامِ خلافت کے دشمن اپنی راہ میں حائل دیکھ کر آپ کے خلاف بھی طرح طرح کی ریشہ دوانیوں میں مصروف ہو گئے۔ ایک طرف تو یہ کہا جانے لگا کہ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کو انجمن نے اپنے اختیار سے خلیفہ بنایا ہے لیکن اقتدارِ اعلیٰ اس کے باوجود انجمن ہی کے ہاتھ میں ہے اور خلیفہ انجمن کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کرسکتا۔ نیز یہ بھی برملا کہا جانے لگا کہ انجمن کا یہ فعل بھی ایک غلطی تھا اور آئندہ اس قسم کی غلطی کا اعادہ نہیں کیا جائے گا۔ یعنی موجودہ خلیفہ کی موت کے بعد انجمن کسی نئے خلیفہ کے انتخاب کی اجازت نہیں دے گی خواہ کیسے ہی محدود اختیارات کیوں نہ رکھتا ہو۔

دوسرا پہلو اس فتنے نے یہ اختیار کیا کہ حضرت صاحبزادہ صاحب کے بارہ میں مشہور کیا جانے لگا کہ یہ جو نظامِ خلافت کے حامی اور خلیفۃ المسیح کے بڑے مطیع بنے پھرتے ہیں، دراصل یہ محض اس لئے ہے کہ یہ خود خلیفہ بننے کے خواہشمند ہیں۔ احبابِ جماعت میں اس الزام کی اشاعت پہلے پہل تو زبانی سرگوشیوں کے ذریعہ کی جانے لگی۔ پھر گمنام مطبوعہ پمفلٹس کے ذریعہ اس زہریلے خیال کی اشاعت

---

[1] "بدر" قادیان یکم فروری ۱۹۱۲ء صـ ۳ ۴

کی جانے لگی اور ستم ظریفی کی حد یہ ہے کہ خود حضرت خلیفۃ المسیح کو یہ کہہ کر حضرت صاحبزادہ صاحب اور دیگر اہلِ بیت حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے بدظن کرنے کی کوشش کی گئی کہ صاحبزادہ صاحب نہ صرف خود خلیفہ بننے کے خواہشمند ہیں بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ دراصل خلافت کے حق دار تھے ہی وہی، اور حضرت خلیفۃ المسیح کا انتخاب اُن کے نزدیک نعوذ باللہ غلط ہوا ہے۔ اہلِ بیت کے علاوہ آپ کے دیگر رُفقاء کو بھی اس بارہ میں آپ کا ہم نوا بتایا جانے لگا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ بڑے خدا رسیدہ، جہاندیدہ اور صاحبِ فہم و فراست بزرگ تھے اور علمِ لدُنّی اور معرفت کے ایسے اعلیٰ مقام پر فائز تھے کہ ایک لمحہ کے لئے بھی آپ اِن ادنیٰ چالاکیوں سے متأثر نہیں ہو سکتے تھے اور خوب اچھی طرح علم رکھتے تھے کہ کون کھرے اور غیر متزلزل یقین اور خلوص کے ساتھ اُن کا مطیع و فرمانبردار ہے اور کون نہیں۔ چنانچہ آپ نے لاہور کے ایک سفر میں عین اس مقام پر جو اِن افواہوں کا منبع اور مرکز تھا، بڑے واشگاف الفاظ میں فتنہ پردازوں کو متنبہ فرما دیا کہ یہ الزامات محض بے بنیاد ہیں اور خلیفۃ المسیح کو ان لغو کوششوں سے دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ جون ۱۹۱۲ء کو احمدیہ بلڈنگس لاہور میں (جو بعد ازاں منکرینِ خلافت کا مرکز بنا اور تا حال یہی مرکز ہے) آپ نے اپنی تقریر میں فرمایا:-

> "میں نے تمہیں بارہا کہا ہے اور قرآن مجید سے دکھایا ہے کہ خلیفہ بنانا انسان کا کام نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کا کام ہے۔ آدمؑ کو خلیفہ بنایا، کس نے؟ اللہ تعالیٰ نے۔ فرمایا: اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً۔ اس خلافتِ آدم پر فرشتوں نے اعتراض کیا کہ حضور وہ مُفسد فی الارض اور مسفک الدم ہے مگر انہوں نے اعتراض کر کے کیا پھل پایا؟ تم قرآن مجید میں پڑھ لو کہ آخر انہیں آدم کے لئے سجدہ کرنا پڑا۔ پس اگر کوئی مجھ پر اعتراض کرے اور وہ اعتراض کرنے والا فرشتہ بھی ہو تو میں اسے کہہ دوں گا کہ آدم کی خلافت کے سامنے مسجود ہو جاؤ تو بہتر ہے اور اگر وہ اِباء اور استکبار کو اپنا شعار بنا کر ابلیس بنتا ہے تو پھر یاد رکھے کہ ابلیس کو آدمؑ کی مخالفت نے کیا پھل دیا۔
>
> میں پھر کہتا ہوں کہ اگر کوئی فرشتہ بن کر بھی میری خلافت پر اعتراض کرتا ہے تو سعادت مند فطرت اسے اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ کی طرف

لے آئے گی ... اُن کی (حضرت داؤدؑ کی۔ ناقل) مخالفت کرنے والوں نے تو یہاں تک ایجی ٹیشن کی کہ وہ انارکسٹ لوگ آپ کے قلعے پر حملہ آور ہوئے اور کُود پڑے مگر جس کو خدا نے خلیفہ بنایا تھا، کون تھا جو اس کی مخالفت کر کے نیک نتیجہ دیکھ سکے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو خلیفہ بنایا۔ رافضی اب تک اس خلافت کا ماتم کر رہے ہیں۔ مگر کیا تم نہیں دیکھتے کروڑوں انسان ہیں جو ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر درُود پڑھتے ہیں۔

میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے بھی خدا نے خلیفہ بنایا ہے .... اگر کوئی کہے کہ انجمن نے خلیفہ بنایا ہے تو وہ جھُوٹا ہے۔ اس قسم کے خیالات ہلاکت کی حد تک پہنچاتے ہیں۔ تم ان سے بچو۔ پھر سُن لو کہ مجھے نہ کسی انسان نے نہ کسی انجمن نے خلیفہ بنایا۔ اور نہ میں کسی انجمن کو اس قابل سمجھتا ہوں کہ وہ خلیفہ بنائے۔ پس مجھ کو نہ کسی انجمن نے بنایا اور نہ میں اس کے بنانے کی قدر کرتا ہوں اور اس کے چھوڑ دینے پر تھوکتا بھی نہیں اور نہ اب کسی میں طاقت ہے کہ وہ اس خلافت کی ردِا کو مجھ سے چھین لے ....

مرزا صاحب کی اولاد دِل سے میری فدائی ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ جتنی فرمانبرداری میرا پیارا محمود، بشیر، شریف، نواب ناصر، نواب محمد علی خاں کرتا ہے، تم میں سے ایک بھی نظر نہیں آتا۔

میں کسی لحاظ سے نہیں کہتا بلکہ میں ایک امرِ واقعہ کا اعلان کرتا ہوں۔ ان کو خدا کی رضا کیلئے محبّت ہے۔ بیوی صاحبہ کے منہ سے بیسیوں مرتبہ مَیں نے سُنا ہے کہ میں تو آپ کی لونڈی ہوں... میاں محمود بالغ ہے اس سے پوچھ لو کہ وہ سچا فرمانبردار ہے۔ ہاں ایک معترض کہہ سکتا ہے کہ سچا فرمانبردار نہیں مگر نہیں میں خوب جانتا ہوں کہ وہ میرا سچا فرمانبردار ہے اور ایسا فرمانبردار کہ تم (میں سے) ایک بھی نہیں ....

جیسا میں نے ابھی کہا ہے یہ رَفض کا شعبہ ہے۔ جو خلافت کی بحث

تم چھیڑتے ہو یہ تو خدا سے شکوہ کرنا چاہیئے کہ بھیرہ کا رہنے والا خلیفہ ہو گیا۔ کوئی کہتا ہے کہ خلیفہ کرتا ہی کیا ہے؟ لڑکوں کو پڑھاتا رہتا ہے کوئی کہتا ہے کہ کتابوں کا عشق ہے اسی میں مبتلا رہتا ہے۔ ہزار نالائقیاں مجھ پر تھوپو۔ مجھ پر نہیں یہ خدا پر لگیں گی جس نے مجھے خلیفہ بنایا۔ یہ لوگ ایسے ہیں جیسے رافضی ہیں جو ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر اعتراض کرتے ہیں

.... میں باوجود اس بیماری کے جو مجھے کھڑا ہونا تکلیف دیتا ہے اس رقعہ کو دیکھ کر سمجھاتا ہوں کہ خلافت کیسری کی دکان کا سوڈا واٹر نہیں۔ تم اس بکھیڑے سے کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ نہ تم کو کسی نے خلیفہ بنانا ہے اور نہ میری زندگی میں کوئی اور بن سکتا ہے۔ میں جب مر جاؤں گا تو پھر وہی کھڑا ہوگا جس کو خدا چاہے گا اور خدا اس کو آپ کھڑا کر دے گا۔

تم نے میرے ہاتھوں پر اقرار کئے ہیں۔ تم خلافت کا نام نہ لو۔ مجھے خدا نے خلیفہ بنا دیا ہے اور اب نہ تمہارے کہنے سے معزول ہو سکتا ہوں اور نہ کسی میں طاقت ہے کہ وہ معزول کرے۔ اگر تم زیادہ زور دو گے تو یاد رکھو میرے پاس ایسے خالد بن ولید ہیں جو تمہیں مرتدوں کی طرح سزا دیں گے۔

دیکھو! میری دعائیں عرش میں بھی سنی جاتی ہیں۔ میرا مولیٰ میرے کام میری دعا سے بھی پہلے کر دیتا ہے۔ میرے ساتھ لڑائی کرنا خدا سے لڑائی کرنا ہے۔ تم ایسی باتوں کو چھوڑ دو۔ توبہ کرلو.. تھوڑے دن صبر کرو پھر جو پیچھے آئے گا' اللہ تعالیٰ جیسا چاہے گا وہ تم سے معاملہ کرے گا۔"[1]

معلوم ہوتا ہے حضرت خلیفۃ المسیح کے اس واضح اور پُر یقین اعلان کے باوجود کہ صاحبزادہ مرزا محمود احمد سے بڑھ کر جماعت میں کوئی اور آپ کا مطیع نہیں' یہ فتنہ پرداز بے ہودہ سرائی سے باز نہیں آئے اور یہ شر انگیز افواہیں پھیلانے پر مصر رہے کہ دراصل حضرت صاحبزادہ صاحب خود خلیفہ بننے کے

---

[1] "بدر" قادیان ۲۸ جون ۱۹۱۲ء صفحہ ۱۸ تا ۲۲

خواہشمند ہیں۔ اس موقف کو اختیار کرنے اور اس پر اصرار کرنے پر وہ ایک لحاظ سے مجبور بھی تھے۔ احبابِ جماعت کی بھاری اکثریت حضرت صاحبزادہ صاحب سے بوجوہ گہری محبت رکھتی تھی اور آپ کی رائے کو بڑی وقعت اور احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ نظامِ خلافت کے بارہ میں آپ کا موقف بڑا واضح اور غیر مبہم تھا اور خلیفہ کی اطاعت سے متعلق بھی آپ کے نظریات اور آپ کے عمل سے جماعت بخوبی آگاہ تھی۔ پس جب تک آپ کے خلوصِ نیت کو جماعت کی نظر میں مجروح اور مشکوک نہ کیا جاتا، آپ کے قوی موقف کو شکست دے کر نظامِ خلافت کو گزند پہنچانا ممکن نہ تھا۔ منکرینِ خلافت خوب جانتے تھے کہ آپ کو پچھاڑے اور مغلوب کئے بغیر وہ جماعت احمدیہ سے خلافت کے وجود کو کبھی ختم نہیں کر سکتے۔ پس اس سنگِ راہ کو ہر قیمت پہ دور کرنا ان کیلئے ایک لابدی امر تھا۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لئے آپ کے خلاف الزام تراشی اور بدگمانیاں پھیلانے کی مہم ایسی تیز کر دی گئی کہ متعدد احباب اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ کوششیں رفتہ رفتہ ذاتی عناد اور بغض میں تبدیل ہو گئیں اور آپ کی دلآزاری کیلئے مختلف حربے ایجاد کئے جانے لگے۔ ان حربوں میں سے ایک یہ تھا کہ خطوط کے ذریعہ آپ کو مخاطب کر کے نہایت تکلیف دہ الزامات اور طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا جاتا۔ چنانچہ ایسے ہی ایک انتہائی دلآزار خط سے مجروح اور دل شکستہ ہو کر بالآخر آپ نے ایک مطبوعہ خط کے ذریعہ ان تمام الزامات سے اپنی بریت کا اعلان کیا تاکہ احبابِ جماعت پر حقیقتِ حال واضح ہو جائے اور وہ لاعلمی میں اس فتنہ کا شکار نہ ہو جائیں۔ یہ خط من و عن پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ آپ اس گمنام معترض کو جس نے ایک مطبوعہ کھلی چٹھی [1] کے ذریعہ آپ کو ہدفِ ملامت بنایا تھا، مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> "مجھے آپ کے خط کو پڑھ کر جو صدمہ ہوا اُسے تو خدا ہی جانتا ہے لیکن وہ صدمہ کوئی نیا نہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں اس قسم کے الزامات لگائے جانے کا عادی ہوں اور جب سے ہوش سنبھالا ہے غیروں کے ہاتھوں سے نہیں بلکہ اپنے دوستوں ہی کے ہاتھوں سے وہ کچھ دیکھا اور ان زبانوں سے وہ کچھ سنا کہ ؎
>
> دوستوں سے اس قدر صدمے اٹھائے جان پر
> دل سے دشمن کی عداوت کا گلا جاتا رہا
>
> میں ایک گنہگار انسان ہوں اور مجھے پاک و مطہر ہونے کا دعویٰ

---

[1] حضرت صاحبزادہ صاحب نے اصل خط اور اپنا مفصل جواب الفضل ۱۹ نومبر ۱۹۱۳ء میں شائع کروا دیا تھا

نہیں۔ ہر روز مجھ سے غلطیاں ہوتی ہیں اور کون ہے جس سے غلطیاں سرزد نہ ہوتی ہوں۔ لیکن باوجود اس کے جو گناہ سرزد نہ ہوا اس کی طرف منسوب ہونے پر دل گھبراتا ضرور ہے۔ جو حملے آنمکرم نے کئے ہیں اُن کا کوئی ثبوت بھی دیتے تو شاید ان کے جواب دینے کے قابل ہوتا لیکن وہ کہتے ہیں کہ تم نے یوں کیا، یوں کیا۔ اس کا جواب سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ میں نے یوں نہیں کیا۔ اور آپ نے صرف بدظنی سے کام لیا ہے اور اعتراض کرنے میں جلدی کی ہے۔

اگر یہ خط اکیلا آتا اور اس کے سوا اور میں کوئی آواز نہ سنتا تو میں بالکل خاموش رہتا لیکن آج پانچ سال کے قریب عرصہ ہونے کو آیا ہے کہ اس قسم کے اعتراضات میں سنتا آرہا ہوں لیکن پہلے تو افواہاً ان اعتراضات کا علم ہوتا تھا اور اب کچھ مدت سے تحریراً بھی یہ الزامات مجھ پر قائم کئے جانے لگے ہیں اور صرف مجھی تک بس نہیں بلکہ ٹریکٹوں کے ذریعہ یہ خیال تمام جماعتِ احمدیہ میں پھیلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ جن دوستوں تک "اظہارِ حق" نامی ٹریکٹ جو لاہور سے کسی گمنام صاحب کی طرف سے شائع ہوا ہے، پہنچا ہے اور اکثر (لوگوں کو۔ ناقل) پہنچا ہوگا کیونکہ وہ پنجاب و ہندوستان میں بکثرت شائع کیا گیا ہے۔ اُن کو علم ہو گیا ہوگا کہ اب یہ معاملہ زبانوں سے گزر کر تحریر تک اور تحریر سے گزر کر اشاعت تک جا پہنچا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ مجملاً اس کے متعلق کچھ لکھا جائے۔

میں حیران ہوں کہ اس معاملہ پر کچھ لکھوں تو کیا لکھوں۔ آخر وہ کون سے دلائل ہیں جن کو توڑوں۔ جب سب معاملہ کی بنا ہی بدظنی پر ہے تو میں بدظنی میں دلائل کیا دوں۔ عقلی مسئلہ ہو تو اس کا جواب دلائلِ عقلیہ سے دیا جائے۔ لیکن جب یہ معاملہ ہی رویت و سماعت کا ہے تو جب تک میری تحریر یا تقریر سے یہ الزامات مجھ پر ثابت نہ ہو سکتے جائیں اس وقت تک میں ان الزامات کا کیا جواب دے سکتا ہوں

جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے' میں جواب دینے سے مجبور ہوں اور موجودہ صورت میں اور کیا کہہ سکتا ہوں سوائے اس کے کہ یہ کہوں کہ خدا تعالیٰ شاہد ہے اور میں اس کو حاضر ناظر جان کر اسی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے کبھی اس امر کی کوشش نہیں کی کہ میں خلیفہ ہو جاؤں۔ نہ یہ کہ کوشش نہیں کی بلکہ کوشش کرنے کا خیال بھی میرے دل میں نہیں آیا اور نہ میں نے کبھی یہ امید ظاہر کی اور نہ میرے دل نے کبھی خواہش کی اور جن لوگوں نے میری نسبت یہ خیال پھیلایا ہے' انہوں نے میرا خون کیا ہے۔ وہ میرے قاتل اور خدا کے حضور وہ ان الزامات کے جوابدہ ہوں گے۔

جب حضرت صاحب فوت ہوئے ہیں' اس وقت میری عمر اُنیس[۱۹] سال کی تھی اور ہندوستان میں اُنیس[۱۹] سال کی عمر میں ابھی کھیلنے کودنے کے ہی دن سمجھے جاتے ہیں۔ پس میری عمر بچپن کی حالت سے زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ جب سے میں نے یہ جھوٹ بولا جاتے ہوئے سُنا۔ میرے اس دوست نے جس نے مجھے خط لکھا ہے آج یہ اعتراض کیا ہے۔ مگر یہ اعتراض بہت پُرانا ہے اور اس وقت سے میں اس کو سُنتا آرہا ہوں جبکہ میں ابھی اس کی اہمیّت کو بھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ جس وقت خلافت کا جھگڑا ہوا ہے اس وقت میرے کانوں میں یہ آوازیں پڑی تھیں کہ بعض نوجوان خلیفہ بننے کی خواہش میں یہ شورش بپا کر رہے ہیں۔ میرے کان اس بات کو سُنتے تھے مگر میرا دماغ ان کے معنوں کو نہیں سمجھ سکتا تھا کیونکہ میرا دل پاک تھا اور بالکل بے لوث تھا اور اس پر ہوا و ہوس کے غبار نے کوئی اثر نہ کیا تھا۔ میں نے معلوم کیا کہ اِن اُنگلیوں کا اشارہ میری طرف ہے اور اِن اقوال کا مخاطب میں ہوں۔

میری اُس وقت کیا عمر تھی اور ایسے وقت میں میرے دِل پر کیا صدمات گزر سکتے تھے اُسے خدا ہی جانتا ہے۔ میرا کوئی دوست

نہ تھا جس سے میں اس دُکھ کا اظہار کر سکوں کیونکہ میری طبیعت بچپن سے ہی اپنے دکھ لوگوں کے سامنے بیان کرنے سے رُکتی ہے۔ میرے دل پر وہ اقوال خنجر اور تلوار کی ضرب سے بڑھ کر پڑتے تھے اور میرے جگر کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے تھے۔ مگر خدا کے سوا کسی سے اپنے دُکھ کا اظہار نہ کرتا تھا۔ اور اگر کرتا تو لوگ مجھے کیا فائدہ پہنچا سکتے تھے۔ میں نے ان لوگوں کے بُغض سے جنہوں نے یہ باتیں میرے حق میں کہیں ہمیشہ اپنے آپ کو بچائے رکھا اور اپنے دل کو میلا نہ ہونے دیا۔ لیکن

ع مرض بڑھتا گیا جُوں جُوں دوا کی

میں سمجھتا تھا کہ چند دن کا فتنہ ہے جو خود بخود دُور ہو جائے گا مگر اس فتنہ نے اپنی لمبائی میں شبِ ہجر کو بھی مات کر دیا اور گھٹنے کی بجائے اور بڑھا۔ میں نے کبھی معلوم نہیں کیا کہ میرا کیا قصور تھا۔ سوائے اس کے کہ میں مسیح موعود علیہ السلام کا بیٹا تھا کیونکہ اَور بہت سے لوگ موجود ہیں جن پر یہ الزام نہیں لگائے گئے اور لاکھوں احمدیوں کے سر پر یہ بوجھ نہیں رکھا گیا۔ مگر یہ قصور میرا نہیں۔ اس کی نسبت خدا سے سوال کرو۔ اگر یہ کوئی قصور تھا تو اس کا فاعل خدا ہے نہ میں۔ میں خود مسیح موعود علیہ السلام کے ہاں پیدا نہیں ہوا۔ مجھے میرے مولا نے جہاں بھیج دیا میں آ گیا۔ پس خدا کے لئے مجھے اس فعل پر دُکھ نہ دو۔ اس واقعہ کی بنا پر مجھے مت ستاؤ۔ جو میرے اختیار سے باہر ہے جس میں میرا کوئی دخل نہیں۔

غرض ان مشکلات میں اپنے مولا کے سوا میں نے کسی پر توکّل نہیں کیا اور اپنے دل کے دُکھوں پر اس کے سوا کسی کو آگاہ نہیں کیا اور گو میرا دل ایک پھوڑے کی طرح بھرا ہوا تھا مگر سوائے کبھی کبھی اپنی نظموں میں بے اختیار ہو کر اشارۃً اپنے دُکھ کے اظہار کے کبھی اپنے دکھ کا اظہار نہیں کیا۔

مجھے ہمیشہ تعجب آتا رہا ہے کہ لوگ اس قدر بدظنیوں سے کیوں

کام لیتے ہیں۔ مجھ سے تو اس معاملہ پر اگر کسی دوست نے گفتگو کرنی چاہی تو ہمیشہ میں نے یہی کہہ کر ٹال دیا کہ کیا یہ لوگ جانتے ہیں کہ میں کب تک زندہ رہوں گا۔ مگر افسوس کہ ظلم میں کمی آنے کی بجائے وہ اور ترقی کرتا گیا۔ حتّٰی کہ اب وہ اپنے کمال پر پہنچ گیا ہے اور خدا چاہے تو شاید وقت آگیا ہے کہ اب وہ پھر زوال کی طرف رُخ کرے۔ اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ شاید اس شور کا اثر ایک میرے پیارے کے دل پر نہ پڑے تو میں شاید اب بھی جواب کی طرف متوجہ نہ ہوتا مگر اب میں دیکھتا ہوں کہ قوم کو ہلاکت سے بچانے کے لئے کچھ کہنا ضروری ہے۔

میرے باپ پر جس قدر الزام لگائے گئے تھے، یہ الزام اُن کے عشر عشیر بھی نہیں۔ لیکن وہ خدا کے مامور تھے اور اُن سے جو خدا کے وعدے تھے وہ مجھ سے نہیں ——اِس لئے میرا ان پر کڑھنا تعجب کی بات نہیں۔

افسوس میں نے اپنے دوستوں سے وہ سُنا جو یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے نہ سُنا تھا۔ میرا دِل حسرت و اندوہ کا مخزن ہے اور میں حیران ہوں کہ میں کیوں اس قدر موردِ عتاب ہوں۔ بے شک وہ بھی ہوتے ہیں جو غم و راحت میں اپنی عمر گزارتے ہیں۔ مگر یہاں تو

؎ چھاتی قفس میں داغ سے اپنی ہے رشکِ باغ
جوشِ بہار تھا کہ ہم آئے اسیر ہو

اگر میں تبلیغِ دین کے لئے کبھی باہر نکلتا ہوں تو کہا جاتا ہے کہ لوگوں کو پھسلانے کے لئے، اپنی شہرت کے لئے، اپنا اثر و رسوخ پیدا کرنے کے لئے، اپنی حمائتیں بنانے کے لئے نکلتا ہے۔ اور اس کا باہر نکلنا اپنی نفسانی اغراض کے لئے ہے۔ اور اگر میں اس اعتراض کو دیکھ کر اپنے گھر بیٹھ جاتا ہوں تو یہ الزام دیا جاتا ہے کہ یہ دین کی خدمت میں کوتاہی کرتا ہے اور اپنے وقت کو ضائع کرتا ہے اور خالی بیٹھا دین

کے کاموں میں رخنہ اندازی کرتا ہے۔ اگر میں کوئی کام اپنے ذمہ لیتا ہوں تو مجھے سنایا جاتا ہے کہ میں حقوق کو اپنے قبضہ میں کرنا چاہتا ہوں اور قومی کاموں کو اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتا ہوں اور اگر میں دل شکستہ ہو کر جدائی اختیار کرتا ہوں اور علیحدگی میں اپنی سلامتی دیکھتا ہوں تو یہ تہمت لگائی جاتی ہے کہ یہ قومی درد سے بے خبر ہے اور جماعت کے کاموں میں حصّہ لینے کی بجائے اپنے اوقات کو رائیگاں گنواتا ہے۔ مگر مجھے جاننے والے جانتے ہیں کہ میں عام انسانوں سے زیادہ کام کرتا ہوں حتیٰ کہ اپنی صحت کا بھی خیال نہیں رکھتا۔ مگر اسے جانے دو۔ مجھے تم خود ہی بتاؤ کہ وہ کونسا تیسرا رستہ ہے جسے میں اختیار کروں۔ خدا کے لئے مجھے اس طریق سے آگاہ کرو جس پر ان دونوں راستوں کو چھوڑ کر میں قدم زن ہوں۔ للہ مجھے وہ سبیل بتاؤ جسے میں اختیار کروں۔ آخر میں انسان ہوں۔ خدا کے پیدا کئے ہوئے دو راستوں کے علاوہ تیسرا راستہ میں کہاں سے لاؤں؟

صبح شام، رات دن، اُٹھتے بیٹھتے یہ باتیں سُن سُن کر میں تھک گیا ہوں۔ زمین باوجود فراخی کے مجھ پر تنگ ہو گئی ہے اور آسمان باوجود رفعت کے میرے لئے قید خانہ کا کام دے رہا ہے۔ اور میری وہی حالت ہے کہ

حَتّٰۤی اِذَا ضَاقَتْ عَلَیْھِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَیْھِمْ اَنْفُسُھُمْ وَظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰہِ اِلَّاۤ اِلَیْہِ۔[1]

افسوس کہ میرے بھائی مجھ پر تہمت لگاتے ہیں اور میرے بزرگ مجھ پر بدظنّی کرتے ہیں۔ دُنیا میں ڈیڑھ ارب آدمی بستا ہے مگر مجھے تو سوائے خدا کے اور کوئی نظر نہیں آتا۔ لوگ اس دُنیا میں تنہا آتے اور یہاں سے تنہا جاتے ہیں۔ مگر میں تو تنہا آیا اور تنہا رہا اور تنہا جاؤں گا۔ یہ زمین میرے لئے ویران جنگل ہے۔ اور یہ بستیاں اور شہر میرے لئے

---

[1] التوبۃ ۹ : ۱۱۸

قبرستان کی طرح خموش ہیں۔ میرے دوست مجھے اس وقت معاف فرمائیں۔ میں ان کی محبت کا شکر گزار ہوں لیکن میں کیا کروں کہ جہاں میں ہوں وہاں وہ نہیں ہیں۔ میں ان مہربانوں کے مقابلہ میں جو مجھے آئے دن ستاتے رہتے ہیں' ان کی محبّت کی قدر کرتا ہوں۔ اُن کے لئے دُعا کرتا ہوں۔ اپنے رب سے اُن پر فضل کرنے کی درخواست کرتا ہوں لیکن باوجود اس کے میں تنہا ہوں۔ میری مثال ایک طوطے کی ہے جس کا آقا اس پر مہربان ہے اور اسے سے نہایت محبت کرتا ہے اور وہ طوطا بھی اس کے پیار کے بدلے میں اس سے اُنس رکھتا اور اس کی جُدائی کو ناپسند کرتا ہے مگر پھر بھی اس کا دل کہیں اَور ہے اس کے خیال کہیں اَور ہیں۔

میرے آقا کا دلبند میرا مطاع امام حسین رضؓ تو ایک دفعہ کربلا کے ابتلاء میں مُبتلا ہوا لیکن میں تو اپنے والد کی طرح یہی کہتا ہوں کہ ؎

کربلائے است سیر ہر آنم
صد حسین است در گریبانم

اے نادانو! کیا تم اتنا نہیں سمجھتے کہ اگر میرا خدا مجھے بڑا بنانا چاہے تو تم میں سے کون ہے جو اس کے فضل کو ردّ کر سکے اور کون ہے جو میرے مولیٰ کا ہاتھ پکڑ سکے۔

وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ [1]

اور اگر وہ مجھے عزت دینا چاہے تو کون ہے جو مجھے ذلیل کر سکے اور اگر وہ مجھے بڑھانا چاہے تو کون ہے جو مجھے گھٹا سکے اور اگر وہ مجھے اونچا کرنا چاہے تو کون ہے جو مجھے نیچا کر سکے اور اگر وہ مجھے اپنا قرب عطا کرنا چاہے تو کون ہے جو مجھے اس سے بعید کر سکے اور اگر وہ مجھے اپنے پاس بٹھائے تو کون ہے جو مجھے اس سے دُور کر دے۔ پس اپنے آپ

[1] یونس ۱۰ : ۱۰۸

کو خدامت قرار دو کہ عزت دینا اور ذلیل کرنا خدا کے اختیار میں ہے نہ کہ تمہارے ۔ مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا ۔

کسی انسان کی زندگی کا بھی اعتبار نہیں ہوتا مگر میں تو خصوصاً بیمار رہتا ہوں اور چوتھے پانچویں دن مجھے حرارت ہو جاتی ہے اور سخت سردرد کا دورہ ہوتا ہے ۔ چنانچہ اس وقت بھی جبکہ میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں میرے سر میں درد ہے اور بدن گرم ہے اور صرف خدا ہی کا فضل ہے کہ میں یہ چند سطریں لکھنے کے قابل ہوا ہوں اور علاوہ ازیں مجھے اور بھی کئی بیماریاں ہیں ۔ میرا سینہ کمزور ہے ۔ میرا جگر بیمار ہے ۔ میرا معدہ اچھی طرح غذا ہضم نہیں کر سکتا ۔ تمہیں کیا معلوم ہے کہ میں کل تک زندہ رہوں گا یا نہیں کیا جانتے ہو کہ نیا سال مجھ پر چڑھے گا یا نہیں ؟ تم کیوں خواہ مخواہ یوسف عَلَيْهِ السَّلام کے بھائیوں کی طرح کہتے ہو : يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ ۔ میرے تو اپنے پیارے دوسری دُنیا میں ہیں ۔ میرے لئے تو یہ دُنیا خالی ہے میرا مُحَمَّد صلے اللہ علیہ وسلم اُس دُنیا میں ہے ۔ میرا اَحْمَد اُسی دُنیا میں ہے ۔ کیا وہ لوگ زندہ رہے کہ میں رہوں گا ۔ میرے پاس اعمال کا ذخیرہ نہیں اور میرا ہاتھ خالی ہے ۔ لیکن خدا کے فضل سے اُمیدوار ہوں کہ وہ مجھے اُن کے خُدّام میں جگہ دے کیونکہ اُن کے قرب کے بغیر جنت بھی میرے لئے بھیانک ہے ۔

میں تم سے گھبراتا نہیں ۔ میں تمہارے حملوں سے ڈرتا نہیں ۔ کیونکہ میرا خدا پر بھروسہ ہے ۔ لیکن مجھے اگر غم ہے تو اس بات کا کہ قوم میں فتنہ نہ ہو اور یہی غم میرے دل کو کھائے جاتا ہے ۔ مگر مجھے امید ہے کہ خدا تعالیٰ اس جماعت کو بچائے گا اور اس کی مدد کرے گا کیونکہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ وہ ایک پودا اپنے ہاتھ سے لگا کر پھر اسے سُوکھنے دے ۔ ہاں ابتلا کے ایام ہیں جو گزر جائیں گے ۔"[1] (الفضل ۱۹ر نومبر ۱۹۱۳ء)

یہ خط اس مضمون پر حرفِ آخر ہے اور اس کے بعد کسی مزید تبصرہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی

حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ ان دِنوں سخت بیمار اور صاحبِ فراش تھے۔ یہ آپ کی آخری بیماری تھی اور قربِ وصال کے آثار بہت نمایاں ہو چکے تھے۔ چنانچہ اس خط کی اشاعت کے چند ماہ بعد ہی آپ اس عالم گزران سے کوُچ کر کے جان آفرین کے حضور حاضر ہو گئے۔ اس وقت انکارِ خلافت کا فتنہ کس طرح اپنے عروج کو پہنچا' اس کا ذکر بعد میں اپنے محل پر کیا جائیگا۔ فی الحال ہمیں کچھ دیر کے لئے اس ذکر کو تج کرنے کی اجازت دیجئے تاکہ ہم اس دَور میں حضرت صاحبزادہ صاحب کی دیگر علمی اور دینی خدمات اور دوسری متفرق مصروفیات کا کچھ ذکر کر سکیں۔

"وہ جلد جلد بڑھے گا"

حضرت صاحبزادہ مرزا محمود احمد کی جو صفات آپ کی ولادت کی عظیم الشان پیشگوئی میں بیان فرمائی گئی تھیں۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ 'وہ جلد جلد بڑھے گا' اگرچہ آپ کی تمام زندگی ہی اس الہام کی صداقت پر مُہرِ تصدیق ثبت کرتی نظر آتی ہے۔ لیکن خصوصیت کے ساتھ حضرت خلیفۃُ المسیح الاوّلؓ کی خلافت کے چھ سالہ دَور میں آپ کی ذہنی، علمی اور روحانی نشوونما کی رفتار عقل کو حیران کرتی ہے۔

آپ کے مضامین، آپ کی تقریریں، آپ کا سفر، آپ کا حضر، آپ کی انتظامی جدّوجہد، آپ کی بصیرت اور پُر خطر فتنوں پر گہری نظر رکھنا ـــ یہ تمام امور گہرے مطالعہ کے مستحق ہیں۔ لیکن بجائے اس کے ہم اس پر خود کچھ رائے زنی کریں، خود آپ ہی کے نثر و نظم کے بعض اقتباسات، نیز آپ کے ہمعصر مبصّرین کی بعض آرا پر اکتفا کرتے ہیں۔ کیوں نہ ہو! جب خود مُشک بول رہا ہو تو کیا عطّار کی خاموشی بہتر نہیں؟

تقریر و تحریر

خلافتِ اُولیٰ کی ابتدا میں حضرت صاحبزادہ صاحب کی عمر اُنیس ۱۹ سال کی تھی اور حضرت خلیفۃُ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کے وصال کے وقت آپ اپنی عمر کے ۲۶ ویں سال میں داخل ہو چکے تھے۔ اس نوعمری میں آپ کی تقریر و تحریر کا جو رنگ تھا اس کے چند نمونے ناظرین کی خدمت میں پیش کئے جا رہے ہیں۔ آپ کے خیالات اور افکار میں ایک بزرگ مفکر کی سی پختگی آ چکی تھی۔ آپ کے الفاظ اثر اور جذب اور خلوص اور گداز میں گوندھے ہُوئے تھے۔ کلام تصنّع سے ناآشنا تھا اور تحریر تکلّف سے پاک تھی۔ تقریر میں ایک طبعی روانی تھی اور تحریر سلاست کا ایک بہتا ہُوا دریا تھی۔ دونوں ہی قرآنی علوم اور عرفان کے پانی سے لبریز اور دل و دماغ کو بیک وقت سیراب کرتے تھے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی وفات کے بعد ۱۹ سال کی عمر میں آپ نے جو پہلی تقریر کی، اس کے متعلق

ایک صاحبِ علم و فضل بزرگ حضرت مولوی شیر علی صاحب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :۔

"ایک اور واقعہ جس کا میں اس مضمون میں ذکر کرنا چاہتا ہوں، وہ حضورؓ کی پہلی تقریر ہے جو حضور نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی وفات کے بعد پہلے سالانہ جلسہ کے موقعہ پر کی۔ یہ جلسہ مدرسہ احمدیہ کے صحن میں منعقد ہوا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ حضور کے دائیں طرف سٹیج پر رونق افروز تھے۔ سٹیج کا رُخ جانبِ شمال تھا۔ اس تقریر کے متعلق دو باتیں خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ اوّل عجیب بات یہ تھی کہ اس وقت آپ کی آواز اور آپ کی ادا اور آپ کا لہجہ اور طرزِ تقریر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی آواز اور طرزِ تقریر سے ایسے شدید طور پر مشابہ تھے کہ اس وقت سُننے والوں کے دِل میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی جو ابھی تھوڑا عرصہ ہی ہوا تھا ہم سے جُدا ہوئے تھے، یاد تازہ ہوگئی۔ اور سامعین میں سے بہت ایسے تھے جن کی آنکھوں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی اس آواز کی وجہ سے جو اُن کے پسرِ موعود کے ہونٹوں سے اس وقت اس طرح پہنچ رہی تھی جس طرح گراموفون سے ایک نظروں سے غائب انسان کی آواز پہنچتی ہے، آنسو جاری ہوگئے اور اُن آنسو بہانے والوں میں ایک خاکسار بھی تھا۔ اگر یہ کہنا درُست ہے کہ انسان کی رُوح دوسرے پر اُترتی ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی رُوح آپ پر اتر رہی تھی اور اس بات کا اعلان کر رہی تھی کہ یہ ہے میرا پیارا بیٹا جو مجھے بطور رحمت کے نشان کے دیا گیا تھا۔ اور جس کی نسبت یہ کہا گیا تھا کہ وہ حُسن و احسان میں تیرا نظیر ہوگا۔

دوسری بات جو اس تقریر کے متعلق قابلِ ذکر ہے، وہ یہ ہے کہ جب تقریر ختم ہو چکی تو حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ نے جن کی ساری عمر قرآن شریف پر تدبّر کرنے میں صرف ہوئی تھی اور قرآن کریم جنکی روح کی غذا تھی، فرمایا کہ میاں نے بہت سی آیات کی ایسی تفسیر کی ہے جو میرے لئے بھی نئی تھی۔

یہ آپ کی پہلی پبلک تقریر تھی جو آپ نے جماعت کے سامنے کی اور اس پہلی تقریر میں قرآن شریف کے وہ معارف بیان فرمائے ہیں جن کی نسبت حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ جیسے عالمِ قرآن نے یہ اعتراف فرمایا کہ یہ اُن کے لئے بھی جدید معارف ہیں۔ پس یہ معارف اس نوجوان کو کس نے سکھائے؟ یہ حکمت اور یہ علم آپ کو اس زمانۂ جوانی میں کس نے دیا؟۔ اُسی نے جو قرآن شریف میں حضرت یوسف علیہ السلام کی نسبت فرماتا ہے:

فَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ
وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ۔

آپ نے صرف عام طور پر دانائی اور حکمت کی باتیں بیان نہ فرمائیں، بلکہ قرآن شریف کے اچھوتے معارف بیان فرماتے اور اللہ تعالیٰ قرآن شریف کے متعلق فرماتا ہے: لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ۔ پس لڑکپن کی خلوت سے نکلتے ہی آپ کا لوگوں کے سامنے قرآن شریف کے جدید اور لطیف معارف بیان فرمانا، اس بات کی ایک بیّن شہادت ہے کہ آپ نے اپنا لڑکپن اللہ تعالیٰ کی خاص تربیت میں گزارا اور آپ بچپن میں ہی مطہرین کی جماعت میں داخل تھے۔"[1]

اس مختصر مگر مؤثر اور حقائق و معارف سے لبریز تقریر کے متعلق ایڈیٹر الحکم نے لکھا:

"آج صبح کی کارروائی تشحیذ الاذہان کے جلسہ سے شروع ہوئی۔ حضرت صاحبزادہ بشیر الدین محمود احمد سلمہ اللہ الاحد کی نظم اور آپ کی تقریر نے مُردہ دلوں کو جِلا دیا۔ بلا مبالغہ صاحبزادہ صاحب کی تقریر میں قرآن مجید کے حقائق و معارف کا سادہ اور مسلسل الفاظ میں ایک خزانہ تھا۔ پلیٹ فارم سے اس لب و لہجہ میں بول رہے تھے جو حضرت امام علیہ السلام کا تھا۔ اور اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِّاَبِيْهِ کا پورا نمونہ تھا۔ صاحبزادہ صاحب کی تقریر کے متعلق مجھے الفاظ نہیں ملتے کہ میں اس کا ذکر کر سکوں۔

---

[1] الفضل ۵ نومبر ۱۹۳۸ء صہ ۶

صاحبزادہ صاحب نے تشنۂ حقائق قوم کو باپ کی طرح سیراب کر دیا
اور وہی زمانہ یاد دلا دیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس سے بھی زیادہ حقائق و
معارف کے موتیوں سے مالا مال کرے۔" لہ

اس زمانہ میں مختلف اہم موضوعات پر آپ نے درجنوں تقاریر فرمائیں اور بیسیوں مضامین لکھے جن میں سے اکثر آج تک محفوظ ہیں۔ ان میں سے بعض تقاریر اور مضامین کے اقتباسات بغیر تبصرہ کے پیش کئے جا رہے ہیں۔ یہ تقاریر اور مضامین آپ کے فکر و نظر اور شخصیت کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔

آپ کی بعض تقاریر جو ابھی تک محفوظ ہیں، اتنی لمبی ہیں کہ اُن کا من و عن پیش کرنا جگہ کی مناسبت کے لحاظ سے موزوں نہیں۔ لیکن وہ اتنی پُرمغز اور پُرحکمت ہیں اور آپ کی جوانی کے پُختہ فکر پر اس طرح واضح دلالت کر رہی ہیں کہ اُن کا کلیۃً حذف کر دینا بھی قارئین سے ناانصافی ہو گی۔

ہمارے سامنے آپ کی ایک تقریر ۲۷ مارچ ۱۹۰۹ء کی ہے جب کہ آپ کی عمر بیس سال کی تھی یہ تقریر جو سورۃ لقمان کے آخری رکوع میں بیان فرمودہ مضمون سے تعلق رکھتی ہے پُورے سوا دو گھنٹے تک جاری رہی۔ اس کے چند اقتباسات، جو آپ کے ذہن رسا اور واضح غیر مبہم طرز فکر پر روشنی ڈالتے ہیں، پیشِ خدمت ہیں۔

ایک ہی لفظ مختلف معانی میں جس طرح استعمال ہو سکتا ہے اور اس کے صحیح استعمال یا صحیح ادراک کے فقدان سے بعض اوقات جو عظیم خطرات لاحق ہو جاتے ہیں، اُن پر آپ کی کیسی وسیع اور گہری نظر تھی، مثال کے طور پر ذیل کا اقتباس پیش ہے:۔

" کلمہ شہادت اور سورۃ لقمان کا آخری رکوع پڑھ کر فرمایا۔

فرمانبرداری ایک ایسی چیز ہے اور یہ ایسا مشکل مسئلہ ہے کہ اس کا حاصل کرنا بلکہ اس کا سمجھنا ہی مشکل ہے۔ بعض الفاظ ہوتے ہیں جن کے ایک وقت میں کچھ معنی ہوتے ہیں اور دوسرے میں کچھ۔

مثلاً فرمانبرداری ہے۔ استاد کی فرمانبرداری اَور معنی رکھتی ہے اور والدین کی فرمانبرداری اَور معنوں میں، چچا یا ماموں کی فرمانبرداری کا کچھ اور رنگ ہے۔ پھر بادشاہ کی فرمانبرداری اَور معنوں میں ہے۔ مُرسل یا مامور من اللہ کی کی فرمانبرداری اور ہی شان میں ہے۔ ایک ہی لفظ ہے جو مختلف جگہوں میں

لہ "الحکم" جوبلی نمبر دسمبر ۱۹۳۹ء صفحہ ۶۷ کالم ۱و۲

مختلف معنی دیتا ہے۔ جو انسان مناسبِ موقع معنی نہ کرے وہ دھوکا کھاتا ہے اگر کوئی شخص والد کی فرمانبرداری رسول کی فرمانبرداری اور رسول کی فرمانبرداری والد کی فرمانبرداری قرار دے لے تو ضرور ہے کہ کچھ مدت بعد ٹھوکر کھائے اور ممکن ہے کہ والد کا حکم مقدم سمجھ کر خدا کی درگاہ سے بھی دُور ہو جائے۔

بَلعَم کے قصّہ ہی کو دیکھ لو کہ اس کی دعائیں قبول ہوتیں۔ اس کی آواز خدا کی بارگاہ میں سُنی جاتی۔ وہ خدا کے دروازہ کی کُنڈی کھٹکھٹاتا تو جواب پاتا۔ مگر ایک ایسا موقع آیا کہ اس نے بادشاہ کی خواہش کو مقدم کیا۔ تو اس کے لئے حکم ہوا کہ آج سے تیری دُعا سُنی نہ جائے گی۔ وہ نہ سمجھا کہ چھوٹی چیزیں بڑی چیزوں کے لئے قربان کی جاتی ہیں۔ عیسائیوں کو بھی اس قسم کا دھوکا ہُوا ہے۔ بکروں کو ذبح ہوتے دیکھا تو خدا کے بیٹے کو بھی قربان کر دیا اور یہ نہ سمجھے کہ بڑے چھوٹوں کے لئے نہیں بلکہ چھوٹے بڑوں کے لئے قربان کئے جاتے ہیں۔"

فرمانبرداری کے مفہوم کو خوب واضح کرنے کے بعد آپ نے ایک اور روزمرّہ استعمال میں آنے والے لفظ "درد" کی مثال پیشِ نظر رکھ کر یہ وضاحت فرمائی:۔

"دیکھو درد ہے۔ اب کانٹا چبھنے کا بھی درد ہے۔ جگر کا بھی درد ہے۔ قولنج کا بھی درد ہے۔ پھر دل کا بھی درد ہے۔ اب دیکھو لفظ تو درد ہی کا ہے مگر کُجا کانٹے کا درد اور کُجا اس دِل کا درد جس کی قوم تباہ ہو رہی ہے۔ غرض ایک اُجڈ انسان کے دِل کا درد ہے جسے صرف دُنیا کی محدود چیزوں سے تعلق ہے۔ ایک عالِم کے دِل کا درد، ایک شہید کے دِل کا درد ہے۔ ایک صدیق کے دِل کا درد ہے۔ پھر ایک نبی کے دل کا درد ہے۔ اور یہ درد یکساں نہیں۔ دیکھو ہم بھی درد محسوس کرتے ہیں مگر قوم کی جو تڑپ، جو درد آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو تھا، وہ ہم میں کہاں ہو سکتا ہے اللہ اللہ! وہ کیسی دُعائیں تھیں جنھوں نے عرب میں، جو جہالت کا منبع تھا علوم و مُعارِف کی نہریں بہا دیں۔ اور وہ قوم جو جہالت کی وارث تھی، اُسے

علوم کا وارث بنادیا...‘‘

اسی تقریر میں آگے چل کر انسانی عمل کے دو محرّکات یعنی احسان اور خوف کا دلچسپ موازنہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

’’لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ احسان بہت مؤثر ہوتا ہے اور خوف کم مؤثر۔ احسان میں کامل تابعداری ہوتی ہے اور خوف میں کم۔ لوگ اپنے محبوبوں کے راضی کرنے کے لئے جو جو دُکھ اور مصیبتیں اُٹھاتے ہیں وہ کسی جابر و ظالم کے لئے نہیں اُٹھاتے۔ اس احسان کے نظارہ کے لئے سب سے پہلے قرآن مجید میں اَلْحَمْدُ شریف ہے جہاں فرمایا ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سب تعریفیں ہیں اس اللہ کے لئے جو ربُوبیّت کرنے والا ہے تمام عالمین کا، جو مچھر سے لیکر انسان تک اور کیڑے سے لے کر ہاتھی تک سب کی ربوبیّت کرتا ہے۔ ہم اپنے سے ادنیٰ چیز کی قدر نہیں کرتے مگر وہ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ ہوکر ایسا مہربان ہے کہ اپنے سے ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کی پرداخت فرماتا ہے۔ ایک حلوائی سارا دن مٹھائی تیار کرتا ہے اور اس کے لئے بہت خرچ کرتا ہے۔ بہت محنت اٹھاتا ہے مگر چیونٹی اور مکھی اسی ربوبیّتِ عامہ کے ماتحت اس سے بلا کسی محنت کے فائدہ اٹھاتی ہے۔ بعض وقت ایک کُتّا پکا پکایا بنا بنایا حلوا لے جاتا ہے جسے دیکھ کر ایک محدود خیال والا انسان گھبرائے مگر میں تو اس میں بھی اسی کی ربوبیّت کی شان جلوہ گر دیکھتا ہوں کہ وہ اپنی ادنیٰ سے ادنیٰ مخلوقات کو کس حکمت سے رزق پہنچاتا ہے کہ اشرف المخلوقات کو ایک رنگ میں اُن کا خادم بنا دیا ہے۔ یہ نظارہ دیکھ کر بے اختیار زبان سے نکلتا ہے اَلْحَمْدُ للّٰہ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ کُتّا جب کوئی روٹی اُٹھا لے جائے تو ایک احمق اس کے پیچھے لٹھ لے کر اُٹھے گا۔ اور میں ایسے شقی القلب لوگوں سے واقف ہوں جن میں سے ایک نے اس کا گھی کھا جانے والی بلّی کو ہلاک کیا اور پھر اس کی انتڑیوں سے گھی نچوڑ کر نکالا۔ مگر ایک نبی کی فطرت اس موقعہ پر بھی اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ہی پڑھے گی کیونکہ ایسی باتوں سے اس کی ربوبیّت کا

ثبوت ملتا ہے۔ ہر چیز میں ہم دیکھتے ہیں کہ فضلہ لگا دیا ہے۔ میوہ کھاؤ تو اس کی گٹھلی پھینکنی پڑتی ہے۔ فضلہ چھوڑنا ہی پڑتا ہے۔ اور پھر جو کچھ کھایا جائے اس کا فضلہ بن کر بھی ایک وقتِ خاص پر نکل جاتا ہے اور دوسرے جانداروں کے کھانے کے کام آتا ہے، اس طرح اس کی ربوبیت کی صفت اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔"

نماز باجماعت کی برکتوں پر ایک نئے انداز میں روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا:

"پس میں تمہیں سخت تاکید کرتا ہوں کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھو۔ جماعت پر جو فضل ہوتے ہیں وہ اکیلے پر نہیں ہو سکتے۔ دیکھو ایک انسان ہے۔ اس کا ہاتھ کاٹ دو۔ پیروں کو نکال دو تو وہ ان اعضاء سے مل کر جو کام کر رہا تھا۔ اب نہیں کر سکتا۔ یہ اس لئے کہ جماعت کے ساتھ جو کام مختص ہے وہ اکیلے سے نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح مرکبات سے دوائیاں بنی ہوتی ہیں جو تریاقی اثر رکھتی ہیں۔ وہ اکیلی کسی دوا میں نہیں ہو سکتا۔"

آیاتِ قرآنی پر آپ کے اندازِ تدبّر کی ایک مثال پیش ہے۔ اس مضمون پر غور کرتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے محسن بندوں کے اجر ضائع نہیں کرتا' آپ کا ذہن اس سوچ میں ڈوب گیا کہ پھر کیوں ہزارہا پاکیزہ نبیوں کی تعلیم ضائع ہو گئی اور کیوں صرف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم محفوظ رکھی گئی۔ اس مسئلہ پر غور کرتے ہوئے آپ بحرِ معارف کی جن گہرائیوں میں غوطہ زن ہوتے' اس کا کچھ اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے ہو سکتا ہے:

"میں نے لَا یُضِیعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ پر تدبّر کیا ہے کہ کیا وجہ ہے دوسرے انبیاء علیہم السلام کی تعلیم بالکل محفوظ نہیں اور نبیِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم محفوظ ہے۔ تو مجھے سمجھایا گیا کہ چونکہ اللہ تعالیٰ کی دوسری صفات نے بھی جلوہ کرنا تھا اور ہر ایک نبی نے خدا کی ایک نہ ایک صفت کے ماتحت کام کیا ہے اس لئے اُن کی تعلیم کے ساتھ دوسرے نبی کی تعلیم کا اضافہ ہے۔ مگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم محسنِ کامل تھے۔ آپ کی ذات' آپ کی تعلیم خدا تعالیٰ کی صفات کا جلوہ تھا۔ اس لئے خدا نے فرمایا: اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ ہم اس کو محفوظ رکھیں

گے۔ میں تمہیں دلی خلوص کے ساتھ یقین دلاتا ہوں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ کوئی نظر نہیں آتا۔ کیونکہ آپ نے اس کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے ذریعہ نہ صرف خود نجات پائی بلکہ ایک دُنیا کو نجات دلائی۔ بلکہ اس کے غلاموں کے غلام لوگوں کو نجات دینے والے ہُوئے۔ جیسا کہ اس نے اس زمانہ کے امام کی زبان پر فرمایا۔ آگ سے ہمیں مت ڈرا کہ آگ ہماری غلام بلکہ غلاموں کی غلام ہے[1]۔ دُنیا میں یہ بات شاید لطیفہ سمجھی جاوے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات پر کسی نے نوحہ نہیں لکھا۔ مگر میرا دل ہمیشہ نوحہ کیا کرتا ہے۔ کہ اے رسُول! تو نے ہمیں کیوں چھوڑ دیا۔ جس کی معرفت ایسی کامل تھی کہ خدا کے سوا گویا کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ سارے عرب کے عمائد آپ کے برخلاف اُٹھے۔ آپ کے چچا کے پاس شکایت کی۔ آپ کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں اور امیدیں بھی دلائیں کہ اگر مال کی خواہش ہے تو لے لے۔ اگر حسین سے حسین بی بی چاہے تو وہ حاضر ہے۔ اگر بادشاہی کی حرص ہے، تو ہم اپنا سردار بنالیں۔ مگر آپ نے فرمایا کہ مجھے کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں۔ میرے لئے میرا خدا کافی ہے۔ اگر مال کچھ چیز ہے، اگر دنیا کی بادشاہتیں کچھ قدر رکھتی ہیں تو خدا تعالیٰ خود ہی مجھے دے دے گا۔ تمہارے واسطہ کی ضرورت نہیں۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ آپؐ کا وجود کس قدر بابرکت اور باعزت ہے کہ بادشاہوں کا غلام زادہ ہونا تو ایک قسم کی گالی اور ذِلّت کا موجب ہے مگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے غلام زادے بھی دُنیا میں وہ عزّت پا رہے ہیں جو بڑے سے بڑے رئیس کو حاصل نہیں۔ میں جب راہ میں چلتا ہوں تو لوگ دست بوسی اور اعزاز و اکرام میں ایسا مبالغہ کرتے ہیں کہ رستہ چلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس وقت میں خیال کرتا ہوں کہ اللہ! کیا ہی عالیشان ہے وہ نبی جس کا غلام زادہ ہونا اس قدر عزّت و شرف کا مُوجب ہے۔ آخر یہ عزت جو میری کی جاتی ہے یہ اسی لئے ہے کہ میں

[1] تذکرہ صفحہ ۳۹۷

غلام احمد کا بیٹا ہوں یعنی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا غلام زادہ ہوں"۔[1]

آپ کی طرزِ خطابت اور اس کے گہرے اثرات

حضرت صاحبزادہ صاحب کو قادیان میں بھی اور قادیان سے باہر بھی، اپنوں میں بھی اور غیروں کے مجمع میں بھی بیسیوں مرتبہ مختلف دینی اور تربیتی مسائل پر خطاب کرنے کا موقع ملا۔ آپ کی اکثر تقاریر تو من وعن محفوظ نہیں رہ سکیں لیکن بعض اخبارات و رسائل میں محفوظ کر لی گئیں۔ اُن سب کا پیش کرنا بھی ممکن نہیں۔ لہذا آپ کے بے تکلف، سادہ مگر پُر معارف طرزِ کلام کا محض ایک نمونہ پیش کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے۔ کیا اپنے اور کیا غیر، جملہ سامعین جس حد تک آپ کے خطاب سے متاثر ہوتے تھے، اس کا کچھ اندازہ "الحکم" میں شائع ہونے والی ایک جلسہ کی روئداد سے لگایا جاسکتا ہے:۔

"بنارس سے واپسی پر حضرت صاحبزادہ صاحب کی طبیعت ناساز تھی مگر کانپور کے احباب نے چاہا کہ ایک پبلک تقریر کریں اگر صاحبزادہ صاحب یا ہم لوگ چاہتے تو کانپور میں آپ کے متعدد لیکچر ہوسکتے تھے مگر چونکہ صاحبزادہ صاحب کو چار دن سفرِ بنارس میں صَرف کرنے پڑے اور ان کی طبیعت بھی نصیبِ اعداء درست نہ تھی۔ اس لئے آپ کا منشاء کسی پبلک تقریر کا نہ تھا تاہم احباب کے بے حد اصرار پر آپ نے منظور کیا کہ وہ خصوصیاتِ سلسلہ پر پبلک تقریر کریں۔ اس اعلان سے یہ بھی غرض تھی کہ آنے والے وہی لوگ ہوں گے جو ہمارے سلسلہ کے متعلق واقفیت پیدا کرنا چاہتے ہیں اور وہ اس مطلب کے لئے تیار ہو کر آئیں گے کہ انہوں نے کیا سُننا ہے۔

حضرت صاحبزادہ صاحب کے منظور فرمانے کے بعد دوسرا سوال اعلان کا تھا پبلک جلسوں کے لئے بعض وقت یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ غیر احمدیوں کی طرف سے ہوں۔ مگر حضرت صاحبزادہ صاحب احمدی قوم کی پوزیشن کو قائم کرنا چاہتے ہیں اور نہیں پسند کرتے کہ وہ دوسروں میں مدغم اور منضم ہو جاوے۔ پس اس جلسہ کے اعلان کو جماعت کے سکرٹری کی طرف سے دینا تجویز ہوا۔ اور ۱۸ر اپریل کو جس کی شام کو لیکچر ہونا تھا۔ ۱۰ بجے کے قریب اعلان ہو سکا۔ وہاں کی جماعت نے نہایت مستعدی سے اس اعلان کو بقدر اپنی ہمت

---

[1] اخبار "بدر" قادیان ، ۱۴ ، ۲۱ر اپریل ۱۹۱۰ء

کے شائع کیا۔ اس میں یہ بھی لکھا گیا تھا کہ اگر کسی شخص کو کچھ دریافت کرنا ہو تو وہ ظہر اور عصر کے مابین دریافت کر سکتے ہیں چنانچہ ظہر اور عصر کے درمیان مدرسہ جامع العلوم کے طلباء جمع ہو کر آتے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے اس نشان پر کہ وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی قبر میں دفن ہوگا' گفتگو کرتے رہے ...

صاحبزادہ صاحب کی طبیعت بہت ناساز تھی اور ہم سب اور وہ خود بھی مطمئن نہ تھے کہ تقریر کر سکیں گے۔ بعد مغرب لوگوں کا ہجوم ہوا اور کوئی بارہ سو کے قریب شرفاء کا مجمع ہو گیا۔ سب کے بیٹھنے کے لئے فرش ہی تجویز کیا گیا تھا۔ کرسیوں اور بنچوں کا انتظام ہماری طاقت سے باہر تھا اور نہ اس قسم کے تکلفات میں پڑنا ہم نے پسند کیا ... حضرت صاحبزادہ صاحب اُٹھے' ان کی غرض تو اس وقت اتنی ہی تھی کہ وہ اپنی علالت کا عذر کر دیں گے۔ مگر کھڑے ہونے کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے آپ کی تائید اور نصرت کی اور ایک جدید اور اچھوتا طریق دعوتِ حق کا آپ کے دل میں ڈالا کہ تمام سننے والے مسحور ہو گئے۔ باوجودیکہ ان کے مالوف عقائد کی کمزوریاں نہایت جوش کے ساتھ بیان کی گئیں اور ان کی شناعت کو کھول کھول کر بتایا گیا' مگر اس وقت ان کی حالت ایسی تھی کہ وہ نہایت توجہ کے ساتھ اسے سُن رہے تھے۔ یہ کہنا کہ اس لیکچر کا اثر کیا ہوا میرے قلم کے اظہار سے باہر ہے۔ دیکھنے والے جانتے ہیں۔ دو گھنٹے تک تقریر ہوئی اور تقریر کے ختم ہونے کے بعد لوگوں کا ایک اژدھام صاحبزادہ صاحب کی طرف جُھکا' وہ نثار ہوتے اور ہاتھ چُومتے تھے اور متعدد درخواستیں ہو رہی تھیں کہ ابھی اس پر اور بیان کیا جاوے اور کچھ روز قیام ہو۔ مگر صاحبزادہ صاحب نے فرمایا کہ

اللہ تعالیٰ نے میرے دِل میں یہی ڈالا ہے کہ اب میں یہاں سے روانہ ہو جاؤں" [1]

آپ کے رشحاتِ قلم کے چند نمونے

آپ نے تشحیذ الاذہان کے ادارتی نوٹ میں" قہری نشان" کے عنوان سے ایک مقالہ سپردِ قلم کیا۔ اس میں ۲۸ر دسمبر ۱۹۰۸ء میں آنے والے زلزلہ کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مسیح موعود

---

[1] "الحکم" قادیان ۷،۱۴ر مئی ۱۹۱۲ء صفحہ ۹، ۱۰

و مہدی معہود علیہ السلام کی پیشگوئیوں کا پورا ہونا ثابت کیا ہے۔ اس مضمون کی ابتداء یوں کرتے ہیں:

"دنیا میں ایک نذیر آیا پر دُنیا نے اس کو قبول نہ کیا مگر خدا اسے قبول کرے گا اور بڑے زور آور حملوں سے اس کی سچائی ظاہر کر دے گا۔ اے روئے زمین کے رہنے والو! جن کے کانوں تک میری آواز پہنچ سکتی ہے یا جن کی آنکھیں میری تحریر کو دیکھ سکتی ہیں۔ میں تمہیں اس نیکی کی طرف بلاتا ہوں جس کے پھیلانے کا ذمہ خود خدا نے اٹھایا ہے اور تم جانتے ہو جس کام کو چاہتا ہے، پورا کرتا ہے اور کوئی نہیں جو اس کا سدِّ راہ بن سکے۔ اُس نے دُنیا کا اختلاف دُور کرنے کے لئے اپنے بندوں میں سے ایک شخص کو چُنا اور عرب کے ریگستان میں سے ایک ایسا درخت نکالا جس کے سایہ کے نیچے ہر گوشے کے لوگوں نے کروڑوں کی تعداد میں آرام پایا۔ وہ وجود باوجود گم نامی کے کُنجِ انزوا سے نکل کر شہرت کے اعلیٰ مقام پر پہنچا۔ اور وہ علوِ مرتبہ حاصل کیا کہ سورج کی طرح اس پر بھی نظر نہیں ٹِک سکتی۔ اسی کے بعد خدا تعالےٰ نے تیرہ سو برس بعد ایک اور شخص کو اس کے خادموں میں سے چُنا اور چاہا کہ اس کے ہاتھوں دُنیا کو ہدایت دے۔ چنانچہ وہ بھی پچیس[۲۵] یا چھبیس[۲۶] برس تک دُنیا کو اُسی کے خالق کی طرف بُلا کر چلا گیا۔ سو چونکہ میں اُس کے خادموں میں سے ایک ہوں جن کا فرض ہے کہ دُنیا کو سچائی پر آگاہ کریں اور اس کی ہدایت میں کوشش کریں اس لئے آیت یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ کے ماتحت میں یہ اشتہار دیتا ہوں اور دُنیا کے ہر گوشے کے لوگوں کو اس طرف متوجہ کرتا ہوں کہ وہ وقت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں اور خدا تعالےٰ کے سلسلہ میں داخل ہو کر اپنی دُنیا اور دین کو سنواریں کیونکہ وہ جو اس کے ارادہ کا مقابلہ کرتے ہیں خسر الدنیا والاٰخرۃ کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ پس اگرچہ خدا کا مسیح ہم میں نہیں رہا مگر اس کا قائم کردہ سلسلہ موجود ہے اور دن رات ترقی کر رہا ہے، اس میں شامل ہو کر آسمانی اور زمینی عذابوں سے بچو کیونکہ خدا ارادہ کر چکا ہے کہ دُنیا سے شرک کو دُور کرے اور توحید کو قائم کرے۔ اور اس کے نبی کی معرفت

ہم کو اطلاع مل چکی ہے کہ جب تک دُنیا اصلاح نہ کرے گی، آسمانی اور زمینی عذاب پیچھا نہ چھوڑیں گے۔ پس مبارک ہے وہ جو بھیڑیئے کے حملہ سے پہلے اپنی بکریوں کو محفوظ جگہ میں بند کرے اور بشارت ہے اُس کے لئے جو چور کے آنے سے پہلے اپنے مال کو محفوظ کر لیتا ہے۔" [۱]

قرآنی تعلیمات کے لئے غیرت حضرت صاحبزادہ صاحب کی فطرت میں داخل تھی اور ہمیشہ اس امر پر نگران رہتے تھے کہ اسلامی تعلیمات پر کوئی حملہ بغیر مؤثر جواب کے نہ رہے۔ رسالہ "تشحیذ الاذہان" اس سلسلہ میں ایک عظیم خدمت سرانجام دے رہا تھا۔ اور اکثر اعتراضات کے جوابات آپ خود اپنے قلم سے تحریر فرماتے۔ نمونۃً ایک اقتباس پیش ہے:۔

"آجکل مسلمانوں کی کچھ ایسی کمزور حالت ہے کہ دین و دُنیا میں ذلیل ہوتے جاتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ اُن کو خدا نے ایسا مضبوط اور کامل دین دیا تھا کہ اگر یہ اس پر پکے رہتے تو ہر طرح اقبال اور نصرت ہی حاصل کرتے لیکن کوتاہیِ قسمت سے تمام دُنیا کے مسلمان اس پاک مذہب اسلام سے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم جیسا نبی لایا تھا بالکل غافل ہو گئے ہیں۔ اور اوامر و نواہی تک سے بے خبر ہیں۔ اسلام ایک ایسا پاک مذہب ہے کہ اس پر چلنے والے کسی ملک اور زمانہ میں کسی علم کے جاننے والے کے آگے شرمندہ نہیں ہو سکتے۔ دُنیا کے جس قدر سچے علوم ہیں وہ سب اسلام کے مطابق ہیں اور خدا کا قانونِ قدرت اسلام کے اصولوں کے برخلاف کبھی واقعہ نہیں ہوتا... مجھے تعجب ہے کہ غیر قومیں اگر اسلام کی تعلیم پر اعتراض کریں تو کچھ حرج نہیں، وہ تو مخالف ہی ہیں۔ خود مسلمان کیونکر یہ کہنے لگ گئے ہیں کہ قرآن شریف کے بعض احکام اب حالاتِ زمانہ کے برخلاف ہیں، اس لئے ہم اب جو چاہیں کریں۔ پایونیر کے ۲۸ر نومبر ۱۹۰۸ء کے پرچہ میں مجھے ایک مسلمان کہلانے والے صاحب کا یہ مضمون دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ اصل بات جو مذہب کی ہے وہ تو اعتقادی حصہ ہے۔ باقی رہا عملی حصہ، سو وہ زمانہ کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔ اس لئے قرآن شریف کے احکام پر عمل کرنا

---

[۱] تشحیذ الاذہان فروری ۱۹۰۹ء صفحہ ۱/۲

ہمارے لئے ضروری نہیں جیسا کہ آجکل سُود دینا جائز ہے۔ میں اِس وقت سُود کے جواز یا ممانعت پر بحث کرکے جزئیات میں نہیں پڑنا چاہتا بلکہ اس اصل پر ایک نوٹ لکھنا چاہتا ہوں کہ آیا قرآن شریف کے احکام تبدیل ہو سکتے ہیں؟ سو میں راقم مضمون مندرجہ پاؤنیر کی بات کو بہت حقارت سے دیکھتا ہوں کیونکہ اس صورت میں قرآن شریف پر یہ اعتراض آتا ہے کہ وہ انسانی کلام ہے خدائی نہیں۔ کیونکہ خدا تو عالم الغیب ہے۔ اس نے ہر زمانہ کے حالات کے مطابق قوانین کیوں نہ اتارے اور دُوسری یہ بات ہے کہ اگر خدا تعالیٰ کا منشا تھا کہ یہ اُمت زمانہ کے حالات کے مطابق جب چاہے اور قانون وضع کرے تو قرآن شریف کو ہر زمانہ اور ہر قوم کے لئے کیوں بھیجا؟ اور یہ کہنا کہ اصول میں تو کچھ تبدیلی نہیں ہو سکتی اس لئے قرآن شریف پر کچھ اعتراض نہیں ہو سکتا' ایک لغویات ہے۔ کیونکہ اصل اصول تو مذاہب کا خدا کو واحد و قادر ماننا ہے۔ سو یہ اور بہت سی قومیں مانتی ہیں۔ اسلام کو خصوصیت کیا ہے اور اسلام کے بھیجنے کی ضرورت کیا پڑی۔ اگر اس طرح عملیات کو چھوڑا جائے تو مذہب تو ایک ڈھکونسلا بن جائے۔ ایک شخص کل اُٹھ کر کہے گا کہ آجکل روزے رکھنے حالات کے برخلاف ہیں' دُنیا تیرہ سو برس میں ترقی کر گئی ہے اس لئے اب یہ حکم منسُوخ ہے۔ دُوسرا نماز کو فضول قرار دے گا۔ تیسرا حج کو لغو اور چوتھا زکوٰۃ کو بے ہودہ۔ اس طرح اسلام ایک بازیچۂ طفلاں بن جائے گا۔ انسان کو چاہیئے کہ بات کہنے سے پہلے اس کو سوچ لے۔ قرآن کا ایک ایک نکتہ اٹل ہے اور ہر ایک زمانہ میں اس پر عمل ہو سکتا ہے۔ اس کا بھیجنے والا عالم الغیب ہے اور اس نے چونکہ قرآن شریف پر عمل کرنا ہر زمانہ میں ضروری قرار دیا ہے۔ اس لئے اس کا ایک ایک کلمہ ہر زمانہ کے مطابق ہے اور جہاں کوئی خاص خصوصیت ہے وہاں اس نے خود بتا دیا ہے۔ غرض مسلمانوں پر خدا کا احسان ہے کہ وہ کبھی شرمندہ نہیں ہو سکتے۔ ہاں اگر کوئی خود اپنے آپ کو ذلیل کرے تو اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے۔ مرزا محمود احمد۔"

(تشحیذ الاذہان جلد ۳ صفحہ ۴۹۰ دسمبر ۱۹۰۸ء)

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے وصال پر حضرت صاحبزادہ صاحب نے جماعت کو پہلے سے بڑھ کر ایثار، قربانی، محنت اور استقلال کے ساتھ اپنے عظیم مقصد کی پیروی کی جس احسن رنگ میں تلقین کی، اس کا ایک نمونہ تشحیذ میں شائع ہونے والے متعدد طویل مضامین سے اخذ کردہ ایک مختصر اقتباس کی صورت میں پیش ہے :

"ہمارے ہادی اور رہنما خاتم النبیین محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب اس کام کو پورا کرنے کا ارادہ کیا اور خدائے تعالیٰ نے اُن کو حکم دیا کہ وہ اسے انجام دیں تو مخالفت اور شرارت کی حد ہوگئی۔ مکہ اور اس کے اطراف کے لوگوں نے دس برس تک آپ کو وہ تکلیفیں دیں کہ الاماں! الاماں! یہاں تک کہ بنی ہاشم سمیت آپ کو ایک پہاڑی میں تین سال تک محصور رہنا پڑا اور اہلِ مُلک سے ہر قسم کے تعلقات ٹوٹ گئے اور آپ کے ہاتھ کسی قسم کا سودا بیچنا یا آپ سے ہمکلام تک ہونا ممنوع قرار دیا گیا۔ چنانچہ طائف کا واقعہ، جس میں آنحضرتؐ پر پتھر برسائے گئے اور آپ کا جسم مبارک لہولہان ہوگیا اور آپ کے پیچھے شریر اور بدمعاش آپ کو دکھ دینے کے لئے لگائے گئے، اُن تکالیف کی جو اس وقت بدمعاشوں کے ہاتھوں آپ کو پہنچیں، ایک کھلی مثال ہے۔ اس کے علاوہ وہ تکالیف جو آپ کے صحابہؓ کو اس راہ میں پیش آئیں، ایک سخت سے سخت دل والے انسان کو کنپا دینے کے لئے کافی ہیں۔ اُن کو پیٹا گیا اور لُوٹا گیا اور بے عزت و بے حُرمت کیا گیا اور ہر قسم کے عذاب دیئے گئے۔ صرف اس لئے کہ انہوں نے اسلام کو اختیار کیا تھا اور اس کے پھیلانے کے لئے اپنی جانیں بیچ دی تھیں۔ وہ قتل کئے گئے، اپنے گھر بار سے نکالے گئے، اور وطن سے بے وطن ہوئے اُن کے بچے اور اُن کی بیویاں اُن کی آنکھوں کے سامنے بے رحمی سے مار دی گئیں اور یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ انہوں نے آنحضرتؐ کے ہاتھ پر اس بات کا اقرار کیا کہ ہم خواہ کچھ ہو دُنیا میں اسلام کی پاک تعلیم کو پھیلائیں گے چنانچہ قرآن شریف میں آتا ہے کہ

وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَنْ يُؤْمِنُوا بِاللّٰهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ۝ (البروج : ۹)

یعنی اُن سے دُشمنی نہیں کی گئی مگر اِس لئے کہ وہ خدائے عزیز و حمید پر ایمان لائے یعنی انہوں نے اسلام کی پیروی کی اور احادیث سے ثابت ہے کہ ایک دفعہ کُفّارِ مکہ نے آپس میں مشورہ کر کے نبی کریمؐ کو کہلا بھیجا کہ ہم آپ کی ہر ایک بات کو ماننے کے لئے تیار ہیں مگر ہمارے بُتوں کی بُرائی نہ کی جائے اور اس معاملہ میں خاموشی اختیار کی جائے۔ مگر اِس کا جواب نبی کریمؐ نے یہی دیا کہ دُنیا کی کوئی خواہش یا لالچ مجھے تبلیغ اسلام سے نہیں روک سکتے۔ پس یہ تمام تکلیفیں جو نبی کریمؐ یا صحابہؓ کو دی گئی تھیں۔ اُن کی اصل غرض یہی تھی کہ اُن کو اسلام کی تبلیغ سے روکا جائے اور دین سے ہٹا کر دُنیا کی طرف متوجہ کیا جائے۔ پھر اس زمانہ میں ہی دیکھ لو کہ جب خدائے قادر نے حضرت مسیح موعودؑ کو اس کام پر مامُور کیا تو دُنیا نے آپ سے کیسا سلوک کیا۔ آپ وہی تھے کہ جن کو براہینِ احمدیہ کے شائع ہونے پر ہندوستان کے ہر گوشہ کے لوگوں نے مجدّد قبول کر لیا تھا اور ہر ایک مسلمان کی آنکھیں آپ پر لگی ہُوئی تھیں اور ہر ایک دِل اِس اُمید سے پُر تھا کہ ایک دن یہ مئے عرفان کا ساقی شرابِ وحدت پلا کر تمام ہندوستان کو نشۂ حقیقی میں مخمور کر دے گا۔ لیکن جونہی خدائے تعالیٰ کی آواز نے آپ کے دِل میں پکار کر کہا کہ سُن! مَیں تجھے اسلام کی خدمت کے لئے مامور کرتا ہُوں۔ تُو مسلمانوں اور دیگر قوموں کو ہدایت دے اور اُن کی آنکھوں کو کھول تا کہ بجائے ایک سیاہ اور بدنما چہرے کے انہیں اسلام کا نُورانی چہرہ نظر آئے اور میں تجھے اس خدمت کے لئے مسیح موعود کا عہدہ دیتا ہُوں۔ بس پھر کیا تھا' چار دانگ میں شور مچ گیا کہ کافر ہے کافر ہے۔ تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ آپؑ کو دکھ دینے کے لئے کیسی کیسی کوششیں کی گئیں۔ کُفر کا فتویٰ لگایا گیا' گالیاں دی گئیں اور آپ کی نسبت ایسے ایسے بے حیائی کے کلمے کہے گئے کہ ایک مولوی کی زبان سے نکلنے تو الگ' ایک بھنگی بھی اُن کے بولتے ہُوئے جھجک جاتا ہے۔ خطوں کے ذریعہ اشتہاروں کے ذریعہ اخباروں کے ذریعہ اور کتابوں کے ذریعہ آپ پر ایسی ایسی تہمتیں لگائی گئیں اور وہ وہ جھوٹ باندھے گئے کہ معاذ اللہ! پھر زبانی تکلیفوں سے گزر کر عملی رنگ میں

بھی کوئی کمی نہیں کی گئی۔ لدھیانہ کا فساد اور دہلی کا ہنگامہ تو خیر شروع شروع میں تھا ۱۹۰۵ء میں جب کہ اس سلسلہ کو ایک خاص ترقی اور رونق مل چکی تھی امرتسر میں وہاں کے بدمعاشوں نے پتھر پھینکنے کی جو جرأت کی اور جس طرح بلوہ کیا اسکے آپ میں سے بہت سے لوگ چشم دید گواہ ہوں گے۔ پھر اسکے علاوہ آپؑ کے قتل کرنے کے منصوبے کئے گئے اور قتل کے مقدمے کئے گئے خود بے انصافی کر کے انصاف کی عدالتوں سے عدل چاہا گیا۔ گورنمنٹ کو بدظن کرنے کی کوشش کی گئی اور ٹیکس کا مقدمہ کر کے مالی نقصان کا ارادہ کیا گیا پھر آپ کی ذات کو چھوڑ کر آپ کے متبعین سے بھی نہایت بُرا اور ذلیل سلوک کیا گیا یہاں تک کہ اُن کی چوری اور اُن کی امانت میں خیانت اور اُن کا قتل تک جائز رکھا گیا۔ اور آجکل کے علماء نے فتویٰ دے دیا کہ اُن لوگوں کی عورتیں تک نکال لینی جائز ہیں۔ وہ گھروں سے نکالے گئے اور اُن کا مال لُوٹا گیا۔ اُن سے کلام تک کرنا ایک کبیرہ گناہ قرار دیا گیا۔ یہاں تک کہ جو اُن کو سلام کرے وہ کافر اور جو اُن کو کافر نہ سمجھے وہ بھی کافر اور یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ انہوں نے مسیح موعودؑ کے ہاتھ پر اس بات کی بیعت کی ہے کہ ہم دین کو دُنیا پر مقدم رکھیں گے یعنی اسلام کا نُورانی چہرہ دنیا پر عملاً اور قولاً ظاہر کریں گے۔ چنانچہ دشمن یہاں تک ترقی کر گئے کہ حضرت مولوی صاحبزادہ سید عبداللطیف صاحب اور میاں عبدالرحمٰن صاحب کابلی اس راہ میں شہید کئے گئے۔

پس اے میرے دوستو! یہ کام جو احمدی جماعت میں داخل ہو کر آپ نے اپنے ذمے لیا ہے' کچھ چھوٹا سا کام نہیں اور یہ قطعاً گمان نہیں کرنا چاہیئے کہ آرام اور آسائش کے ساتھ یہ مدعا حاصل ہو جائے گا بلکہ یاد رکھو کہ اس کام کے پورا کرنے کے لئے طرح طرح کی مشکلات پیش آئیں گی اور مخالفت اور عداوت کا ایک دریا ہوگا جو تمہاری طرف امڈا چلا آئے گا۔ تمہارے دوست دشمنوں سے بڑھ کر تمہیں ایذا دیں گے اور بہت ہوں گے جن کو تم وفادار سمجھتے ہو لیکن جب وہ تمہاری کوششیں اس امر کی طرف مبذول دیکھیں گے تو بے وفائی کریں گے اور جن سے تمہیں خیر کی امید ہوگی اُن سے شر پہنچے

گا۔ ابتلاؤں کا اژدہا تمہاری طرف اپنا منہ کھول کر بڑھے گا اور وہ جو سُست اور کمزور ہوگا اس کی خوراک بنے گا۔ غرض کوئی مصیبت نہ ہوگی جو تمہیں نہ پہنچے گی اور کوئی دُکھ نہ ہوگا جس کا تمہیں سامنا نہ کرنا پڑے اور کوئی رنج نہ ہوگا جو تمہیں غمگین نہ کرے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کی یہی سُنّت ہے اور یہی وعدہ ہے کہ جب تک وہ کسی کو آزما نہیں لیتا اور کھوٹے اور کھرے کو پرکھ نہیں لیتا اس وقت تک اس کو خدمتِ دین کے لائق نہیں بناتا اور مومن ہونے کا معزز خطاب نہیں دیتا چنانچہ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے کہ

أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ○ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِينَ ○[1] ایک جگہ اور فرماتا ہے :-

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ط وَبَشِّرِ الصّٰبِرِينَ ○ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رٰجِعُونَ ○ أُولٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ○[2]

پس اس کام کے لئے جو ہم نے اختیار کیا ہے ضرور ہے کہ ہمیں تکالیف برداشت کرنی پڑیں اور مصیبتوں کا سامنا ہو۔"

اسی مضمون سے ایک اور اقتباس پیش ہے جس میں آپ بالخصوص نوجوانانِ احمدیت کو خدمتِ دین کے لئے آگے آنے کی تلقین بڑے دلنشیں انداز میں کرتے ہیں :-

"قرآن شریف میں جہاں بڑی عمر کے لوگوں کے لئے بعض انبیاءؑ کی مثالیں بیان کی ہیں وہاں نوجوانوں کے لئے بھی نظیریں دی ہیں تاکہ عذر نہ کر سکیں۔ چنانچہ

[1] العنکبوت ۲۹ : ۳-۴ [2] البقرہ ۲ : ۱۵۶-۱۵۸

حضرت یوسف علیہ السلام نے بارہ[۱۲] برس کی عمر میں وہ کام کیا ہے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ پھر حضرت اسماعیل علیہ السلام کہ جب اُن کی عمر قریباً نو[۹] سال کی تھی تو اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُن کو فرمایا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ اس کو سُن کر آپ نے بڑی دلیری سے فرمایا کہ خدا کی جو مرضی ہے اسے پورا کرو۔ چنانچہ قرآن شریف میں آتا ہے فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ○ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؕ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ○ (الصّٰفّٰت : ۱۰۳)

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اس چھوٹی سی عمر میں اپنی جان تک کی پرواہ نہیں کی اور فوراً خدا کی مرضی پوری کرنے کے لئے تیار ہو گئے پھر حضرت داؤد علیہ السلام نے بارہ[۱۲] برس کی عمر میں وہ کام کیا کہ حیرت اور سکتہ ہوتا ہے۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی جو کام ناصرہ اور اس کے گرد و نواح میں کیا وہ تینتیس[۳۳] برس کی عمر کے اندر ہی تھا۔۔۔۔ دوسرے لوگوں میں بھی اس قسم کی بہت سی نظیریں مل سکتی ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جوانی کی عمر میں ہجرت کے دن اپنی جان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بدلہ خطرہ میں ڈال کر ہمارے لئے ایک نیک نظیر قائم کر دی ہے۔ اور آپ لوگوں میں سے بہت سے اس سے واقف ہوں گے کہ بدر کی لڑائی میں چودہ[۱۴] چودہ[۱۴] برس کے دو لڑکے بھی شریک ہوئے تھے جنہوں نے ابوجہل جیسے کفار مکہ کے سردار کو پہچان کر جا پکڑا اور بوجہ ہتھیار کے پاس نہ ہونے کے ایک اور صحابی کی مدد سے اس کو قتل کیا۔

پس بے شمار نظیریں انبیاءؑ کی اور اُن کے تابعین کی ایسی مل سکتی ہیں کہ انہوں نے نوجوانی کی عمر میں اسلام کی خدمت کی اور اس کا روشن چہرہ دنیا کے سامنے ظاہر کیا۔ پس کیا وجہ کہ آجکل کے نوجوان اس کام سے پہلوتہی کریں۔"[۱]

---

[۱] ماہنامہ "تشحیذ الاذہان" قادیان جلد ۴ نمبر ۶ جولائی ۱۹۰۹ء صفحہ ۲۱۸ تا صفحہ ۲۴۳

بعض دیگر اہم اور دُور رس علمی خدمات

رسالہ تشحیذالاذہان کا اجراء

آپ کی تقاریر اور تحریرات سے جو چند اقتباسات نمونۃً پیش کئے گئے ہیں وہ محض مختصر تعارف کے طور پر نمونہ از خروارے ہیں اور غالباً قاری کی پیاس بجھانے سے زیادہ اس کی آتشِ شوق بھڑکانے کا کام دیں گے مگر افسوس کہ طوالت کا خوف مانع ہے کہ تمام تقاریر اور تحریرات کو من و عن پیش کیا جا سکے۔

حضرت صاحبزادہ مرزا محمود احمد صاحب کی سیرت کا ایک قابلِ قدر پہلو یہ بھی تھا کہ آپ عالِم ہی نہیں تھے بلکہ عالِم گر بھی تھے۔ اور جہاں خود دن رات حصولِ علم میں کوشاں تھے وہاں دیگر احبابِ جماعت میں بھی علم و فضل کی جستجو اور لگن پیدا کرنے کے لئے بے قرار رہا کرتے تھے۔ چنانچہ اس ضمن میں آپ نے مختلف مضامین اور تقاریر میں قوم کے نوجوانوں کو نہایت مؤثر رنگ میں نصائح فرمائیں اور کئی ٹھوس اور دُور رس تدابیر اختیار فرمائیں۔ ان میں سے ایک اہم اور قابلِ ذکر تدبیر رسالہ تشحیذالاذہان کی اشاعت کا انتظام تھا۔ چنانچہ اس غرض سے آپ نے ۱۹۰۶ء میں ایک انجمن کی بناء ڈالی جسے انجمن تشحیذالاذہان کا نام دیا۔ ماہنامہ تشحیذالاذہان احمدی نوجوانوں کے لئے علمی مضامین لکھنے کا ایک بہت بڑا محرّک ثابت ہوا۔ اس رسالہ کی صورت میں گویا آپ نے ایک چھوٹا سا ایسا کارخانہ قائم کر دیا جس میں اعلیٰ پایہ کے لکھنے والے تیار ہونے لگے۔ یہاں تک کہ سلسلہ عالیہ احمدیہ کی آئندہ تصنیفی ضروریات کے لئے لکھنے والوں کی ایک نہایت قابل کھیپ تیار ہو گئی۔ یہ رسالہ صرف تجربہ گاہ ہی نہیں تھا بلکہ خود حضرت صاحبزادہ صاحب کے مضامین اور سلسلہ کے بعض دیگر صاحبِ قلم حضرات کے دقیق تحقیقی مضامین کی وجہ سے اس کے معیار کا شہرہ دُور دُور تک ہونے لگا۔

"الحکم" ۲۱ر فروری ۱۹۰۹ء انجمن تشحیذالاذہان کی کوششوں اور رسالہ تشحیذالاذہان کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہے:۔

> "یہ انجمن احمدی قوم کے نونہالوں کی انجمن ہے جس کے بانی مبانی احمدی قوم کے فخر اور مخدوم حضرت صاحبزادہ مرزا بشیرالدین محمود احمد سلمہ اللہ الاحد

ہیں۔ اِس انجمن کے سرپرست حضرت مسیح موعود علیہ السلام تو تھے ہی مگر حضرت خلیفۃ المسیح سلمہ اللہ تعالیٰ اِس کے مربّی اور محسن رہے۔ انجمن کے جلسوں میں اپنے بہت سے ضروری کام چھوڑ کر بھی ہمیشہ خوشی سے حاضر ہوتے اور وقتاً فوقتاً اپنی تقریروں میں انجمن مذکور کے نوجوان ممبروں کی حوصلہ افزائی اور تعلیم سے کام لیتے رہتے اور آج میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ تشحیذ الاذہان کی موجودہ کامیابی پر سب سے زیادہ خوش اور سب سے زیادہ مبارک باد کے قابل آپ ہی کا وجود ہے۔ اِس لئے کہ یہ انجمن جس کی ترقی اور کامیابی کے آپ دل سے خواہشمند تھے اور ہیں، آپ کے ہاتھوں میں قائم ہوئی آپ کے زیرِ سایہ بڑھی، پھلی پھولی اور ترقی کر رہی ہے اور اِس کے خوشگوار پھل آج احمدی قوم کے لئے مایۂ ناز ہیں۔ حضرت صاحبزادہ صاحب کے قلم اور زبان کے بیش قیمت جواہرات انجمن تشحیذ کے لئے سلسلہ کی تاریخ میں دُرِّ یتیم سمجھے جا کر ہمیشہ قابلِ عزت سمجھے جائیں گے... اور اب نظر آتا ہے کہ وہ کام جو ابتداءً شاید بچوں کا کھیل سمجھا جاتا ہو ایک ایسا کام ہے جس سے یقیناً اللہ اور اس کا رسولؐ خوش ہے۔ اور جس پر یقیناً وقت آنے والا ہے کہ بڑے بڑے بوڑھوں کو رشک ہوگا۔ خدمتِ دین کے لئے بے غرض اور پُرجوش نوجوان تیار کر دینا چھوٹی اور آسان بات نہیں ہے... میں انجمن کے ممبروں، کارکنوں اور انجمن کے بانی اور سرپرست کو اس کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں۔

انجمن کا رسالہ تشحیذ حضرت صاحبزادہ صاحب کی ایڈیٹری سے نکلتا ہے اور یہ کوئی مبالغہ نہیں بلکہ بالکل حق بات ہے کہ رسالہ مذکور کے ایڈیٹر کی زبان اور قلم میں بھی وُہی شان جلوہ گر ہے جو ہم سب کے آقا اور محبوب مسیح و مہدی کے زبان اور قلم میں تھی۔"

اس رسالہ میں چھپنے والے بعض مضامین اتنے بلند پایہ تھے کہ بعض غیر از جماعت اخبارات نے بھی اُن کو سراہا اور اپنے صفحات کی زینت بنایا۔ چنانچہ رسالہ تشحیذ الاذہان مارچ ۱۹۰۹ء اِس کا ذکر کرتے ہُوئے لکھتا ہے :-

"اس رسالہ کے مضامین کی عمدگی کے لئے اس سے بڑھ کر کیا امر پیش کیا جاسکتا ہے کہ موافقین کے علاوہ مخالفین نے بھی اس کو پسند کیا ہے۔ چنانچہ اخبار وکیل امرتسر نے ایک مضمون سالم کا سالم اپنے پرچہ میں نقل کیا ہے جس کا ہیڈنگ "کیا تلوار کے زور سے اسلام پھیلا ہے؟" ہے' از قلم صاحبزادہ مرزا بشیرالدین محمود احمد صاحب"۔ [1]

احمدیہ دارالمطالعہ اور لائبریری کا قیام

ظاہر ہے کہ تصنیف کے کام کو اچھی کتابوں کا مہیا ہونا اور مطالعہ کی سہولتیں لازم ہیں۔ چنانچہ اس قومی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے آپ کی تحریک پر انجمن تشحیذ الاذہان نے قادیان میں پہلا دارالمطالعہ قائم کیا۔ تشحیذ میں اس تحریک کا ذکر کرتے ہوئے حضرت صاحبزادہ صاحب لکھتے ہیں:-

"اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے لازمی ہے کہ ہم اس تمام ذخیرۂ کتب کو جمع کریں جو ہمارے مذہبی علوم کے سیکھنے میں کارآمد ہو سکتے ہیں۔ مگر قادیان میں اس قسم کی کوئی لائبریری نہیں جہاں بیٹھ کر احمدی خواہ قادیان کے یا باہر کے آئے ہوئے کسی وقت کتبِ دینیہ کے مطالعہ سے اپنے ذخیرۂ معلومات کو بڑھا سکیں' اس لئے انجمن تشحیذ الاذہان نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اس ضرورت کو پورا کرے اور حضرت خلیفۃ المسیح کے مشورہ سے ایک دارالکتب یا لائبریری کھولنے کی صلاح ہے جو دن کے اکثر حصہ میں کھلا رہے گا اور وہ لوگ جو قادیان آتے ہیں بجائے اپنا وقت کسی اور جگہ لگانے کے اس جگہ بیٹھ کر دینی علوم میں ترقی کر سکیں گے۔ اس کتب خانہ میں حضرت اقدس کی کل کتب اور اشتہار اور دیگر تمام احمدیوں کی کتابیں خواہ کسی زبان میں ہوں رکھی جائیں گی اور اس کے علاوہ کتبِ حدیث اور تاریخ وغیرہ بھی رکھی جائیں گی"۔ [2]

یہ کام جس عمدگی اور سنجیدگی' جس اہتمام اور باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ کیا گیا' اس کا ذکر کرتے

---

[1] تشحیذ الاذہان مارچ ۱۹۰۹ء صفحہ ۳۔ [2] تشحیذ الاذہان جلد ۷ ۱۹۰۸ء صفحہ ۲۷، ۲۸

ہوئے اخبار "بدر" ۱۲؍مئی ۱۹۱۰ء لکھتا ہے :-

"انجمن تشحیذ خوب ترقی کر رہی ہے۔ لائبریری کا انتظام اعلیٰ پایہ پر زیرِ غور ہے۔ ساڑھے دس ماہ سے جو فہرستِ کتب تیار ہو رہی ہے' انشاء اللہ اب جلد مکمل ہونے والی ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ عنقریب ہم ہندوستان و مصر کے اردو و عربی چیدہ اخبارات اس کی میز پر دیکھیں گے...

صاحبزادہ مرزا محمود احمد صاحب کو نوجوانوں کی سدھار کا خاص خیال رہتا ہے۔ آپ نے اُن کالجیٹوں یا طالب علموں کے لئے جو بعد الامتحان یا سمر وکیشن دارالامان میں آتے ہیں' ایک تعلیمی نصاب تیار کیا ہے جس میں قرآن و حدیث کا ایک حصہ' قصیدہ بہشتی وغیرہ شامل ہے۔ آپ بڑی محنت سے اُن کو پڑھاتے ہیں اور عربی سے اور دین سے عمدہ واقفیت کرا دیتے ہیں۔ یہ بہت ہی مفید کام ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق بخشے"۔

اخبار الفضل کا اجراء

تشحیذ اگرچہ جماعت کی علمی ضروریات کو بہت حد تک بڑی عمدگی سے پوری کر رہا تھا' لیکن حضرت صاحبزادہ صاحب نے بجا طور پر یہ ضرورت محسوس کی کہ جب تک سلسلہ کا ایک باقاعدہ اخبار جاری نہ ہو صحیح معنوں میں مرکز اور جماعت کے مابین رابطہ قائم نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس شدید ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے آپ نے جون ۱۹۱۳ء میں الفضل اخبار کا اجراء فرمایا۔ یہ اخبار آج تک جماعت احمدیہ کا مرکزی روزنامہ چلا آرہا ہے۔ اس بارہ میں "اعلانِ فضل" کے عنوان کے تحت آپ نے ایک اشتہار شائع کیا جس میں آپ نے اس فلسفہ پر روشنی ڈالی کہ بعض چھوٹے چھوٹے امور کس طرح بڑے ہو جاتے ہیں' اور ایک چھوٹے سے بیج سے کس طرح بڑے بڑے عظیم القامت درخت بن جاتے ہیں۔ فرمایا' یہی مثال روحانی سلسلوں کی ہے۔ گذشتہ الٰہی سلسلوں کی طرح جماعت احمدیہ کی ضروریات بھی بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ پھر فرمایا :-

"اس لئے بموجب ارشاد حضرت خلیفۃ المسیح توکلاً علی اللہ اس اخبار کو شائع کرنے کا اعلان کیا جاتا ہے۔ ہمارا کام کوشش ہے۔ برکت اور اتمام خدا تعالیٰ

کے اختیار میں ہے۔ لیکن چونکہ یہ سلسلہ خدا کی طرف سے ہے اس لئے اس کی مدد کا یقین ہے۔ بے شک ہماری جماعت غریب ہے لیکن ہمارا خُدا غریب نہیں ہے اور اس نے ہمیں غریب دل نہیں دیئے۔ پس میں امید رکھتا ہوں کہ جماعت اس طرف پوری توجہ کرے گی۔ اور اپنی بے نظیر ہمت اور استقلال سے کام لے کر جو وہ اب تک ہر ایک کام میں دکھاتی رہی ہے اس کام کو بھی پُورا کرنے کی کوشش کرے گی اور میں دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مذکورہ بالا تحریر کو صرف ارادوں اور خواہشوں تک ہی نہ رہنے دے۔ اور سلسلہ کی ضروریات کے پورا کرنے میں ہمارا ہاتھ بٹائے۔"[1]

اِن علمی خدمات کے پیچھے قربانی اور ایثار، شوق اور جذب کے جو جذبات کارفرما تھے، ان کا کچھ اندازہ ان ذاتی قربانیوں سے ہو سکتا ہے جو آپ نے اور آپ کے اہلِ بیت نے ان اخبارات و رسائل کے سلسلہ میں پیش کیں۔ اس ضمن میں حضرت صاحبزادہ صاحب کی بعض بعد کی تحریرات کے چند اقتباس ناظرین کی دلچسپی کا موجب ہوں گے:۔

"مجھے اس وقت ساٹھ روپے ملتے تھے جن میں سے دس روپے ماہوار تو تشحیذ پر خرچ کرتا تھا۔ دو بچے تھے بیوی تھی اور گو کوئی خاص ضرورت تو نہ تھی مگر خاندانی طور طریق کے مطابق ایک کھانا پکانے والی اور ایک خادمہ بچوں کے رکھنے اور اوپر کے کام میں مدد دینے کیلئے میری بیوی نے رکھی ہوئی تھی۔ سفر اور بیماری وغیرہ کے اخراجات بھی اسی میں سے تھے۔ پھر مجھے کتابوں کا شوق بچپن سے ہے۔ چنانچہ اس گزارہ سے اپنی علمی ترقی کے لئے اور مطالعہ کے لئے کتابیں بھی خریدتا رہتا تھا اور کافی ذخیرہ میں نے جمع کر لیا تھا۔"[2]

"بدر اپنی مصلحتوں کی وجہ سے ہمارے لئے بند تھا۔ الحکم اوّل تو ٹمٹماتے چراغ کی طرح کبھی کبھار نکلتا تھا اور جب نکلتا بھی تھا تو اپنے جلال کی وجہ سے لوگوں کی طبیعتوں پر جو اس وقت بہت نازک ہو چکی تھیں، بہت گراں گزرتا تھا۔ ریویو ایک بالا ہستی تھی جس کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا

---

[1] "بدر" قادیان ۱۹ر جون ۱۹۱۳ء صفحہ ۱۷ تا ۲۰ [2] الفضل ۲۸ر دسمبر ۱۹۳۹ء

تھا۔ میں بے مال و زر تھا۔ جان حاضر تھی۔ مگر جو چیز میرے پاس نہ تھی وہ کہاں سے لاتا۔ اس وقت سلسلہ کو ایک اخبار کی ضرورت تھی جو احمدیوں کے دلوں کو گرمائے۔ اُن کی سستی کو جھاڑے۔ اُن کی محبت کو اُبھارے، اُن کی ہمتوں کو بلند کرے اور یہ اخبار ثریا کے پاس ایک بلند مقام پر بیٹھا تھا۔ اس کی خواہش میرے لئے ایسی ہی تھی جیسے ثریا کی خواہش۔ نہ وہ ممکن تھی نہ یہ۔ آخر دل کی بے تابی رنگ لائی۔ اُمید بر آنے کی صورت ہوئی۔ ...خدا تعالیٰ نے میری بیوی کے دل میں اسی طرح تحریک کی جس طرح خدیجہ رضی اللہ عنہا کے دل میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کی تحریک کی تھی۔ انہوں نے اس امر کو جانتے ہوئے کہ اخبار میں روپیہ لگانا ایسا ہی ہے جیسے کنوئیں میں پھینک دینا اور خصوصاً اس اخبار میں جس کا جاری کرنے والا محمود ہو جو اس زمانہ میں شاید سب سے زیادہ مذموم تھا، اپنے دو زیور مجھے دے دیئے کہ میں اُن کو فروخت کر کے اخبار جاری کر دُوں۔ اُن میں سے ایک تو اُن کے اپنے کڑے تھے اور دوسرے اُن کے بچپن کے کڑے تھے جو انہوں نے اپنی اور میری لڑکی عزیزہ ناصرہ بیگم سلمہا اللہ تعالیٰ کے استعمال کے لئے رکھے ہوئے تھے۔"

یہ زیور حضرت صاحبزادہ صاحب نے خود لاہور جا کر پونے پانچ سو روپے میں فروخت کئے۔ یہ تھا "الفضل" کا ابتدائی سرمایہ! یہ جیسی قیمتی امداد تھی اس کا اندازہ حضرت صاحبزادہ صاحب کے اِن الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے:-

"اس حُسنِ سلوک نے نہ صرف مجھے ہاتھ دیئے جن سے میں دین کی خدمت کرنے کے قابل ہُوا اور میرے لئے زندگی کا ایک نیا ورق اُلٹ دیا بلکہ ساری جماعت کی زندگی کے لئے بھی ایک بہت بڑا سبب پیدا کر دیا... میں حیران ہوتا ہوں کہ اگر اللہ تعالیٰ یہ سامان پیدا نہ کرتا تو میں کیا کرتا۔ اور میرے لئے خدمت کا کونسا دروازہ کھولا جاتا اور جماعت میں روزمرہ بڑھنے والا فتنہ کس طرح دُور کیا جا سکتا۔" [1]

---

[1] الفضل ۲۸ ر دسمبر ۱۹۳۹ء صفحہ ۷-۸

آخر پر ہم حضرت مولوی شیر علی صاحبؓ بی ۔اے کے ایک اقتباس پر اس باب کو بند کرتے ہیں۔ حضرت مولوی صاحب رضی اللہ عنہ جماعت احمدیہ کے بزرگان اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے خدام میں ایک بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ آپ اپنی نیکی، تقویٰ، بے نفسی اور سادگی میں ساری جماعت میں معرُوف و مشہور ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے آپ کو صدر انجمن احمدیہ کا ممبر بھی مقرر فرمایا تھا۔ آپ تعلیم الاسلام ہائی سکول میں ایک عرصہ تک مدرس کے فرائض انجام دیتے رہے اور حضرت صاحبزادہ مرزا محمود احمد صاحب کے اُستاد بھی رہے۔

آپ نے حضرت صاحبزادہ صاحب کی علمی کاوشوں کو جیسا پایا وہ مندرجہ ذیل الفاظ سے ظاہر ہے:

"اُن پاک جذبات میں سے جنہوں نے ابتدا سے آپ کے اندر نشوونما پائی ایک جذبہ تبلیغ تھا اور ساتھ ہی اس کے یہ اُمنگ کہ نہ صرف خود اس کام میں حصہ لیں بلکہ دوسروں کو بھی اس خدمت کے لئے تیار کریں۔ جس طرح ایک مُلک کے خیر خواہ اور قوم کے بہی خواہ لیڈر میں یہ تڑپ ہوتی ہے کہ اپنی بگری ہوئی قوم کو ترقی کے اعلیٰ مقام پر پہونچانے کے لئے اور اپنے دشمنوں سے گھرے ہوئے ملک کو حملہ آوروں کی دستبرد سے محفوظ رکھنے کے لئے اور اپنے ہاتھ سے نکلے ہوئے علاقہ کو دوبارہ فتح کرنے کے لئے اور دُنیا میں اپنی قوم کی حکومت کو مستحکم اور مضبوط کرنے کے لئے ایک فوج تیار کرے۔ اور اس فوج میں اپنی قوم کے نوجوانوں کو بھرتی ہونے کے لئے تحریک کرے اور بھرتی ہونے والوں کو قواعدِ جنگ کی تعلیم دے اور ان کو ضروری اسلحہ سے مسلح کرے۔ یہی جذبہ لڑکپن کے زمانہ میں آپ کے سینہ میں موجزن تھا چنانچہ آپ نے اپنی اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں ہی حضور علیہ السلام سے اجازت حاصل کرکے ایک رسالہ جاری کیا۔ جس کا نام حضور نے آپ کے دلی خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے اور اُن اغراض و مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے جن کے ماتحت آپ نے اس رسالہ کے اجرا کا ارادہ فرمایا تھا، تشحیذ الاذہان رکھا۔ یعنی ایسا رسالہ جس میں مضمون نویسی کی مشق کرکے سلسلہ کے نوجوان اپنی علمی طاقتوں اور اپنے ذہنوں کو تیز کریں گے اور آپ نے اس رسالہ

کے متعلق ایک انجمن قائم کی جس کے سپرد اس رسالہ کا انتظام اور اس کی ترقی کے لئے کوشش کرنا اور نوجوانوں میں مضمون نویسی اور علمی ترقی کی رغبت پیدا کرنا تھا۔ اور آپ ہر ایک ذریعہ سے کوشش کرتے تھے کہ کثرت سے لوگ اس تحریک میں شریک ہوں۔

رسالہ کے علاوہ آپ نے انجمن تشحیذ الاذہان کے زیر اہتمام ایک مجلس بھی قائم کی جس کا نام مجلسِ ارشاد تھا۔ اور اس سے آپ کی غرض یہ تھی کہ تبلیغی فوج میں بھرتی ہونے والے نوجوان اسلامی جدال کے لئے اس دوسرے ہتھیار کو بھی چلانے میں مشّاق ہوں جس کا نام تقریر ہے۔ یعنی وہ تحریر اور تقریر دونوں ہتھیاروں سے حفاظتِ اسلام اور اشاعتِ اسلام کی لڑائیاں لڑنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ پھر چونکہ آپ کی خواہشات کی جولانگاہ صرف ہندوستان نہ تھا بلکہ آپ تمام دُنیا کو اسلام کے لئے فتح کرنا چاہتے تھے اور آپ کی اسی نوجوانی کے زمانہ میں یہ آرزو تھی کہ رُوئے زمین کے شرق و غرب میں اسلام کا جھنڈا لہراتا ہوا دکھائی دے۔ اس لئے آپ نے مجلس ارشاد کے اجلاس دو حصوں میں تقسیم کر دیئے۔ ایک اُردو اور ایک انگریزی ... یہ کوششیں اگرچہ آپ کی عمر اور قادیان کے حالات کے لحاظ سے چھوٹے پیمانہ پر تھیں، لیکن اِن سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ نوجوانی کے زمانہ میں ہی آپ کے دل کے اندر کیا کیا اُبال اُٹھتے تھے اور کھیل کُود کے زمانہ میں آپ کے سینہ کے اندر کس بات کی تڑپ تھی۔

پھر جُوں جُوں آپ کی عمر بڑھتی گئی۔ آپ کے کام کا دائرہ بھی زیادہ وسیع ہوتا گیا۔ آپ نے لڑکپن کے زمانہ میں سلسلہ کے نوجوانوں کو اسلام کی قلمی اور لِسانی خدمت کے لئے تیار کرنے کی غرض سے رسالہ تشحیذ الاذہان جاری کیا تھا اور مجلسِ ارشاد کی بنیاد ڈالی تھی۔ خلافتِ اُولیٰ کے زمانہ میں آپ نے تمام جماعت احمدیہ کی تعلیم و تربیت کے لئے حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کی اجازت سے ایک ہفتہ وار

اخبار جاری کیا۔ جس کا نام "الفضل" ہے اور جو اِس وقت جماعتِ احمدیہ کا قومی آرگن ہے۔ اور قادیان سے روزانہ شائع ہوتا ہے پھر جماعت میں تبلیغی رُوح پھونکنے کے لئے اور رابطہ اخوت و محبت قائم کرنے کے لئے آپ نے انصار اللہ کی جماعت قائم کی۔"[1]

مالی مُشکلات

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی وفات نے خاندانِ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی مالی مشکلات، ذرائع آمد کی کمی اور زمیندارہ انتظام کی کمزوری کو بالکل نمایاں کر دیا تھا۔ لیکن حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا اصل ورثہ آپ کی رُوحانی برکتیں تھیں نہ کہ دنیاوی مال و منال۔ حضرت اُمّ المومنین رضی اللہ عنہا کو اللہ تعالیٰ نے تربیت کا نہایت لطیف ملکہ اور گہری فراست عطا فرمائی تھی چنانچہ مالی مشکلات کے اس صبر آزما دَور میں حضرت صاحبزادہ صاحب کے خیالات اور جذبات کی رَو کو اصل حقیقت کی طرف مبذول کرنے کی خاطر اپنے لختِ جگر کا ہاتھ تھام کر اسے بیت الدُّعا یعنی اُس چھوٹے سے حجرہ میں لے گئیں جہاں حضرت مسیح موعود علیہ السلام تخلیہ میں اپنے رب کی عبادت اور مناجات کیا کرتے تھے۔ اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے الہاموں والی کاپی نکال کر آپ کے سامنے رکھ دی اور کہا میں سمجھتی ہوں یہی تمہارا سب سے بڑا ورثہ ہے۔[2]

لیکن حضرت صاحبزادہ صاحب خود بھی تو یہی سمجھتے تھے اور اس کے برعکس کسی خیال کا گزر تک بھی کبھی آپ کے دل و دماغ سے نہ ہُوا تھا۔ ہاں ماں نے نہایت پیارے انداز میں اپنا فرض ادا فرما دیا اور خدا اور اس کے رسول کے حضور سرخرُو ہو گئیں۔ جہاں تک حضرت صاحبزادہ صاحب کے ذاتی خیالات کا تعلق ہے نہ کبھی پہلے آپ نے سلسلہ کے اموال کو اپنا سمجھا نہ بعد میں۔ ہاں ہمیشہ اپنے اموال کو سلسلہ احمدیہ کی ملکیت سمجھتے رہے۔

ایک مرتبہ بعض ناسمجھ احمدیوں نے بظاہر اخلاص کے رنگ میں آپ کو مشورہ دیا کہ جو چندے آتے ہیں وہ چونکہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے طفیل ہی آتے ہیں اس لئے آپ مطالبہ کریں کہ ان چندوں میں سے ہمارا حصہ بھی مقرر ہونا چاہیئے۔ حضرت صاحبزادہ صاحب فرماتے ہیں کہ میں اس وقت بچہ تھا مگر یہ مشورہ مجھے اتنا بُرا معلوم ہُوا کہ میں نے کمرے کے باہر ٹہلنا شروع کر دیا کہ مجھے جونہی موقع ملے میں والدہ

---

[1] روزنامہ "الفضل" قادیان ۵ رنومبر ۱۹۳۸ء صفحہ ۵ [2] الفضل ۲۲ راکتوبر ۱۹۵۵ء

سے اس کے متعلق بات کروں اور جب موقع ملا تو میں نے کہا کہ یہ چندے کیا ہماری جائیداد تھی؟ یہ تو خدا تعالیٰ کے دین کے لئے ہیں ان میں سے حصہ لینے کا کسی کو کیا حق ہے؟

ایک اَور دوست نے غالباً حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کے منشاء سے یہ تجویز پیش کی کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے خاندان کے لئے گزارہ مقرر کرنا چاہیئے۔ لیکن آپ نے کہا ہم اس کے لئے تیار نہیں ہیں۔ یہ جواب سُن کر اس دوست نے کہا پھر آپ لوگوں کے گزارے کی کیا صُورت ہوگی۔ آپ نے جواب دیا ہم بندوں کے کیوں محتاج ہوں۔ اگر اللہ تعالیٰ کا منشاء زندہ رکھنے کا ہوگا تو وہ خود انتظام کردے گا اور اگر اس نے مارنا ہے تو وہ موت زیادہ اچھی ہے جو اس کے منشاء کے ماتحت ہو۔ ادھر حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ آپ کی دینی مصروفیات اور مالی مشکلات سے بے خبر نہ تھے۔ چنانچہ حضور نے ایک دن آپ کو بُلایا اور کہا ہم آپ لوگوں کو اپنے پاس سے کچھ پیش نہیں کرتے بلکہ خود حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا الہام ہے جس کے ماتحت میں نے گزارہ کی تجویز کی ہے۔ اور الہام میں رقم تک مقرر ہے اس لئے بلا تمنا اور بلا مطالبہ خدا کے منشاء کے مطابق جو گزارہ خلیفہ وقت مقرر کرے اس کے قبول کر لینے ہی میں برکت ہے۔

چنانچہ آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سُنّت کے مطابق خلیفہ وقت کے ارشاد کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اور اللہ تعالیٰ کی منشاء اور خلیفہ وقت کے حکم کے مطابق یہ گزارہ قبول کر لیا۔ لیکن باوجود ذاتی ضروریات اور مالی مشکلات کے آپ اس مقررہ گزارہ سے کہیں زیادہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے دین کی بقاء کے لئے کھُلے ہاتھوں خرچ کرتے رہے۔

انجمن کے اس مقررہ گزارہ پر ہی آپ کے اخراجات کا مدار نہ تھا بلکہ زمیندارہ یا دوسرے ذرائع سے جو تھوڑی بہت آمدنی ہوتی اس کا بھی ایک معقول حصہ آپ اللہ تعالیٰ کی راہ میں پُوری بشاشت کے ساتھ خرچ کرتے رہتے۔ پہلے رسالہ تشحیذ الاذہان کے اخراجات کا ایک معتدبہ حصہ اپنی گرہ سے ادا کرتے رہے۔ پھر جب اخبار الفضل جاری کیا تو اس کے ابتدائی اخراجات بھی خود اُٹھاتے۔ مقررہ جماعتی چندوں میں باقاعدہ حصہ لینے کے علاوہ اس زمانہ میں پیش آمدہ دوسری قومی اور ملکی ضروریات میں بھی حسبِ استطاعت حصہ لیا۔ مہمانداری تو آپ کے خاندانی اوصاف میں شامل تھی۔ پھر جس قدر بھی اندرون یا بیرونِ ملک آپ نے علمی، تفریحی یا حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کے حکم سے تبلیغی سفر کئے، ان میں اپنی گرہ سے خرچ کیا اور باوجود حق کے جماعت کے بیت المال سے ایک پیسہ وصول کرنے کے بھی روادار نہ بنے۔

حضرت صاحبزادہ مرزا محمود احمد صاحب کا

منظوم کلام

حضرت صاحبزادہ صاحب کا عارفانہ منظوم کلام پہلی مرتبہ مئی ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا۔ آپ کی پہلی نظم ۱۹۰۳ء کی ہے جب کہ آپ شاد تخلص کرتے تھے۔ شعر و سخن کے باب میں آپ کا مسلک کیا رہا ہے اس پر آپ خود ہی روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"میں کسی نظم کو شاعری کے شوق میں نہیں کہتا ہوں۔ بلکہ جب تک ایک خاص جوش پیدا نہ ہو۔ نظم کہنا مکروہ سمجھتا ہوں۔ اس لئے دردِ دل سے نکلا ہوا کلام سمجھنا چاہیئے۔ بعض نظم ناکمل صورت میں پیش کرنے سے میرا مقصد یہ ہے تا کہ لوگ دیکھیں کہ شاعری کو بطور پیشہ نہیں اختیار کیا گیا۔ بلکہ جب کبھی قلب پر کیفیت ظاہر ہوتی تو اس کا اظہار کر دیا جاتا ہے اور پھر یہ خیال نہیں ہوتا کہ اس کو مکمل بھی کیا جاوے۔ چونکہ میں تکلف سے شعر نہیں کہتا۔ ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہے۔ پڑھو اور غور کرو۔ خدا کرے یہ درد بھرے کلمات کسی سعید رُوح کے لئے مفید و بابرکت ثابت ہوں۔"[1]

کلامِ محمود

"بابِ رحمت خود بخود پھر تم پہ وا ہو جائے گا — جب تمہارا۔ قادرِ مطلق خُدا ہو جائے گا
جو کہ شمع روئے دلبر پہ فدا ہو جائے گا — خاک بھی ہو گا تو پھر خاکِ شفا ہو جائے گا
مہدیٔ دَوران کا جو خاکپا ہو جائے گا — مہرِ عالم تاب سے روشن سوا ہو جائے گا
دیکھ لینا ایک دن خواہش بر آئے گی مری — میرا ہر ذرہ محمدؐ پہ فدا ہو جائے گا

[1] تاریخِ احمدیت جلد ۴ صـ۳۷۴

نقشِ پا پر جو محمدؐ کے چلے گا ایک دن　　پیروی سے اس کی محبوبِ خُدا ہو جائے گا
ہیں درِ مالک پہ بیٹھے ہم لگائے ٹکٹکی　　ہاں کبھی تو نالہ اپنا بھی رَسا ہو جائے گا
عشقِ مولا دِل میں جب محمود ہوگا موجزن　　یاد کر اس دن کو تو پھر کیا سے کیا ہو جائے گا"

۱؎

مناجات بدرگاہِ ایزدی

"اے مِرے مولیٰ مرے مالک مری جاں کی سپر　　مبتلائے رنج وغم ہوں جلد لے میری خبر
دوستی کا دم جو بھرتے تھے وہ سب دشمن ہوئے　　اب کسی پر تیرے بن پڑتی نہیں میری نظر
جبکہ ہر شے مِلک ہے تیری مرے مولا تو پھر　　جس سے تو جاتا رہا بتلا کہ وہ جائے کدھر
بے کسی میں رہزنِ رنج ومصیبت آپڑا　　سب متاعِ صبر وطاقت ہو گئی زیر وزبر

یا الٰہی رحم کر اپنا کہ میں بیمار ہوں　　دِل سے تنگ آیا ہوں اپنی جان سے بیزار ہوں
کرمِ خاکی ہوں نہیں رکھتا کوئی پرواہ میری　　دشمنوں پر بھی گراں ہوں دوستوں پر بار ہوں
کیا کروں جا کر حرم میں مجھ کو ہے تیری تلاش　　دار کا طالب نہیں ہوں طالبِ دیدار ہوں
صبر وتمکیں تو الگ، دِل تک نہیں باقی رہا　　راہِ اُلفت میں لُٹا ایسا کہ اب نادار ہوں"

۲؎

... تو خوب تھا

"وہ خواب ہی میں گر نظر آتے تو خُوب تھا　　مرتے ہوئے کو آکے جلاتے تو خُوب تھا
دِلبر سے رابطہ جو بڑھاتے تو خوب تھا　　یُوں عمرِ رائیگاں نہ گنواتے تو خوب تھا
اک غمزدہ کو چہرہ دِکھاتے تو خوب تھا　　روتے ہوئے کو آکے ہنساتے تو خوب تھا
محمود دِل خُدا سے لگاتے تو خوب تھا　　شیطاں سے اپنا پیچھا چھُڑاتے تو خُوب تھا
دُنیائے دُوں کو آگ لگاتے تو خوب تھا　　کوچہ میں اُوس کے دُھونی رماتے تو خُوب تھا"

۳؎

۱؎ اخبار بدر قادیان ۲۵؍جون ۱۹۰۸ء نمبر ۲۵ صفحہ ۱　۲؎ بدر ۹؍جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۲ جلد ۷　۳؎ بدر ۱۴؍جنوری ۱۹۰۹ء صفحہ ۹

اپیل بخدمت قوم

"یہ وہ نظم ہے کہ جو میری طرف سے ڈاکٹر احمد حسین صاحب لائلپوری نے سالانہ جلسہ کے موقعہ پر پڑھی۔ میں نے اُس وقت بھی حاضرین جلسہ کی خدمت میں عرض کر دی تھی کہ میں شاعری کے شوق میں نظم نہیں کہتا۔ بلکہ ایک خاص جوش جب تک پیدا نہ ہو، نظم کہنا مکروہ سمجھتا ہوں۔ اس لئے سامعین اسے شعر سمجھ کر نہیں بلکہ دردِ دل سے نکلی ہوئی نصیحت سمجھ کر سُنیں۔ اور اب بھی میں کُل ناظرین کی خدمت میں التماس کرتا ہوں کہ وہ اسے غور سے پڑھیں اور پھر اس کے مطالب پر غور کریں، حتی الوسع اس پر عمل کرنے کی کوشش کریں۔ وما توفیقی اِلّا باللہ۔

خاکسار مرزا محمود احمد

مُدّت سے پارہ ہائے جگر کھا رہا ہوں میں — رنج و محن کے قبضہ میں آیا ہوا ہوں میں
میری کمر کو قوم کے غم نے دیا ہے توڑ — کس ابتلاء میں ہائے ہوا مبتلا ہوں میں
کوشاں حصولِ مطلبِ دل میں ہوں اس قدر — کہتا ہوں تم کو سچ ہمہ تن التجا ہوں میں
کچھ اپنے تن کا فکر ہے مجھ کو نہ جان کا — دینِ محمدیؐ کے لئے مَر رہا ہوں میں
میں رو رہا ہوں قوم کے مرجھائے پھول پر — بلبل تو کیا ہے اس سے کہیں خوشنوا ہوں میں
بیمار رُوح کے لئے خاکِ شفا ہوں میں — ہاں کیوں نہ ہو کہ خاکِ درِ مصطفےٰؐ ہوں میں
پھر کیوں نہ مجھ کو مذہبِ اسلام کا ہو فکر — جب جان و دِل سے معتقدِ میرزا ہوں میں
کہتا ہوں سچ کہ فکر میں تیری ہی غرق ہوں — اے قوم سُن کہ تیرے لئے مَر رہا ہوں میں

کیا جانے تو کہ کیسا مجھے اضطراب ہے
ایسا تپاں ہے سینہ کہ دِل تک کباب ہے "[1]

---

[1] تشحیذ الاذہان ماہ فروری ۱۹۰۹ء صد ۱۷ تا ۱۹

نوائے محمود

"آؤ محمودؔ ذرا حال پریشاں کردیں — اور اسی پردے میں دشمن کو پشیماں کردیں
غنچۂ ناز پہ ہم جان کو قرباں کردیں — اور لوگوں کے لئے راستہ آساں کردیں
کھینچ کر پردہ رُخِ یار کو عریاں کردیں — وہ ہمیں کرتے ہیں ہم اُن کو پشیماں کردیں"

[۱]

نغمۂ محمود

"مجھ سا نہ اس جہاں میں کوئی دِلفگار ہو — جس کا نہ یار ہو نہ کوئی غمگسار ہو
کتنی ہی پُل صراط کی گو تیز دَھار ہو — یارب مِرا وہاں بھی قدم استوار ہو
تقویٰ کی جڑ یہی ہے کہ خالق سے پیار ہو — گو ہاتھ کام میں ہوں مگر دِل میں یار ہو"

[۲]

نوائے محمود

"ہائے وہ دل کہ جسے طرزِ وفا یاد نہیں — وائے وہ رُوح جسے قولِ بلیٰ یاد نہیں
بے حسابی نے گناہوں کی مجھے پاک کیا — میں سراپا ہوں خطا کوئی خطا یاد نہیں
دردِ دل سوزِ جگر اشک رواں تھے ہمدست — یار سے مل کے کوئی بھی تو رہا یاد نہیں
ایک دن تھا کہ محبت کے تھے مجھ سے اقرار — مجھ کو تو یاد ہیں سب آپ کو کیا یاد نہیں
ہم وہ ہیں پیار کا بدلہ جنہیں مِلتا ہے پیار — بھولے ہیں روزِ جزا اور جزا یاد نہیں"

[۳]

یادِ مسیحؑ

"وہ نکاتِ معرفت بتلائے کون — جامِ وصلِ دِلرُبا پلوائے کون
ڈھونڈتی ہے جلوۂ جاناں کو آنکھ — چاند سا چہرہ ہمیں دِکھلائے کون

---

[۱] اخبار بدر قادیان ۲۹ر اپریل ۱۹۰۹ء صفحہ ۳ [۲] بدر ۱۳ر مئی ۱۹۰۹ء صفحہ ۳ [۳] بدر ۲۰ر مئی ۱۹۰۹ء صفحہ ۳

کون دے دِل کو تسلّی ہر گھڑی — اب اُڑے وقتوں میں آڑے آئے کون
کون دِکھلائے ہمیں راہِ ہُدیٰ — حضرتِ باری سے اب مِلوائے کون
سرد مہری سے جہاں کی دِل ہے سرد — گرمیٔ تاثیر سے گرمائے کون
کون دُنیا سے کرے ظُلمت کو دُور — راہ پر بھُولے ہُوؤں کو لائے کون
کون میرے واسطے زاری کرے — درگہِ ربّی میں میرا جائے کون
وہ گُلِ رعنا ہی جب مُرجھا گیا — پھر بہارِ جانفزا دِکھلائے کون
کل نہیں پڑتی اِسے اُس کے سوا — اس دِلِ غمگین کو سمجھائے کون
اے مسیحا! تیرے سودائی جو ہیں — ہوش میں بتلا کہ ان کو لائے کون"

زمزمہ

"مکّہ معظمہ جاتے ہُوئے یہ نظم صاحبزادہ مرزا محمود احمد صاحب نے لکھی"

"روڑے جاتے ہیں بہ اُمید تمنّا سُوئے باب — شاید آجائے نظر رُوئے دِل آرا بے نقاب
یا الٰہی! آپ ہی اب میری نُصرت کیجئے — کام لاکھوں ہیں مگر ہے زندگی مثلِ حباب
کیا بتاؤں کس قدر کمزوریوں میں ہوں پھنسا — سب جہاں بیزار ہو جائے جو ہوں میں بے نقاب
میں ہوں خالی ہاتھ مجھ کو یونہی جانے دیجئے — شاہ ہو کر آپ کیا لیں گے فقیروں سے حساب
میری خواہش ہے کہ دیکھوں اس مقامِ پاک کو — جس جگہ نازل ہوئی مولا تیری اُمّ الکتاب
ابنِ ابراہیم آئے تھے جہاں با تشنہ لب — کر دیا خشکی کو تُو نے اُن کی خاطر آب آب
میرے والد کو بھی ابراہیم ہے تُو نے کہا — جس کو جو چاہے بنائے تیری ہی عالی جناب
ابنِ ابراہیم بھی ہوں اور تشنہ لب بھی ہوں — اس لئے جاتا ہوں میں مکّہ کو با اُمیدِ آب
چشمۂ انوار میرے دل میں جاری کیجئے — پھر دکھا دیجے مجھے عنوانِ رُوئے آفتاب"

۱؎ بدر قادیان ۲۷ مئی ۱۹۰۹ء صفحہ ۳
۲؎ تشحیذ الاذہان ماہ فروری ۱۹۱۳ء صفحہ ۹۶

یادِ حبیبؐ

"اے چشمۂ علم و ہُدیٰ اے صاحبِ فہم و ذکا   اے نیک دِل اے باصفا اے پاک طینت باحیا
اے مقتدا اے پیشوا اے میرزا اے رہنما   اے مجتبیٰ اے مصطفیٰ اے نائبِ ربُ الوریٰ

کچھ یاد تو کیجئے ذرا ہم سے کوئی اقرار ہے

دیتے تھے تم ہر دم خبر بندھتی تھی جس سے یاں کمر   مِٹ جائے گا سب شور و شر موت آئیگی شیطان پر
پاؤ گے تم فتح و ظفر ہوں گے تمہارے بحر و بر   آرام سے ہوگی بسر۔ ہوگا خُدا مدِ نظر

واں تھے یہ وعدے خُوبتر۔ یاں حالتِ ادبار ہے

چھینے گئے ہیں ملک سب باقی ہیں اب شام و عرب   پیچھے پڑا ہے اُنکے اب دُشمن لگائے تا نقب
ہم ہو رہے ہیں جاں بلب بنتا نہیں کوئی سبب   ہیں منتظر اس کے کہ کب آئے ہمیں امداد اب

پیالہ بھرا ہے لب بلب ٹھوکر ہی اک درکار ہے

کیا آپ پر الزام ہے یہ خود ہمارا کام ہے   غفلت کا یہ انجام ہے سُستی کا یہ انعام ہے
قسمت یونہی بدنام ہے دِل خود اسیرِ دام ہے   اب کِس جگہ اسلام ہے باقی فقط اک نام ہے

ملتی نہیں مے جام ہے بس اک یہی آزار ہے"

لہ

لہ تشحیذ الاذہان مارچ ۱۹۱۳ء صہ ۱۵۲، ۱۵۳

مختلف سفروں کی روئداد

حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کے چھ سالہ دورِ خلافت میں حضرت صاحبزادہ مرزا بشیرالدین محمود احمد کو متعدد سفر پیش آئے جن کی ظاہری غرض خواہ کچھ بھی ہو لیکن عملاً یہ تمام سفر ایک ہی مقصد کو پورا کر رہے تھے اور کوئی ایک بھی سفر ایسا نہ تھا جس میں بیشتر وقت خدمتِ دین میں صرف نہ ہوا ہو۔ جلسوں میں شمولیّت اور تقریروں کے علاوہ احبابِ جماعت کی تربیت اور غیر از جماعت دوستوں سے مذہبی امور پر تبادلۂ خیالات میں اکثر وقت گزر جاتا۔ ان سب مصروفیات سے جو وقت سیر و سیاحت کے لئے بچتا اور قدرتی مناظر کی سیر یا قابلِ دید تاریخی اور مقدس مقامات کی زیارت پر خرچ ہوتا، وہ بھی عملاً خدمتِ دین ہی کا ایک حصّہ تھا کیونکہ جیسا کہ آپ کے سفروں کی روئداد کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے یہ وقت بھی آپ اہم دینی اور قومی مسائل پر فکر و تدبّر میں خرچ کرتے اور جیسے ایک عاشق کو مختلف حسین مواقع یا مناظر اپنے محبوب کی یاد دلاتے ہیں اسی طرح سیر و تفریح کے دوران مختلف اثر پذیر نظارے آپ کے جذبات اور افکار کے دھاروں کا رُخ دینی اور قومی مسائل کی طرف پھیر دیتے تھے اور بسا اوقات آپ گہری سوچ کی جھیل میں غوطہ زن ہو کر بیش قیمت افکار و نظریات کے موتی چُن لاتے۔ پس جسمانی سیر کے ساتھ ساتھ ایک سیرِ روحانی بھی جاری رہتی

رسالہ تشحیذ ۱۹۰۹ء کے ایک پرچہ میں آپ کے مختلف سفروں کی ایک روئداد شائع ہوئی تھی جس میں خلافتِ اُولیٰ کے صرف پہلے سال کے سفروں کا مختصر ذکر ہے۔ ہم اس میں سے ایک اقتباس درج کرتے ہیں جس سے آپ کے سفروں کا وہ ظاہری پہلو قارئین کے سامنے آجائے گا جسے ایک صحابی کی آنکھ نے دیکھا۔ اس کے بعد ہم خود حضرت صاحبزادہ صاحب کی زبانی آپ کے بعض سفروں کی روئداد پیش کریں گے جسے دیکھ کر قارئین آپ کے سفروں کے باطنی پہلو کا بھی کسی حد تک نظارہ کر سکیں گے۔

حضرت صاحبزادہ صاحب کی سیرت اور کردار کے مطالعہ کا یہ بھی ایک دلچسپ طریق ہے :

> "... آپ مختلف مقامات میں تبلیغِ اسلام کے لئے لیکچر دیتے ہیں اور جہاں کہیں آپ کو باہر کسی شہر میں جاتے کا اتفاق ہوتا ہے، فوراً لیکچر دیتے ہیں۔
>
> آپ کا سب سے پہلا سفر جو اس غرض کے لئے ہوا، بیگووال کی طرف

تھا جہاں آپ باجازت حضرت امیرالمومنین شادی کے موقع پر گئے تھے اور آپ نے وہاں پہنچ کر خلق اللہ کو اپنے لیکچر سے فائدہ اُٹھانے کا موقع دیا

پھر سالانہ جلسہ کے کچھ دن پہلے جب کہ ایک طرف انجمن تشحیذ الاذہان کی اہم ذمہ داریاں اور دوسری طرف صدر انجمن احمدیہ کی ضروریات قادیان میں رہنے پر آپ کو مجبور کرتی تھیں، حسب الحکم حضرت امیرالمومنین آپ کو انجمن احمدیہ کاٹھ گڑھ ضلع ہوشیارپور کے جلسہ پر جانا پڑا۔

پھر آپ نے تشحیذ الاذہان کے سالانہ جلسہ پر ایک بڑا مبسوط لیکچر دیا جو اس رسالہ کے اسی سال کے پہلے پرچہ میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے بعد مارچ کے آخری عشرہ میں نوجوان احمدی طلباء لاہور نے اپنی انجمن "الاخوان" کے سالانہ جلسہ پر آپ کو مدعو کیا۔ آپ باوجودیکہ سفر کے بالکل ناقابل تھے۔ کیونکہ آپ کو ایک بہت سخت چوٹ لگی تھی اور اسی حالت میں کہ ڈاکٹر صاحبان بھی آپ کو باہر جانے کا مشورہ نہ دیتے تھے، باجازت حضرت امیرالمومنین خلیفۃ المسیح لاہور پہنچے۔ جب آپ جلسہ کے دن مقامِ جلسہ پر پہنچے تو آپ کے سخت درد ہو رہی تھی اور کھڑا ہونے کے قابل نہ تھے پر بفضلِ ایزدی آپ جس وقت کھڑے ہوئے فوراً درد رفو چکر ہو گیا اور آپ نے آرام کے ساتھ ایک اعلیٰ لیکچر دیا۔

اس کے بعد آپ نے ایک لمبا دورہ کیا جس میں چار لیکچر دیئے۔

آپ مارچ کے خاتمہ پر قادیان دارالامان سے اپنی والدہ محترمہ حضرت اُم المومنین کے ساتھ دہلی کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں آپ چند روز کپورتھلہ میں ٹھہرے۔ چونکہ انجمن احمدیہ لاہور کا سالانہ جلسہ بہ یادگار حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ۱۲ ربیع الاوّل مطابق ۵ راپریل ۱۹۰۹ء کو لیکچر ہونا تھا۔ اس لئے آپ کپورتھلہ سے لاہور روانہ ہوئے اور وہاں ... لیکچر دیا۔ اس جگہ سے فارغ ہو کر آپ دہلی میں حضرت ام المومنین کی خدمت میں جا حاضر ہوئے اور وہاں دہلی میں ۹ راپریل کو لیکچر دیا۔ پھر چونکہ ۱۱ راپریل کو انجمن احمدیہ قصور کا سالانہ جلسہ تھا جس میں آپ کو مدعو کیا گیا تھا

اس لئے آپ قصور پہنچے اور وہاں جلسہ میں ایک لیکچر دینے کے بعد جلسہ سے فارغ ہوکر دوبارہ حضرت اُمّ المومنین کی خدمت بابرکت میں دہلی میں جاکر حاضر ہوگئے۔ جہاں آپ نے ۱۶/ اپریل کو ایک عام لیکچر دیا اور وہاں سے آپ دارالامان بہمہ خیریت مع حضرت ام المومنین واپس پہنچے۔ اس آخری سفر کے مفصّل حالات بدر میں شائع ہونگے۔ لیکن ایڈیٹر صاحب ممدوح نے آج ہی میری التجا پر اس بات کو منظور فرمایا ہے کہ مؤخر الذکر تقریریں کو رسالہ میں شائع کیا جاوے جس کے لئے میں ناظرین کو مبارک باد دیتا ہوں۔ جائنٹ ایڈیٹر۔" [1]

انجمن احمدیہ فیروزپور کا سالانہ جلسہ ۲۹-۳۰ مئی ۱۹۰۹ء کو منعقد ہوا۔ اس میں ۲۹/ مئی کو دوسرے اجلاس میں حضرت صاحبزادہ صاحب کی تقریر ہوئی۔ ایڈیٹر الحکم نے اس کے متعلق لکھا کہ:

"حکیم احمد حسین صاحب کی نظم کے بعد حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب کا لیکچر تھا جو آپ نے اس مضمون پر دیا:

"اسلام کیا ہے اور وہ ہمیں کیا بنانا چاہتا ہے"

یہ لیکچر نہایت قابلیت اور خصوصیت کے ساتھ دیا گیا۔ مجھے اس لیکچر پر زیادہ ریمارک کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اس لیکچر کو عنقریب شائع کردوں گا (انشاء اللہ) کیونکہ میں نے اس لیکچر کو خود لکھا ہے اور حضرت صاحبزادہ صاحب کی اصلاح کے بعد اس کے شائع کرنے کی کوشش کروں گا۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

حضرت صاحبزادہ صاحب کے لیکچر کے وقت جناب خواجہ صاحب (خواجہ کمال الدین صاحب۔ ناقل) صدرِ جلسہ تھے۔ خواجہ صاحب نے جو ریمارک اس لیکچر پر کئے، اِن میں سے دو تین فقرے مَیں اُنہیں کے الفاظ میں دیتا ہوں۔ "صاحبزادہ صاحب نے جس قابلیت کے ساتھ اپنے لیکچر کو ختم کیا ہے، میں اس پر کچھ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتا مگر جو حقانیت اُن کے دل پر مُرتسم ہے وہ بڑے بڑے آدمیوں میں نہیں۔ اگرچہ ہم نے کوئی گدی

[1] تشحیذ الاذہان مئی ۱۹۰۹ء صفحہ ۱۶۱ تا صفحہ ۱۶۳

نہیں بنائی مگر میں اتنا کہتا ہوں کہ آپ نے اور
پیروں کے بچے بھی دیکھے ہیں۔ میرے مُرشد زادہ
اور پیر زادہ کو بھی آپ نے دیکھا ہے کہ وہ قرآن
کریم پر کیسا شیدا ہے اور اس کے حقائق و معارف
بیان کرنے میں کیسا قابل ہے۔"

اس قسم کے ریمارکس کے بعد جن میں حضرت صاحبزادہ صاحب کے مضمون کی بے حد تعریف تھی، خواجہ صاحب نے دوسرے اجلاس کو ختم کیا۔"[1]

سفرِ مُلتان

نومبر ۱۹۰۹ء میں جماعت احمدیہ ملتان کے بہت اصرار پر اور حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کی اجازت سے حضرت صاحبزادہ صاحب نے ملتان کا سفر کیا اور مُلتان میں منعقدہ ایک جلسہ سے خطاب فرمایا۔
اس قافلہ کو قادیان سے روانگی کے وقت خود حضرت خلیفۃ المسیح نے رُخصت کیا اور فرمایا:

"میں نے بہت دعا کی ہے۔ ملتان میں شیعہ بہت ہیں
پر تم چار یار وہاں جاتے ہو۔ نرمی سے وعظ کرو۔ سخت
کلامی نہ کرو۔ دعاؤں سے بہت کام لو۔ امیر بنا بنایا
تمہارے ساتھ ہے۔"

آپ کا اشارہ حضرت صاحبزادہ صاحب کی طرف تھا کیونکہ آپ وفد کے امیر تھے۔ آپ نے جمعہ لاہور میں پڑھایا اور خطبہ میں خلافت کے برکات اور رحمت کا بیان کیا اور اس کی مخالفت کا خلاف قرآن و حدیث و تعامل صحابہ ہونا ثابت کیا اور جماعت کو تاکید فرمائی کہ اختلافات میں نہ پڑیں۔ کوئی امرِ شر اُن کے علم میں آوے تو اپنی مجلسوں میں اس پر مباحثات نہ کریں بلکہ ایسے معاملات حضرت خلیفۃ المسیح تک پہنچا دیویں اور پھر وہاں سے جو حکم آوے اس پر عمل درآمد کریں اور جو لوگ خلافت کے خلاف کوئی بکواس کریں اُن کی مجلسوں میں بیٹھنا اور ان سے تعلق رکھنا غیرت کے خلاف سمجھیں۔"[2]

---

[1] "الحکم" قادیان ۸ر جون ۱۹۰۹ء صفحہ ۳-۴
[2] "بدر" قادیان ۱۸ر دسمبر ۱۹۱۳ء صفحہ ۳

بعض دیگر سفر

علم کی تلاش اور تعلیم دین کی اشاعت کا جذبہ عشق کی حد تک پہنچا ہُوا تھا۔ نہ دن کو آرام کرتے نہ رات کو چین سے سوتے۔ ہر وقت یہی خیال تھا کہ دینِ احمد کی اشاعت ہو تو کیونکر، دُنیا صحیح تعلیم سے روشناس ہو تو کس طرح ۔۔ ؟ مختلف مقامات پر جو تبلیغی یا تربیتی اجلاس ہوتے حضرت خلیفۃ المسیح رضی اللہ عنہ کی ہدایت پر آپ اُن میں شمولیت فرماتے۔ اسی ضمن میں آپ اندرونِ ملک دہلی، ڈلہوزی، بنارس، کانپور، لاہور، ملتان، قصور، امرتسر، بٹالہ، وزیر آباد اور دوسرے متعدد مقامات پر تشریف لے گئے اور بڑے بڑے مجمعوں کو خطاب فرمایا۔ جس کا خاص رُوحانی اثر پیدا ہُوا اور متعدد افراد کو قبولِ حق کی توفیق ملی۔ جماعتِ احمدیہ فیروزپور، ملتان اور لاہور کے سالانہ جلسوں میں آپ کی پُر اثر تقاریر کا ذِکر پہلے گزر چکا ہے۔

۱۹۰۹ء میں آپ حضرت اُمّ المومنین رضی اللہ عنہا کے ساتھ دہلی تشریف لے گئے۔ آپ نے اس سفر کے تبلیغی حالات انہی دنوں الحکم میں شائع کرائے۔ جو بڑے دلچسپ اور معلومات افزا تھے۔ دہلی میں آپ کے ۲ دو لیکچر ہوئے۔ ایک کا موضوع "اسلام اور آریہ مذہب" اور دوسرے کا "اسلام اور عیسائیت" تھا دونوں لیکچروں میں دہلی کے معززین کی ایک کثیر تعداد شامل ہُوئی۔ ایک جلسہ کی صدارت خواجہ حسن نظامی نے کی۔ قیامِ دہلی کے دوران ہی آپ نے لاہور کے جلسہ سیرت النبیؐ میں شمولیت فرمائی۔ اس کے بعد پھر دہلی گئے۔ وہاں کچھ دن قیام کرنے کے بعد جماعت احمدیہ قصور کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لئے تشریف لے گئے۔ چونکہ حضرت ام المومنینؓ ابھی دہلی میں تشریف رکھتی تھیں۔ اس لئے قصور کے جلسہ سے فارغ ہو کر پھر دہلی اُن کی خدمت میں حاضر ہُوئے اور وہاں ایک اَور رُوح پرور لیکچر دینے کا موقع ملا۔ دہلی سے واپسی کے وقت آپ نے جن الفاظ میں دُعا کی اُن سے آپ کے دِلی جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ آپ نے کہا خدا وہ دِن لائے کہ اس شہر کو بھی خدا ہدایت دے اور اس مٹی سے پھر کسی دِن اس قسم کے برگزیدہ لوگ پیدا ہوں جن کے مزار بکثرت وہاں پائے جاتے ہیں۔[1]

۱۹۱۱ء میں آپ حضرت خلیفۃ المسیح رضی اللہ عنہ کے مشورہ کے ماتحت بحالیٔ صحت کی غرض سے ڈلہوزی تشریف لے گئے۔ یہ ایک تفریحی سفر تھا۔ لیکن اس میں بھی تبلیغِ حق کے فریضہ کا

---

[1] الحکم ۷ مئی ۱۹۰۹ء

کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ وہاں ایک پادری سے جس کا نام ہِگنسن تھا مذہبی مسائل پر تفصیلی گفتگو کی۔ بعد میں ڈلہوزی سے واپس آکر آپ نے اس گفتگو کی تفصیل "پہاڑی وعظ" کے نام سے رسالہ تشحیذ الاذہان میں شائع کرادی۔ آپ کے دلچسپ طرزِ استدلال کے نمونہ کے طور پر اس گفتگو کا ایک حصہ یہاں درج کیا جاتا ہے:۔

"مجھے بھی پچھلے دنوں پہاڑ پر جانے کا اتفاق ہُوا۔ اور وہاں پنجاب کے ایک مشہور ومعروف پادری صاحب سے ہمکلامی کا موقع مِلا۔۔۔ پادری صاحب ہم کو ڈلہوزی کے بازار میں کتابوں کا ایک بنڈل ہاتھ میں لیئے ہوئے نظر آئے جو قریباً تمام کی تمام اسلام کے خلاف تھیں اور اِسی غرض سے لکھی گئی تھیں کہ نادان اور جاہل مسلمانوں کو پُھسلا کر دائرۂ اسلام سے خارج کرکے مسیح کی بھیڑوں میں شامل کیا جائے۔ پادری صاحب نے عندالملاقات دو رسالے ہمیں بھی دیئے جن میں اسلام اور اس کے بانیؑ پر مختلف پیرائیوں میں حملے کئے گئے تھے۔ انہیں پڑھ کر میری طبیعت میں اَور بھی جوش آیا کہ پادری صاحب سے مِل کر ضرور چند باتوں کا تصفیہ کرنا چاہیئے۔

اس اتفاقی ملاقات کے دوسرے یا تیسرے دن فرصت نکال کر میں اور دو اَور صاحب پادری صاحب کی ملاقات کے لئے گئے۔ نصف گھنٹہ کی تلاش کے بعد پادری صاحب کی کوٹھی کا پتہ لگا۔ جو ایک بڑی پُرفضا اور خوبصورت مقام پر بنی ہُوئی تھی۔۔۔ پادری صاحب برآمدے میں ہی کھڑے تھے۔ دیکھ کر بڑے تپاک سے ملے اور اندر لے گئے۔ اور ملاقات کے کمرے میں ہم تینوں کو بٹھا کر ایک دو منٹ کے لئے باہر تشریف لے گئے۔ واپس آنے پر پادری صاحب نے حسبِ معمول مختلف واقعات پر گفتگو شروع کی۔ اور انگلستان کی موجودہ حالت پر باتیں ہوتی رہیں۔۔۔ ان پادری صاحب کا نام ہِگنسن ہے۔۔۔ اِدھر اُدھر کی گفتگو کے بعد پادری صاحب نے گفتگو کا رُخ مسیحیت کی طرف پھیرا اور چاہتے تھے کہ مسیحیت کے متعلق طول وطویل تفصیلوں میں ہم کو لے جائیں اور جو احسانات مسیحیت نے یورپ پر کئے ہیں ہمارے سامنے بیان کریں لیکن چونکہ وقت کم اور فرصت قلیل تھی۔ میں نے عرض کی کہ ہم سرِدست تثلیث کے متعلق کچھ پُوچھنا چاہتے ہیں جسکی پادری صاحب نے بڑی خوشی سے اجازت دی۔۔۔ چونکہ میں نے جاتے ہی پادری صاحب سے عرض کر دیا تھا کہ میں آپ سے جو گفتگو کروں گا وہ طالبِ حق ہونے کی حیثیت سے کرونگا نہ کہ کسی

مذہب کے پیرو ہونے کی حیثیت سے۔ اس لئے میں مندرجہ ذیل گفتگو میں اپنے نام کی جگہ "طالبِ حق" کا لفظ استعمال کروں گا۔

طالبِ حق — پادری صاحب! آپ کا تثلیث کے متعلق کیا خیال ہے؟

پادری صاحب۔ میرا خیال ہے کہ تثلیث تین اقنوم کا نام ہے۔ ایک اقنوم خدا باپ۔ ایک اقنوم مسیح بیٹا اور ایک روح القدس۔ اور میں ان تینوں کی خدائی کا قائل ہوں۔

طالبِ حق — پادری صاحب! آپ کی اقنوم سے کیا مراد ہے؟

پادری صاحب۔ (مسکرا کر) اقنوم آپ ہی کی زبان کا لفظ ہے۔

طالبِ حق — بے شک ہماری زبان کا لفظ ہے لیکن ہم خدا تعالیٰ کی نسبت اس لفظ کا استعمال نہیں کرتے۔ اس لئے جب خدا تعالیٰ کی نسبت یہ لفظ استعمال ہو تو ہمیں اس کے معنے سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔

پادری صاحب۔ میں تو اور اس کے لئے کوئی لفظ تجویز نہیں کر سکتا۔

طالبِ حق — اگر آپ اُردو یا عربی میں اس کے لئے کوئی اور لفظ تجویز نہیں کر سکتے تو انگریزی میں ہی سہی۔

پادری صاحب۔ انگریزی میں ہم اس کے لئے پرسینیلیٹی استعمال کرتے ہیں۔

طالبِ حق — میں نے ایک امریکن پادری سے دریافت کیا تھا تو انہوں نے اس کے معنے کیپیسٹی کے بتائے تھے۔

پادری صاحب۔ نہیں نہیں اس کے معنے پرسینیلیٹی کے ہیں۔

طالبِ حق — مجھے تو ... نہ اقنوم کے معنی سمجھ آتے ہیں اور نہ پرسینیلیٹی کے۔ میں آپ سے کھول کر پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ یہ فرمائیے کہ یہ تینوں کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً یہی کہ دُنیا کا خالق کون ہے؟

پادری صاحب۔ آپ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ محبّت ہے۔ اس میں محبّت کا مادّہ ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کسی چیز سے محبت کرے اور یہ تمام دُنیا کی چیزیں فانی ہیں اصلی نہیں ہیں۔ اس لئے ضروری تھا کہ ایک ایسا وجود ہوتا کہ جس سے خدا محبّت کرتا۔ سو اس لئے بیٹے کی ضرورت تھی اور اس کو تو آپ بھی مانتے ہوں گے کہ اگر کوئی ایسا وجود نہ ہو کہ جس سے خدا محبت کرے تو

وہ محبّت فضول جائے گی۔

طالبِ حق — پادری صاحب! آپ نے بہت ہی معقول بات فرمائی ہے لیکن میں اس وقت تثلیث کو سمجھنا چاہتا ہوں نہ کہ تثلیث کی ضرورت کو۔ میرا سوال تو یہ تھا کہ یہ دُنیا کس طرح پیدا ہوئی اور کس نے کی۔

پادری صاحب۔ کلمے سے پیدا ہوئی۔ خدا نے کی۔

طالبِ حق — کلمہ دُنیا بن گیا اور یہ دُنیا اسی کا حصّہ ہے یا خدا نے حکم دیا اور وہ ہوگئی۔

پادری صاحب۔ (مُسکرا کر) اوہو! ہمارا یہ خیال نہیں ہے کہ دُنیا نیست سے پیدا ہوئی۔ یہ آریوں کا خیال ہے۔ مجھ سے ایک دفعہ ایک آریہ ملا تھا اور اُس نے مجھ سے پُوچھا تھا کہ دُنیا کس طرح پیدا ہوئی۔ نیست سے ہست کس طرح ہوسکتا ہے۔ میں نے اُسے جواب دیا کہ ہمارا ہرگز یہ مذہب نہیں کہ نیست سے ہست ہُوا۔ خُدا نے حکم کیا ہوجا! وہ ہوگئی۔ ہم نہیں مانتے کہ اُس نے نیست کو کہا کہ تو کُچھ بن جا۔

طالبِ حق — اوہو! آپ نے بہت اچھا جواب دیا۔ اور بہت لطیف بات کہی۔ لیکن میری عرض یہ تھی کہ کلمہ سے دُنیا پیدا ہوئی یا خدا کے امر پر دُنیا موجود ہوگئی۔

پادری صاحب۔ ہاں کلمہ مسیح ہے۔ انجیل میں لکھا ہے کہ ابتدا میں کلام تھا۔ اور کلام خدا کے ساتھ تھا۔ اور کلام خدا تھا۔ یہی ابتدا میں خدا کے ساتھ تھا۔ سب چیزیں اس سے موجود ہوئیں اور کوئی چیز موجود نہ تھی جو بغیر اس کے ہُوئی۔ زندگی اس میں تھی اور وہ زندگی انسان کا نُور تھی۔ اس سے معلوم ہُوا کہ ابتدا میں خدا کے ساتھ مسیح تھا اور مسیح سے دُنیا پیدا ہُوئی۔ آپ کے مذہب اسلام میں بھی مسیح کو کلمہ کہا گیا ہے۔ کیا میں آپ کو اس کی نسبت کچھ سناؤں؟

طالبِ حق — پادری صاحب! میں نے آپ سے ابتداً ہی میں عرض کر دیا تھا کہ میں ایک ایسے انسان کی حیثیت میں آپ کے پاس آیا ہُوں جس کی نظر میں تمام مذاہب برابر ہیں اور گو میں مسلمان ہوں لیکن اس وقت میں ایسے پیرایہ میں گفتگو کروں گا گویا کُل مذاہب ابھی میرے زیرِ تحقیق ہیں۔ اس لئے

آپ ابھی انجیل کی نسبت کلام فرما دیں۔ اگر قرآن شریف کی تحقیقات کی ضرورت ہوگی تو میں کسی مولوی کے پاس جاؤں گا۔ قرآن شریف کی تحقیقات کے لیے مجھے کسی پادری کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے۔ وید کی نسبت میں پنڈت سے پوچھوں گا۔ قرآن شریف کی نسبت کسی مولوی سے اور بائبل کی نسبت پادری صاحب سے تحقیقات کروں گا۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ میں بائبل سمجھنے کے لیے کسی مولوی کے پاس جاؤں اور قرآن شریف سمجھنے کے لیے کسی پادری کے پاس۔ آپ اس وقت بائبل سے کلام فرما دیں۔

پادری صاحب۔ (مسکرا کر) ہاں تو بے شک آپ بائبل کی نسبت سوال کرتے ہیں۔ بائبل سے جیسا کہ میں نے بتایا ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ کلام سے دُنیا پیدا ہوئی۔

طالبِ حق ـــــ تو پادری صاحب! آپ تثلیث کے کیوں قائل ہیں۔ کلام ایک صفت ہے اور خدا میں بیسیوں صفات پائی جاتی ہیں۔ دیکھتا ہے، سُنتا ہے، قادر ہے، علیم ہے، خالق ہے۔ آپ صرف صفتِ کلام کو ہی کیوں خدا قرار دیتے ہیں۔ آپ کُل صفاتِ الٰہیہ کو ابنائے الٰہیہ قرار دیں۔ آپ کے مذہب کے رُو سے تو صرف تثلیث پر ہی کفایت نہیں کی جا سکتی۔

پادری صاحب۔ او ہو! آپ کو غلطی لگ گئی۔ کیا آپ خدا کے کلام کو انسانی کلام سمجھتے ہیں؟ اس بات کو تو آپ بھی مانتے ہیں کہ خدا میں اور انسان میں مشابہت نہیں ہے کلام صفت نہیں کلام قدرت ہے۔

طالبِ حق ـــــ پادری صاحب! کلام وہ ذریعہ ہے کہ جس سے ہم اپنا ما فی الضمیر دوسرے پر ظاہر کرتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ خدا تعالیٰ میں اور ہم میں بہت فرق ہے وہ خالق ہے اور ہم مخلوق ہیں۔ لیکن جیسے انسان کے دیکھنے کی طاقت سُننے کی طاقت اور اس کے علم کو آپ لوگ صفاتِ انسانی قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کی بھی اِن طاقتوں کو صفات ہی قرار دیتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ خدا کی صفتِ علم کو یا صفاتِ سمع کو تو آپ صفت قرار دیں، اور صفتِ کلام کو اس بنا پر کہ خدا اور انسان میں

بہت فرق ہے۔دوسری ذات قرار دیں... پھر علاوہ ازیں آپ صرف اس کلام کو جس کے واسطے سے دُنیا پیدا کی گئی۔کیوں خدا کہتے ہیں۔کیوں توریت اور انجیل اور دیگر صُحفِ انبیاءؑ کو خدا قرار نہیں دیتے ....

پادری صاحب۔(مُسکراکر) نہیں نہیں! ہم اِنجیل توریت کو خدا نہیں مانتے۔ہمارے مذہب میں ایسا جائز نہیں۔اور ہم تو کلام کو صفت قرار نہیں دیتے بلکہ ایک ذات قرار دیتے ہیں۔

طالبِ حق۔۔۔۔ تو آپ کلام کو کیا سمجھتے ہیں۔

پادری صاحب۔قُدرت!

طالبِ حق۔۔۔۔ جناب نے فرمایا ہے کہ ہم کلام کو قدرت سمجھتے ہیں۔لیکن آپ کو یاد رکھنا چاہیئے کہ قدرت بھی کوئی علیٰحدہ ذات نہیں۔مثلاً میرے ہاتھ میں پکڑنے کی قدرت ہے۔یہ قدرت میرے ارادے کے ماتحت ہے۔اس میں خود کوئی علم نہیں۔جب ہاتھ کو حکم دیتا ہوں کہ تُو پکڑ' تو وہ پکڑ لیتا ہے ... لیکن خود میرے ہاتھ کے پکڑنے کی قدرت میں تو کوئی علم نہیں۔اگر آپ مسیح کو قدرت بھی قرار دیں اور کلام کا دُوسرا نام قدرت رکھیں۔تب بھی تو مسیح کوئی علیحدہ ذات قرار نہیں پا سکتا۔ورنہ ہر ایک چیز میں کچھ نہ کچھ قدرت ہوتی ہے تو اس طرح ہر ایک ذات کو دو دو ذاتیں قرار دینا پڑے گا۔ اور دوسرے اس صُورت میں یہ بھی لازم آتا ہے کہ مسیح علم اور ارادے سے خالی تھا کیونکہ جیسا کہ میں ثابت کر آیا ہُوں کہ قدرت صفتِ علم وارادہ کے بکلّی ماتحت ہوتی ہے۔

پادری صاحب۔ہم تو مسیح کو علم سے خالی نہیں سمجھتے۔مسیح ضرور علیم ہے۔

طالبِ حق۔۔۔۔ یہ بے شک دُرست ہے کہ آپ مسیح کو ایک علیم ہستی مانتے ہیں اور گو مسیح انجیل میں اپنے علم کا منکر ہے مگر اس وقت مجھے اس سے کوئی تعلق نہیں۔میں آپ ہی کی بات کو مانتا ہوں اور چونکہ مسیح خدا ہے۔اس لئے ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے لیکن یہ اعتقاد کی بات ہے۔اور جیسا کہ میں اُوپر بیان کر آیا ہوں مسیح کو اگر کلمہ مان لیا جاوے تو اوّل تو وہ ایک صفت اور پھر علم

سے خالی ثابت ہوتا ہے اور چونکہ میں عقلی دلیل سے ہی فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔ اس لئے ضرور ہے کہ یا تو سرے سے مسیح کے کلمہ ہونے کا ہی انکار کر دوں یا آپ کے قول کو مانتے ہوئے اسے کلمہ تو قرار دوں۔ لیکن علم سے خالی۔

پادری صاحب۔ بے شک عقل تو یہی کہتی ہے لیکن انجیل اس بات کو نہیں مانتی۔

طالبِ حق ـــــ تو کیا عقل کی رو سے تثلیث کا ماننا ناممکن ہے۔

پادری صاحب۔ اس میں کیا شک ہے کہ عقلِ انسانی ہستی باری کی کُنہ تک نہیں پہنچ سکتی

طالبِ حق ـــــ جبکہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے عقل ہی ایک سمجھ کا ذریعہ بنایا ہے تو بغیر عقل کے ہم کسی بات کو مان کیونکر سکتے ہیں۔ بے شک بعض باتیں عقل سے بالا ہوتی ہیں لیکن کوئی الٰہی مذہب اپنے پیرووں سے خلافِ عقل باتیں نہیں منواتا۔ میں اس بات میں آپ سے متفق ہوں کہ ذاتِ الٰہی کی کنہ کو پہنچنا انسانی عقل کا کام نہیں کیونکہ وہ محدود ہے۔ مگر یہ ضروری ہے کہ جن باتوں کا ماننا مدارِ نجات ہے وہ انسانی عقل کی پہنچ کے اندر ہونی چاہئیں کیونکہ اگر بعض ایسی باتیں مدارِ نجات قرار دے دی جائیں جو عقل کے خلاف ہوں تو انسان کے لئے نجات کا دروازہ بالکل بند ہو جائیگا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی ہستی پر ایمان لانا نجات کے لئے ضروری ہے تو ہستی باری کا ثبوت ضرور ایسا ہونا چاہیئے جو عقل کے خلاف نہ ہو ....
پس چونکہ تثلیث کا مسئلہ آپ کے مذہب کی رُو سے جُزوِ اعظم ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ یہ ایسے پیرایہ میں بیان کیا جاتا جس کو عقل انسانی سمجھ سکتی۔

پادری صاحب۔ بے شک عقل یہی کہتی ہے لیکن تثلیث کے ماننے سے پہلے انجیل کا ماننا ضروری ہے۔

طالبِ حق ـــــ انجیل کو انسان تب مانے جب اصولِ مسیحیت ثابت ہو جائیں۔ ان مسائل کے حل ہونے سے پہلے انسان انجیل کو کب مان سکتا ہے؟

پادری صاحب۔ جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا ہے انجیل کے ماننے سے پہلے ان مسائل کا سمجھنا مشکل ہے۔ [1]

---

[1] تشحیذ الاذہان جلد ۶ نمبر ۸ ۱۹۱۱ء صہ ۲۸۸ تا صہ ۲۹۷

ایک اَور موقع پر آپ نے اسی گفتگو کا ذکر کرتے ہُوئے مندرجہ ذیل دلچسپ واقعہ بیان فرمایا:۔

"مَیں نے ایک پنسل اُن کی میز سے اُٹھا کر اُن کے قریب رکھ دی اور مَیں نے کہا' پادری صاحب! اِس پنسل کو اُٹھا کر دُوسری جگہ رکھنے پر آپ قادر ہیں؟ انہوں نے کہا' ہاں۔ پھر میں نے کہا کیا میں قادر ہوں؟ انہوں نے کہا' ہاں! پھر میں نے ایک تیسرے شخص کی طرف اشارہ کرکے کہا' کیا یہ صاحب قادر ہیں؟ پادری صاحب نے کہا' ہاں! مَیں نے کہا جب ہم تینوں شخص اپنی ذات میں اس پنسل کو ہلانے پر قادر ہیں' لیکن پھر بھی ہم تینوں کھڑے ہو کر شور مچا دیں کہ او بہرہ! ادھر آؤ' او باورچی! اِدھر آؤ۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوں تو ہم اُن سے کہیں کہ ہم تینوں سے مِل کر یہ پنسل اِدھر رکھ دو۔ تو بتایئے وہ ہمیں پاگل سمجھیں گے یا نہیں؟ پادری صاحب نے کہا آپ کا مطلب؟ میں نے کہا صرف جواب دے دیجئے۔ انہوں نے کہا ہاں' پاگل کہیں گے۔ میں نے کہا جب خدا باپ خُدا بیٹا اور خُدا رُوح القدس تینوں کائنات کے پیدا کرنے پر بذاتہٖ قادر ہیں' اور اس کے باوجود وہ ایک دوسرے کو اس کام کے لئے بلاتے ہیں جس کو وہ اکیلے اکیلے کر سکتے ہیں تو بتایئے دوسرے خدا بُلانے والے خدا کو اور ہم لوگ اس خدا کو پاگل کہیں گے یا نہیں؟ اور پاگل خدا ہو ہی نہیں سکتا۔ یا تو پاگل کہلا کر وہ خدا نہ رہے گا یا ایسے پاگل دُنیا میں وہ اودھم مچا دیں گے کہ دُنیا ہی تباہ ہو جائے گی۔" (تفسیر کبیر سورۃ انبیاء صفحہ ۵۰۲-۵۰۳)

اس سفر کے دوران ایک اور دلچسپ واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے۔ محترم شیخ فضل احمد صاحب مرحوم جو ایک وقت میں افسر امانت صدر انجمن احمدیہ رہے ہیں' بیان کرتے ہیں کہ:

"۱۹۱۱ء میں مَیں ڈلہوزی ملازم تھا اور جس مکان میں مَیں رہتا تھا اس کے قریب ہی کوتوال عبدالغفار خان کا مکان تھا۔ اس کے پاس ملنے جلنے والوں کا جمگھٹا رہتا۔ لیکن میں باوجود قریب رہنے کے بھی اس کے ہاں کبھی نہ گیا تھا۔ جب کافی عرصہ اسی طرح گزر گیا تو ایک دن جبکہ میں اس کے مکان کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اس نے مجھے بازو سے پکڑ لیا اور یہ کہتے ہُوئے اپنے مکان میں لے گیا کہ پڑوس میں رہ کر اس طرح لاتعلقی اچھی

نہیں لگتی۔ اندر ہر طرح کے پھل رکھے تھے مگر میں نے اُن کے لئے کسی رغبت کا اظہار نہ کیا اور کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد کہا آؤ باہر سیر کے لئے چلیں۔ وہ میرے ساتھ باہر نکلا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے اس کا سبب پوچھا تو اس نے جواب دیا۔ میرے ہاں کوئی اولاد نہیں۔ روپیہ پیسہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے بہت ہے۔ خرچ بھی خوب کرتا ہوں۔ لوگ میرے پاس بن بلائے بھی کھانے کیلئے آتے ہیں لیکن تم میری پیشکش کے باوجود ان سے بے نیاز ہو۔ میں نے تم جیسا عجیب آدمی نہیں دیکھا۔ میرے لئے دُعا کرو۔ شیخ صاحب کہتے ہیں کہ اس پر میں نے اُسے جواب دیا میری تو کوئی حیثیت ہی نہیں اگر دیکھنا ہے تو میرے مرشد زادہ مرزا محمود احمد کو دیکھو۔ اُن کے حُسنِ سیرت کا کوئی جواب ہی نہیں۔ وہ کہنے لگا اُن سے ملنے کی کوئی صورت ۔۔ ؟ کیا وہ یہاں آنے کی میری دعوت قبول کریں گے؟ میں نے کہا اُن سے ملنے کی صُورت خدا سے چاہو۔ بہر حال کچھ دنوں کے بعد میں ڈلہوزی سے قادیان آیا تو مسجد مبارک کی سیڑھیوں کے پاس یکہ کھڑا دیکھا۔ پوچھا یہ کس کے لئے ہے۔ معلوم ہُوا میاں محمود احمد صاحب ڈلہوزی جا رہے ہیں۔ میری آپ سے بے تکلفی تھی۔ روانگی کے لئے جب باہر آئے تو میں نے مصافحہ کیا اور ساتھ ہی عرض کیا وہاں آپ کا ایک عاشق بیٹھا ہے۔ آپ میری بات پر مسکرائے اور کسی قسم کی تفصیل معلوم کئے بغیر یکہ پر سوار ہو گئے۔ اس دن غالباً اتوار کا دن تھا۔ میں نے کسی سے پوسٹ کارڈ لیا اور کوتوال عبدالغفار خاں کو لکھ دیا کہ تمہیں جن کی طلب تھی وہ اس گاڑی سے ڈلہوزی آرہے ہیں۔ اُن سے ملنے کی کوشش کرو۔ عبدالغفار کا خیال تھا کہ جیسے اور پیر ہوتے ہیں' یہ بھی فقیرانہ لباس 'نیلی تہمد والے کوئی سائیں جی ہوں گے جن کے آگے آگے کسی مرید نے جھنڈا اُٹھا رکھا ہو گا۔

غرض اپنے تصوّر کے مطابق اُس نے اپنے آدمیوں کو اِس قسم کی علامات بتا کر اڈّے پر بھیجا کہ اس ہیئت کذائی کے بزرگ جب یہاں پہنچیں تو اُن سے درخواست کی جائے کہ وہ میرے ہاں قیام فرمائیں۔ ان لوگوں نے واپس آکر بتایا کہ اس قسم کے کوئی پیر آج ڈلہوزی نہیں آئے۔ اس پر وہ خود ایک احمدی دوست کے ہاں گیا اور پوچھا آج تمہارے پیرزادہ نے آنا تھا' کیا وہ آگئے ہیں۔ اس دوست نے بتایا کہ ہاں وہ تشریف لے آئے ہیں۔ اور اس وقت اللہ تعالیٰ کے گھر یعنی مسجد میں نماز پڑھنے گئے ہیں۔ چنانچہ وہ وہاں پہنچا۔ آپ

نماز سے فارغ ہو چکے تھے۔اُس نے حاضر ہو کر درخواست کی کہ آپ اس کے ہاں قیام فرمائیں مگر آپ نہ مانتے۔ پھر اُس نے میرا خط دکھایا اور اصرار کیا کہ شرفائے شہر کو سفارش کے لئے نے آؤں گا۔اس پر آپ نے فرمایا میں تو ان احمدی دوستوں کا مہمان ہوں' ان کی اجازت سے ہی جا سکتا ہوں۔ پہلے تو دوستوں نے بھی معذرت کی اور کہا یہ تو مبلغ ہیں تبلیغ کریں گے اور اس طرح شاید آپ کے لئے مشکلات پیدا ہوں لیکن کوتوال نے کہا بھلا تم مجھ سے زیادہ کہاں تبلیغ کروا لو گے۔ جتنے آدمی کہو گے بُلوا دُوں گا۔غرضیکہ احمدی دوست مصلحتاً مان گئے اور اس طرح وہ حضرت صاحبزادہ صاحب کو اپنے ہاں لے گیا۔آپ کے اعزاز میں بہت بڑی دعوت دی۔معززین کو مدعو کیا۔جب سب لوگ آگئے تو حضرت صاحبزادہ صاحب سے کہنے لگا۔یہ کھانا تو ہم ہر روز کھاتے ہیں۔نئی چیز تو آپ کی رُوحانی باتیں ہیں پہلے یہ رُوحانی کھانا کھلائیں۔پھر یہ کھانا بھی چُنا جائے گا۔چنانچہ حضرت صاحبزادہ صاحب نے ایک سحر آگیں تقریر فرمائی جس کا مدعوین پر خاص اثر ہُوا۔تقریر کے بعد کھانا کھایا گیا۔ اور لوگ خوشی خوشی رخصت ہُوئے۔کوتوال عبدالغفار خاں نے آپ سے عرض کیا کہ ابھی میرا دِل نہیں بھرا۔آپ کچھ آرام فرما لیں تو آپ کو شہر کے مولویوں کے پاس لے جاؤں گا تاکہ ان کو بھی تبلیغ ہو سکے۔"[1]

غرض اللہ تعالیٰ کے فضل سے صحت کی بحالی کے ساتھ ساتھ تبلیغ کے لحاظ سے بھی آپ کا یہ سفر بہت کامیاب رہا۔

۱۹۱۴ء میں حضرت خلیفۃ المسیح رضی اللہ عنہ کے ارشاد پر آپ نے چکوال ضلع جہلم کے علاقہ کا تبلیغی دورہ کیا۔اس دَورے کی رپورٹ "الفضل" میں اِن الفاظ میں شائع ہُوئی:۔

"۲۴ر جنوری ۱۹۱۴ء کو مفتی فضل الرحمان صاحب کے ہمراہ قادیان سے آپ روانہ ہُوئے۔ لاہور پہنچ کر آپ نے ۲۵ر جنوری کی شام کو جماعت لاہور کی درخواست پر ایک پُر معارف لیکچر دیا جس میں آیت "اُدْعُونِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ" کی تفسیر کرتے ہُوئے زمانۂ حال کے مسلمانوں کا صحابہ کی قربانیوں سے مقابلہ کیا اور آخر میں جماعت کو تبلیغ حق کی ضرورت واہمیت بتائی اور اُن کے فرائض کی طرف توجہ دلائی۔تقریر کے بعد اُسی دِن لاہور سے روانہ ہو کر ۳ بجے شب جہلم پہنچے۔۲۶ر جنوری کو نمازِ ظہر کے بعد جہلم میں آپ نے ایک تقریر فرمائی جو

---

[1] مسوّدہ روایات حضرت شیخ فضل احمد صاحب مرحوم

سورۃ فاتحہ کی تفسیر پر مشتمل تھی۔ ۲۷ر جنوری کو آپ ۶ بجے صبح جہلم سے بذریعہ ریل مندرا اسٹیشن پر اُترے اور تانگہ پر سوار ہو کر شام کے چھ بجے چکوال رونق افروز ہوئے۔ راستہ میں چک نورنگ کے احمدی علاقہ دار بابو غلام حیدر اور علاقہ دار سید رکن شاہ اور سید اللہ دتہ نمبردار چوہان نے آپ کا استقبال کیا۔

چکوال میں ایک مختصر سے خطاب کے بعد ۲۹ر جنوری کو آپ تانگے پر سوار ہو کر چک نورنگ تشریف لے گئے جہاں شام کو مردوں اور عورتوں میں الگ الگ وعظ کیا۔ چک نورنگ سے آپ گھوڑے پر سوار ہو کر ۳۰ر جنوری کو چوہان پہنچے اور جمعہ پڑھانے کے بعد ایک عام لیکچر دیا۔ جس میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت کھول کھول کر بیان فرمائی۔ یہ تقریر بڑی دلپذیر تھی اور لوگوں پر اس کا گہرا اثر ہوا۔ اگلے دن ۳۱ر جنوری آدھی رات کو آپ چوہان سے بذریعہ ریل جہلم پہنچے اور صبح جوبلی گھاٹ میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت پر زبردست لیکچر دیا۔ لیکچر گاہ باوجود مخالفت کے پُر تھی۔ شام کو آپ جہلم سے گوجرانوالہ پہنچے اور وہاں کی جماعت سے خطاب فرمایا۔ دوسرے دن صبح چار بجے ریل پر سوار ہوئے اور شام کو بٹالہ پہنچ کر بوقت عشاء قادیان وارد ہوئے ''۔[1]

یہ تو آپ کے تبلیغی اور تربیتی سفر تھے۔ علم و معرفت کی تلاش میں آپ نے بعہدِ خلافتِ اُولیٰ بعض علمی سفر بھی کئے۔

آپ کے بعض تعلیمی سفر

پہلا سفر آپ نے اندرونِ ملک بعض مشہور مدارس اسلامیہ کے معائنہ اور وہاں کے علمی ماحول کے مطالعہ کی غرض سے اختیار کیا۔ اس سفر میں:

''مولانا سید سرور شاہ صاحبؓ، قاضی امیر حسین صاحبؓ، حافظ روشن علی صاحبؓ سید عبدالحی عرب صاحبؓ اور شیخ یعقوب علی صاحب عرفانی آپ کے ساتھ تھے۔

روانگی سے قبل یہ وفد حصولِ دعا کے لئے حضرت خلیفۃ المسیح رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا:۔

---

[1] الفضل ۱۱ر فروری ۱۹۱۴ء

"میں میاں صاحب کو تم پر امیر مقرر کرتا ہوں... میاں صاحب کو میں نصیحت کرتا ہوں کہ تقوی اللہ اور چشم پوشی سے عموماً کام لیں۔ بہت دعائیں کریں۔ جناب الٰہی میں گر جانے سے بڑے بڑے برکات اترتے ہیں۔ اور آپ لوگوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ آپ اپنے امیر کی پوری پوری اطاعت و فرمانبرداری کریں۔ کوئی کام ان کی اجازت کے بدوں نہ کریں۔ علم کا گھمنڈ کوئی نہ کرے۔ میں نے بھی علوم پڑھے ہیں بعض وقت کوئی لفظ بھول بھی جاتا ہوں مگر خدا کے فضل سے خوب سمجھتا ہوں۔ بہت پڑھایا ہے اور پڑھاتا بھی ہوں مگر میں نے دیکھا ہے کہ محض علوم کچھ چیز نہیں ؎

علم آں بود کہ نور فراست رفیق اوست

تم بھی اس علم کو حاصل کرو۔ یہی اپنا مقصد بناؤ۔ باقی علوم کچھ بھی چیز نہیں ہوتے۔ ان کا گھمنڈ بھی نہ کرنا۔ دعاؤں سے بہت کام لینا... میرا اپنا تجربہ ہے جب انسان اللہ تعالیٰ کے دروازے پر گر جاتا ہے تو پھر خدا تعالیٰ اس کے دل کو کھول دیتا ہے اور آپ ہی اس مشکل کا حل بتا دیتا ہے... علماء سے ملو اگر کسی سے عمدہ بات ملے تو اسے فوراً لے لو۔ کیونکہ كَلِمَةُ الْحِكْمَةِ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ اَخَذَهَا حَيْثُ وَجَدَهَا یعنی حکمت کی بات مومن کی گم شدہ متاع ہے۔"[1]

بعد حصول دعا یہ وفد ۳ر اپریل ۱۹۱۲ء کو روانہ ہو کر امرتسر کے راستہ ہردوار اور ہردوار سے لکھنؤ پہنچا۔ حضرت صاحبزادہ صاحب نے جمعہ امین آباد پارک میں قاضی محمد اکرم صاحب کے مکان پر پڑھایا۔ اور آیت وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ[2] پر ایک مختصر خطبہ دیا اور سلسلہ کی تبلیغ و اشاعت کے لئے تحریک فرمائی

اس کے بعد آپ مولانا شبلی کے قائم کردہ دار العلوم ندوہ دیکھنے تشریف لے گئے مولانا شبلی کو پتہ چلا تو انہوں نے اصرار کیا کہ ۶۔۷۔۸ر اپریل ۱۹۱۲ء کو ندوۃ العلماء کا سالانہ جلسہ ہو رہا ہے۔ مصر سے سید رشید رضا بھی تشریف لا رہے ہیں۔ آپ حضرات بھی ضرور شمولیت فرمائیں اور ہمارے ہاں ہی قیام کریں۔ چنانچہ حضرت صاحبزادہ صاحب مولانا

---

[1] تفسیر کبیر الماعون صفحہ ۲۶۶ ‏ [2] آل عمران : ۱۰۵

کی دعوت پر جلسہ میں شامل ہوئے۔ تعطیلِ جمعہ سے متعلق ایک پیش شدہ ریزولیوشن کی تائید میں تقریر کی۔ اس خیال سے کہ دوسرے علما چڑ نہ جائیں اور کوئی بدمزگی پیدا نہ ہو۔ آپ نے مولانا کے ہاں قیام نہ فرمایا لیکن علامہ شبلی مرنجاں مرنج طبیعت رکھتے تھے۔ ان کو جب معلوم ہُوا کہ آپ کا قیام کسی اور جگہ ہے تو وہ اصرار کرکے آپ کو اپنے یہاں لے آئے۔ وہاں جاکر جیسا کہ خیال تھا کچھ بدمزگی پیدا ہُوئی اور غیر احمدی علماء نے مولانا کو گالیاں دیں مگر وہ بہت ہمت والے آدمی تھے' انہوں نے اس کی بالکل پرواہ نہ کی[1]

ندوۃ العلماء کے جلسہ سے فارغ ہوکر آپ لکھنؤ کا مدرسہ فرنگی محل دیکھنے گئے۔ مدرسہ کے سٹاف اور ان کے اخلاص سے آپ از حد متاثر ہوئے۔ جس وقت وفد وہاں پہنچا تو مولوی عبد الباری صاحب فرنگی محلی نہایت تپاک سے ملے اور اپنی کلاس کا معائنہ کرایا اور پھر مولوی صبغۃ اللہ کو وفد کے ساتھ کیا کہ باقی سکول دکھادیں۔ آپ نے دیکھا کہ ہر طالب علم نہایت ادب اور متانت سے بات کرتا تھا۔ مولوی عبدالحی صاحب کے نواسے کو بھی انہوں نے پیش کیا کہ اس سے سوال کریں۔ اس وقت اس کی عمر کوئی ۱۲ سال کے قریب تھی۔ اس سے آپ نے جتنے سوال کئے' اس نے نہایت سنجیدگی اور متانت سے اُن کے جواب دیئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ آپ کسی طالب علم سے سوال نہیں پوچھ رہے بلکہ کسی مفتی سے فتویٰ دریافت کر رہے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ اس بچہ کو تین چار ہزار عربی شعر یاد ہیں۔ غرض وہ لڑکا بڑا ہی ذہین تھا۔ افسوس کہ یہ نہایت ذکی اور فہیم بچہ نوعمری ہی میں فوت ہوگیا۔

قیصر باغ لکھنؤ کی بارہ دری واجد علی شاہ میں آپ نے خصوصیاتِ سلسلہ پر ایک کامیاب لیکچر دیا۔ لکھنؤ سے آپ مولوی سید سرور شاہ صاحب اور سید عبدالمحی عرب صاحب کو لے کر بنارس گئے۔ جماعت نے گو مخالفت کے ڈر سے کچھ پس و پیش کیا۔ مگر آپ نے اس کی پرواہ نہ کی اور وہاں چار کامیاب لیکچر دیئے۔ وفد کے باقی ارکان نے لکھنؤ میں سید رشید رضا اور دوسرے علماء سے ملاقاتیں کیں۔ حقیقۃ الوحی کا ضمیمہ۔ استفتاء اور دوسری کتب تقسیم کیں۔ ۱۷ اپریل کو حضرت صاحبزادہ صاحب بنارس سے کانپور پہنچے۔ جہاں وفد کے دوسرے حضرات پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ کانپور میں دو مدرسے قابلِ دید تھے۔ مدرسہ جامع العلوم جس کے ناظم محمد سعید خانصاحب' مالک مطبع نظامی تھے۔ دوسرا مدرسہ الٰہیات تھا جس کے پرنسپل مولانا آزاد سُبحانی تھے۔ چنانچہ آپ نے یہ دونوں مدرسے دیکھے

---

[1] الحکم ۱۴ اپریل ۱۹۱۲ء

۱۸؍اپریل کی شام کو کانپور میں حضرت صاحبزادہ صاحب کا ایک پبلک لیکچر طلاقی محل کے میدان میں ہوا جو آپ کی قیام گاہ کے نزدیک تھا۔ لیکچر کے وقت لوگوں کا ایک ہجوم امڈ آیا اور لیکچر گاہ بالکل بھر گئی اور بہت سے لوگوں کو کھڑا ہونا پڑا۔ کوئی اڑھائی ہزار کے قریب مجمع ہوگا۔ سب سے پہلے مولوی عبدالمحی عرب صاحب نے تلاوت کی۔ پھر حافظ روشن علی صاحبؓ کی مختصر سی تقریر ہوئی۔ اس کے بعد آپ کھڑے ہوئے اور گو بنارس میں کثرت سے بولنے کی وجہ سے طبیعت علیل تھی مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کی ایسی غیر معمولی تائید و نصرت فرمائی کہ آپ نے ایک جدید اور اچھوتے رنگ میں احمدیت کی تبلیغ کی جسے سُن کر سب مسحور ہو گئے۔ دو اڑھائی گھنٹہ تک آپ کی تقریر ہوئی۔ تقریر کے بعد جونہی آپ بیٹھے تو لوگ اپنی جگہ پر یہ سمجھ کر جمے رہے کہ شاید سانس لینے کے لئے بیٹھے ہیں۔ آخر اعلان کیا گیا کہ لیکچر ختم ہے۔ اس پر سامعین نے بآوازِ بلند کہا کہ بہت سے لوگ مصافحہ کرنا چاہتے ہیں چنانچہ وہ لوگ جو دن کے وقت ایک گفتگو کے دوران میں آپ کے منہ پر کافر کہہ کے گئے تھے۔ بڑھ بڑھ کر مصافحے کرنے لگے۔ کانپور کے شرفاء نے مزید قیام اور لیکچر کی درخواست کی۔ مگر آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں یہی ڈالا ہے کہ اب میں یہاں سے روانہ ہو جاؤں۔

یہاں سے روانہ ہو کر دوسرے دن آپ شاہجہان پور پہنچے اور حافظ سید مختار احمد صاحبؓ کے مکان پر قیام فرمایا۔ انہی کی تحریک پر آپ نے صبح کے وقت ایک ایسا پُر اثر خطاب فرمایا کہ مولوی سراج الدین خانپوری صاحب نے اس کی افادیت کے پیشِ نظر اس کی فوری اشاعت کی تحریک کرتے ہوئے اپنی طرف سے کچھ رقم بھی پیش کی۔

۲۰؍اپریل کو یہ وفد رام پور پہنچا جہاں خانصاحب ذوالفقار علی خان اور مولوی عبیداللہ صاحب بسمل آپ کے خیر مقدم کے لئے موجود تھے۔ رام پور میں آپ نے مدرسہ عالیہ دیکھا۔ ۲۲؍اپریل کو آپ وفد سمیت امروہہ پہنچے۔ اسٹیشن پر مولوی سید محمد احسن صاحبؓ امروہوی اور دوسرے احبابِ جماعت نے پُرجوش استقبال کیا۔ حضرت صاحبزادہ صاحب نے یہاں بھی ایک مختصر سی تقریر فرمائی۔

۲۳؍اپریل کو وفد دہلی پہنچا اور مدرسہ حسین بخش، مدرسہ عبدالرّبّ اور مدرسہ فتح پوری دیکھا۔ ۲۵؍اپریل کو دارالعلوم دیوبند دیکھنے کے لئے گئے۔ جمعیۃ الانصار کے سیکرٹری مولوی عبیداللہ صاحب سندھی کے ذریعہ سے دارالعلوم دیوبند کے صدر مولانا محمود الحسن صاحب اور دوسرے بزرگ علماء سے ملاقات ہوئی۔ مدرسہ کا معائنہ کرنے اور مدرسہ کے متعلق ضروری معلومات حاصل کرنے کا موقع ملا۔ مہتمم مدرسہ مولوی محمد احمد صاحب خلفُ الرشید مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بڑے اخلاق اور مروّت سے

پیش آئے۔ لیکن بعض جوشیلے علمائے نے مخالفت بھی کی اور جوشِ تعصّب میں مولانا سید سرور شاہ صاحب کو قتل کرنے کی دھمکی دی۔[۱]

دیوبند میں ایک احمدی میاں فقیر محمد صاحب رہتے تھے، اُن سے بھی ملاقات ہُوئی۔ دیوبند کی عظیم اسلامی درسگاہ دیکھنے کے بعد آپ اپنے ساتھیوں سمیت سہارنپور تشریف لے گئے اور وہاں کا مشہور مدرسہ مظاہر العلوم دیکھا۔ مولوی عنایت علی صاحب مہتمم مدرسہ جو ایک خوش اخلاق بزرگ تھے، آخر تک ساتھ رہے۔ اتفاق سے سہارنپور میں حافظ عبدالمجید صاحب منصوری آئے ہوئے تھے انہوں نے پورے وفد کو پُرتکلف چائے کی دعوت دی۔

سہارنپور سے ۲۸ر اپریل کی شام کو ہردوار پسنجر سے آپ روانہ ہُوئے اور اگلے دن ظہر سے قبل کامیاب و کامران قادیان پہنچ گئے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ نہایت تپاک سے ملے۔ بڑی خوشی کا اظہار فرمایا اور اگلی رات پُورے وفد کے اعزاز میں ضیافت کا اہتمام فرمایا۔[۲]

آپ کے سفروں کا جو حال اب تک بیان ہُوا وہ دیکھنے والوں یا ہمسفروں کے الفاظ میں تھا۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کہ دیکھنے والا خواہ کیسا ہی صاحبِ بصیرت کیوں نہ ہو وہ دُوسرے کے دل میں اُتر کر اس کے باریک در باریک جذبات اور اُن کی کُنہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ یقیناً ایک مُبصر کے بس کی بات نہیں کہ ذہنوں کے اندرونی گوشوں تک نفوذ کر کے افکار کی مَوجوں کا نظارہ کرسکے۔ ان کیفیات کو تو وہی بیان کرسکتا ہے جس کے دل پر گزر رہی ہو۔ یہ ایک طبعی امر ہے کہ سیر و تفریح کے وقت بدلتے ہُوئے مناظر اور اوقات اور نئے نئے مشاہدات ایک سیّاح کے قلب و نظر پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ ایک شاعر کا دل ان محرکات سے ایک رنگ میں متاثر ہوتا ہے تو ایک فلسفی کا ایک دُوسرے رنگ میں۔ ایک بادشاہ کے خیالات کا دھارا ایک طرف مُڑتا ہے تو ایک فقیر کے خیالات کا دھارا ایک دُوسری طرف۔

آئیے ہم دیکھیں کہ سیر و سیاحت نے حضرت صاحبزادہ صاحب کے قلب و ذہن میں کس قسم کے احساسات اور افکار کو موجزن کیا ــــ ؟

○

[۱-۲] ”الحکم“ ۱۴ مئی ۱۹۱۲ء

میرا سفر

محمود کی کہانی۔ محمود کی زبانی

خدا تعالیٰ نے انسان پر حُجت قائم کرنے کے لئے ذرّہ ذرّہ میں ایک خاص شان رکھی ہے۔ ایک ایک نکتہ خدا تعالیٰ کی ہستی پر دلالت کر رہا ہے اور ایک ایک شعشہ اس کی قدرت کا مظہر ہے۔ سُورج روشن ہے اور اس کی روشنی سے ایک نہیں، دو نہیں، لاکھوں فائدے دُنیا کو پہنچ رہے ہیں۔ اور پھر ان فائدوں سے ایک دو آدمی ہی متمتع نہیں ہوتے بلکہ بے شمار مخلوقات فائدہ اُٹھا رہی ہے۔ اگر انسان ایک بڑے مکان میں بیٹھا ہوا اس کے فوائد سے حصہ لے رہا ہے تو جانور اپنے گھونسلے میں اس سے کچھ کم نہیں لیتا۔ اور چھچھوندر جو سُورج کے آگے اپنی آنکھیں نہیں کر سکتی اور روشنی کو دیکھ ہی نہیں سکتی۔ وہ گو کہ ظاہر میں اس سے دُور ہے لیکن چشمِ بصیرت رکھنے والے انسان جانتے ہیں کہ اس اندھیرے میں بھی سُورج کی روشنی اور تپش اُسے فائدہ پہنچا رہی ہے اور اس کی زندگی پر ایک بہت بڑا اثر کر رہی ہے۔ غرض یہ تو ایک موٹی مثال ہے جس سے ایک انسان نصیحت حاصل کر سکتا ہے۔ ورنہ جیسا کہ میں اُوپر بیان کر چکا ہوں، ذرّہ ذرّہ میں خاص حکمتیں مخفی ہیں جو کہ انسان کو خدا کی طرف رہنمائی کر رہی ہیں۔ اس لئے قرآن شریف میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ "قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ[1]" کیونکہ انسان جس طرف پھرے گا اور مختلف ممالک کی سَیر کرے گا اور مختلف اشیاء پر غور کرے گا، اُسی قدر اُسے معرفت اور نیکی کی توفیق ملے گی۔۔۔۔ اس لئے حکم ہوا ہے کہ اپنے کھانے سے، اپنے پینے سے، اپنے چلنے پھرنے سے غرض ہر ایک بات سے نصیحت حاصل کرو تاکہ نفس کے خفیہ حملوں سے محفوظ رہو۔ اور یہ بات صرف کہنے کی ہی نہیں، بلکہ اس میں خود میرا ذاتی تجربہ ہے اور میں نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے اور خدا کے فضل سے ہر روز فائدہ اُٹھاتا ہوں۔

ابھی پچھلے دِنوں میں مجھے ایک سفر کرنا پڑا ہے جس سے مجھے اس قدر فائدہ پہنچا ہے

[1] الانعام: ۱۲

کہ مَیں بیان نہیں کرسکتا۔ بعض ایسی چیزیں میرے سامنے آئیں کہ ان میں مَیں نے خود خُدا کو دیکھا بعض ایسے وجود میں نے دیکھے ہیں کہ وہ خود خدا کا ثبوت تھے اور خدا کی ہستی کو ثابت کر رہے تھے۔ غرض کہ بے شمار فوائد تھے کہ اگر ایک ایک کو لکھنے بیٹھوں تو شاید دفتروں کے دفتر لکھنے پڑیں لیکن باوجود اس کے کہ میں چاہتا ہوں کہ میں اپنے سفر کا ایک مختصر حال لکھوں۔ شاید کوئی سعید روح اس سے فائدہ اٹھائے اور میں بھی ثواب کا مستحق ٹھہروں اتفاق کی بات ہے کہ بعض دنوں میں تو کئی کئی مہینے تک باہر نکلنا مشکل ہوجاتا ہے۔ اور بعض دنوں میں خدا کی قدرت ایسے سامان مہیا کرتی ہے کہ مجبوراً مختلف جگہوں میں یکے بعد دیگرے پھرنا پڑتا ہے۔

لاہور میں بارہ وفات کا جلسہ تھا۔ مکرمی خواجہ کمال الدین صاحب نے مجھے اس موقع پر آنے کے لئے فرمایا اور حضرت خلیفۃ المسیح سے بھی اجازت طلب کی۔ اور آپ کی اجازت پر میرا ارادہ ہوا کہ دو یا تین اپریل کو یہاں سے روانہ لاہور ہوں گا۔ اتنے میں والدہ ماجدہ کا ارادہ دہلی جانے کا ہوا اور دہلی سے میر قاسم علی صاحب نے خط لکھا کہ میں بھی وہاں جاؤں۔ اور یہ بات اس کی محرک ہُوئی کہ میں دو یا تین کو یہاں سے چلنے کی بجائے غالباً ۲۸ تاریخ کو یہاں سے روانہ ہُوا۔ چونکہ والدہ صاحبہ حضرت اُمّ المومنینؓ نے کپورتھلہ میں ٹھہرنا تھا اس لئے میں بھی سیدھا کپورتھلہ ساتھ گیا اور وہاں سے پھر لاہور آنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ اسی دن شام کو چار بجے کے قریب ہم کپورتھلہ پہنچے۔ یہ وہ جگہ ہے کہ جہاں حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کا بھی کچھ مدت قیام رہا ہے خدا تعالیٰ کی قدرت ہے کہ خاص خاص جگہوں میں خاص خاص خصوصیتیں ہوتی ہیں۔ کپورتھلہ کی مٹی میں خدا تعالیٰ نے وہ اثر رکھا ہے کہ یہاں جس قدر لوگ سلسلہ احمدیہ میں داخل ہوئے ہیں کسی دلیل، کسی معجزہ، کسی نشان کی وجہ سے نہیں ہوئے اور نہ انہیں کسی کشف و کرامت کی ضرورت ہے کہ اُن کے ایمان کو قائم رکھے۔ بڑے سے بڑا ابتلا ہو اور کیسا ہی سخت امتحان ہو۔ ان لوگوں پر خدا کا کچھ ایسا فضل ہے کہ ان کا پائے ثبات ذرا بھی لغزش نہیں کھاتا اور اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ انہوں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی معجزانہ زندگی کو دیکھ کر آپ کی بیعت ہی نہیں کی بلکہ عشق پیدا کیا ہے اور یہاں تک ترقی کی ہے کہ "لیلیٰ را بچشم مجنوں باید دید" کا معاملہ ہوگیا ہے۔ ان لوگوں نے خُدا کے

مُرسل کی زندگی کو دیکھ لیا ہے کہ وہ کیسی پاک اور صاف تھی اور مشاہدہ کر لیا ہے کہ وہ گناہوں سے کیسا پاک تھا۔۔ چنانچہ اُن کا یہی اخلاص اور محبّت ہی حضرت صاحب کو وہاں کھینچ کر لے گیا۔ اور یہی ہمیں بھی وہاں لے گیا ہے۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جس شخص سے ہمیں محبت ہے۔ اس کے متعلقین سے بھی قدرتاً محبت ہوتی ہے۔ اس لئے سچی دوستی کی نشانی یہی سمجھی گئی ہے کہ ایک دوست دوسرے دوست کے مال و جان اور عزیز و اقارب کا اُسی طرح محافظ ہو اور چاہنے والا ہو جیسے کہ وہ اپنے مال و جان کی حفاظت کرتا اور اپنے عزیز و اقارب کو چاہتا ہے۔ پس وہ شخص جس کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر یہ اقرار کیا ہو کہ ہم تجھ سے تمام دنیا کے رشتوں اور دوستیوں سے بڑھ کر سلوک کریں گے، اس کی ہر ایک چیز کیوں پیاری نہ ہو۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اس جماعت کو ہم سے ایک خاص محبّت اور اخلاص ہے بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ محض اخلاص ہی اخلاص ہے اور نفسانی خواہشیں ان میں بالکل نہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ حضرت صاحب نے ان کو ایک موقع پر لکھا۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ لوگ قیامت کو بھی میرے ساتھ ہوں گے کیونکہ دنیا میں بھی آپ نے میرا ساتھ دیا ہے۔

اس جگہ میں نے کامل ایمان کے کئی نمونے دیکھے اور سُنے۔ لیکن ایک بات نے تو مجھ پر وہ اثر کیا کہ میری رُوح کو قولِ بلٰی یاد آ گیا اور اگرچہ اس کا لکھنا شاید عام لوگوں کے لئے مفید ثابت نہ ہو لیکن بعض با مذاق لوگوں کے لئے جن کو خاص ذوقی بات عام دلائل سے زیادہ فائدہ مند ہوتی ہے، شاید مفید ثابت ہو۔ منشی محمد اروڑا صاحب جو حضرت صاحب کے نہایت پرانے مریدین میں سے ہیں اور حضرت اقدس سے خاص محبّت جو شاید دوسری جگہ بہت کم ملے، رکھتے ہیں۔ انہوں نے سُنایا کہ ایک دفعہ حضرت اقدس نے مجھ سے پُوچھا کہ سب لوگ دُعا کے لئے کہتے ہیں اور آپ بالکل نہیں کہتے اس کی کیا وجہ ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ مجھے کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ مَیں آپ خدا تعالیٰ سے مانگ لیتا ہوں اور اس وقت آپ پر اس کے جو احسانات اور کرم ہیں اُن کو زیرِ نظر رکھ لیتا ہوں اور وہ کام خُود بخود ہو جاتا ہے۔ مجھے اس سے ایک تو اُن کے ایمان پر خیال گیا کہ کیا ایمان ہے! اور خُدا تعالیٰ کے رحموں پر کس قدر بھروسہ ہے! اور دوسرے حضرت اقدس کی سچائی پر کیا ایمان ہے! اور دُوسری طرف میرا خیال

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف گیا۔ چونکہ وہ ایک عظیم الشان نبی تھے۔ اس لئے اُنہوں نے بھی ایمان کا اس قسم کا ایک نمونہ دکھایا ہے جو کہ ان کی طہارتِ نفس کی وجہ سے بہت ارفع ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت جبرائیل آپ کے پاس آئے اور کہا کہ کچھ خواہش ہو تو فرمایئے۔ آپ نے نہایت بے توجہی سے جواب دیا کہ کچھ نہیں میری تم سے کچھ غرض نہیں۔ انہوں نے دوبارہ کہا کہ خدا تعالیٰ سے کچھ پیغام ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ مجھے کوئی واسطہ پسند نہیں۔ انہوں نے سہ بارہ کہا کہ اچھا تو دُعا کیجئے آپ نے جواب دیا کہ وہ آپ نہیں دیکھتا جو میں اُسے سناؤں کہ میرا کیا حال ہے؟ سُبحان اللہ! کیسا ایمان ہے اور کیسا غنیٰ ہے! اسی کا نتیجہ ہے کہ قرآن شریف میں جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کچھ ذکر آئے' وہیں قرآن شریف کی عبارت محبت سے بھری ہوئی معلوم ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ محب اپنے محبوب کا ذکر کر رہا ہے خیر بات لمبی ہوتی ہے۔ اس لئے میں اور زیادہ واقعات نہیں لکھتا۔ کیونکہ اور بہت کچھ سُنانا ہے۔

یہاں کی بعض قابلِ دید عمارات بھی دیکھیں اور ایک چھوٹی سی ندی جو نظارۂ قدرت کو عجب طرح خوبصورت کر کے دکھاتی ہے' وہ بھی دیکھی۔ یہاں کے راجہ صاحب کو سیر وسیاحت کا بہت شوق ہے اور وہ جس مُلک میں جاتے ہیں' وہاں کی کچھ چیزیں لا کر اپنے ہاں رکھتے ہیں۔ اگر وہ اس سے ایک ناصح کا کام لیویں تو میرے خیال میں کئی واعظ وہ کام نہیں کر سکتے جو وہ بے جان چیزیں کر سکتی ہیں۔ یہاں بعض غیر احمدی صاحبان بھی ملاقات کو آئے جن میں سے ایک صاحب اہلِ ہنود میں سے تھے۔ جو وہاں مختاری کا کام کرتے ہیں۔ اور انہوں نے لیکچر کے لئے کہا لیکن چونکہ میں نے دوسرے ہی دن لاہور جانا تھا اس لئے زیادہ ٹھہرنا مشکل تھا۔ دوسرے دِن میں لاہور کی طرف روانہ ہُوا اور والدہ صاحبہ دہلی کی طرف۔ دو (۲) تاریخ کو میں لاہور پہنچا اور برادرم مکرم سید محمد حسین شاہ صاحب کے مکان پر ٹھہرا۔ تیسرے دن یعنی چار (۴) تاریخ کو لیکچر شروع ہُوئے۔ لاہور کے بہت سے معززین جلسہ میں آئے تھے جس سے معلوم ہُوا کہ خدا تعالیٰ اندر ہی اندر لوگوں کے دِلوں کو اس طرف پھیر رہا ہے ورنہ ایک دن وہ تھا کہ خود حضرت اقدس کی تحریر سے لوگ بھاگتے تھے اور آج آپ کے خدام کی باتوں کو غور سے سُنتے ہیں۔ یہی وہ لاہور ہے

کہ جہاں آپ کی وفات کے وقت دشمنوں نے وہ شور مچایا کہ الاماں !... ہم وہی ہیں جو پہلے تھے لیکن خدا کا زبردست ہاتھ دُنیا کو اپنے سلسلہ کی طرف کھینچ رہا ہے۔ وُہی لوگ ہیں، وہی تعلیم ہے، وہی خیالات ہیں، وہی عمل ہیں۔ ہاں اگر فرق ہے تو یہ کہ وہ محسود وجود نہیں رہا۔ اے اندھی دُنیا! تو خدا کے برگزیدہ کا مقابلہ کرکے اور اُن سے حسد کرکے کیوں ہلاکت کے گڑھے میں پڑتی ہے۔ تجھ پر افسوس اور سخت ہی افسوس! خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ شہر کے بہت سے رؤسا اس موقع پر آئے تھے اور اُن میں سے بعض اس سلسلہ کے سخت معاندین میں سے تھے لیکن عام طور پر سب پر اثر نیک ہُوا اور سب نے معلوم کر لیا کہ اگر اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت کرنے والا کوئی گروہ ہے تو وہ یہی فرقہ ہے۔ اس دن کی کارروائی نہایت عمدگی سے ختم ہوئی۔ دوسرے دن بھی اچھی رونق تھی۔ میرا لیکچر بارہ وفات پر تھا۔ جو کہ انشاء اللہ تعالیٰ رسالہ تشحیذ الاذہان میں چھپ کر شائع ہو جائے گا۔ اس دن بھی لوگوں پر بہت نیک اثر ہوا اور اُن کے دلوں سے وہ وحشت جو ہم سے رکھتے تھے کچھ دُور ہوئی۔

جلسہ ختم ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد میں دہلی کو روانہ ہُوا۔ اور صبح آٹھ بجے کے قریب وہاں پہنچ گیا۔ یہی وہ شہر ہے کہ جس سے حضرت اقدس کی مخالفت نے اوّل ہی اوّل خطرناک صورت اختیار کی اور جہاں کے مشہور مولوی نذیر حسین کے فتویٰ نے مسلمانوں میں مخالفت کا ایک عام جوش بھڑکا دیا۔ مگر باوجود اس کے حضرت اقدس کو اس شہر سے ایک خاص اُنس رہا ہے۔ آپ بارہا فرمایا کرتے تھے کہ میں امید کرتا ہوں کہ دہلی کے وفات یافتہ بزرگوں کی رُوحیں ایک دن ضرور جوش میں آئیں گی اور اُن کی تڑپ سے یہ لوگ ہدایت پائیں گے۔ آپ فرماتے تھے کہ وہ شہر جہاں اس قدر اولیاء اور بزرگ دفن ہیں، کہ جن کی تعداد زندوں سے بڑھ گئی ہے، کیا اس کے باشندوں کو خدا ہدایت کے بغیر چھوڑ دے گا؟ غرض ایسے شہر میں آنا میرے لئے ایک عجیب بات تھی اور کئی کیفیتیں پیدا ہو رہی تھیں۔ میں اس شہر میں جاتا ہوں جس کے لوگوں نے سب شہروں سے زیادہ حضرت اقدس کا مقابلہ کیا۔ جس میں سوائے ایک دو آدمیوں کے کسی نے آپ کی سچائی کو قبول نہ کیا۔ جس کے باشندوں نے آپ کے قتل کرنے کی ٹھانی۔ جنہوں نے آپ کو کافر قرار دینے

میں سب سے زیادہ پیش قدمی کی اور پھر باوجود اس کے جس شہر سے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو محبت تھی۔ جس کی نسبت میں آپ کا فیصلہ ایک مدت پہلے سے آپ کی زبان سے سُن چکا تھا۔ میرے سامنے ایک طرف تو قبروں کا سلسلہ تھا کہ جس میں بڑے بڑے اولیاءؒ مدفون تھے اور بڑے بڑے اقطاب، غوث امن کی نیند سو رہے تھے اور دوسری طرف وہ لوگ نظر آتے تھے کہ جن کو خدا اور رسول سے کچھ تعلق ہی نہیں۔ اور جو ہر وقت دُنیا کے دھندوں میں پھنسے ہوئے دُکھ اور تکلیفیں اُٹھا رہے ہیں۔ ایک طرف تو مجھے وہ لوگ نظر آتے تھے جو قبروں میں ہوشیار اور مرنے کے بعد زندہ ہیں۔ اور ایک طرف وہ لوگ جو باوجود آنکھیں کھلی ہونے کے بے ہوش اور باوجود زندہ ہونے کے مُردہ تھے۔ ایک طرف تو وہ گروہ تھا جنھوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنے آپ کو مارا مگر اور دُنیا کو زندہ کر دیا۔ مگر دوسری طرف وہ جماعت تھی کہ جنھوں نے باوجود مُردہ ہونے کے اپنے آپ کو زندہ سمجھا اور اپنے فائدہ کی خاطر اَور لوگوں کو بھی ہلاک کیا۔ غرض کہ دہلی کا ایک ایک آدمی اور ایک ایک مکان اور ایک ایک گلی اور ایک ایک مقبرہ اور ایک ایک خانقاہ اور ایک ایک مسجد الگ شانِ خدا نمائی رکھتی تھی جو میرے دِل پر اثر کئے بغیر نہیں رہتی تھی۔

غرض بہت سی مختلف کیفیتیں میرے دِل میں پیدا ہوئیں۔ میرے وہاں پہنچنے پر معلوم ہُوا کہ میر قاسم علی صاحب نے جو ایک پُرجوش اور مخلص احمدی ہیں، دہلی میں میرا کوئی لیکچر کروانے کی بھی تجویز کی ہوئی ہے۔ چونکہ میں نے وہاں صرف ایک دو دن ہی ٹھہرنا تھا اس لئے ہفتہ کی رات کو لیکچر قرار دیا۔ اور مضمون "اسلام اور آریہ مذہب" قرار پایا۔ جمعرات کو ہم سب لوگ نظام الدین اولیاءؒ، ہمایوں بادشاہ، منصور اور خواجہ قطب الدین صاحب کے مقابر دیکھنے کے لئے روانہ ہوئے۔ سب سے پہلے تو وہ قلعہ دیکھا جہاں لودھی خاندان کے بادشاہ رہا کرتے تھے اور جہاں ہمایوں بادشاہ نے بھی اپنی جائے رہائش بنائی تھی۔ یہ قلعہ بجائے خود ایک عبرت کا مقام ہے بلکہ نہایت ہی عبرت کا مقام ہے کیونکہ یا تو کسی وقت اس کی وہ شان و شوکت تھی کہ ہندوستان کے عظیم الشان بادشاہ اس میں رہتے تھے اور یہ اُن کا عشرت کدہ تھا۔ لیکن آج یہ حالت ہے کہ وہ فصیل جو سخت خطرناک اور طاقتور دشمنوں کی روک تھام کے لئے بنائی گئی تھی اب نہایت شکستہ حالت میں ہے۔ پتھر گرے ہوئے ہیں

کہیں سے تو بہت ہی گری ہوئی ہے اور کہیں ذرا اچھی حالت میں ہے لیکن پھر بھی اتنا ضرور ہے کہ دیوار کی چوڑائی نصف سے بھی کم رہ گئی ہے کیونکہ بہت کثرت کے ساتھ پتھر گر گئے ہیں۔ خیر یہ تو باہر کی حالت ہوئی۔ اندر کا نظارہ اس سے بھی زیادہ عبرتناک ہے یعنی وہ قلعہ جہاں وہ لوگ رہتے تھے کہ جن کے آگے بڑے بڑے بادشاہوں کے سر جھکتے تھے اس میں اب گوجر لوگ رہتے ہیں۔ کوئی زمانہ ایسا ہوگا کہ اس قلعہ کی صفائی کا ایسا خیال رکھا جاتا ہوگا کہ ایک تنکا تک نظر نہ آتا ہوگا مگر آج تو یہ حالت ہے کہ جا بجا گوبر کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں اور جگہ جگہ پر مویشی بندھے ہوئے ہیں۔ سوائے چند تاریخی عمارات کے سب عمارتیں مسمار ہیں اور ان کے ملبہ سے اُن گوجروں نے اپنے رہائشی مکان بنائے ہیں۔ سبحان اللہ! وہی ملبہ جس کے اٹھانے کیلئے انہی لوگوں کے باپ دادا ہزار کوششیں کرتے ہوں گے اور شاہی مزدوروں میں داخل ہونا چاہتے ہوں گے۔ آج یہ لوگ اسکے مالک بن رہے ہیں اور وہ جگہ جس میں داخل ہونے کیلئے بڑے بڑے راجوں مہاراجوں کو مہینوں وزیروں امیروں کی منت سماجت کرنی پڑتی ہوگی آج اس جگہ پر گویا ان گوجروں کا قبضہ ہے۔ اس قلعہ میں ایک عالیشان مسجد بھی ہے جسکے صحن میں ایک حوض بنا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اس قلعہ میں وہ برج بھی ہے جس پر سے ہمایوں بادشاہ گرا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا گول برج ہے جو ستاروں کی گردش دیکھنے کیلئے بنایا گیا تھا۔ یہ بھی سنگِ سرخ کا ہے۔ پتھر ہی کا زینہ ہے اور جس زینہ سے ہمایوں کا پاؤں پھسلا تھا وہاں سے سیڑھی کاٹ کر نشان بنایا ہوا ہے جو کہ ایسا خطرناک ہے کہ مجھے خوف ہے کہ کسی وقت کسی ناواقف سیاح کے ساتھ وہاں ہمایوں سا ہی واقعہ پیش نہ آئے۔ خیر ان چیزوں کو دیکھتے ہوئے اور خدا کی قدرت پر تعجب کرتے ہوئے ہم آگے روانہ ہوئے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ہمایوں بادشاہ کا مقبرہ تھا جو نہایت خوبصورت بنا ہوا ہے اور پرانے بادشاہوں کی شان و شوکت پر دلیل ہے۔ اس کو دیکھا اور آگے چلے۔

اب جس چیز کے دیکھنے کا ارادہ تھا، یہ کوئی دنیادی بادشاہ کا مقبرہ نہ تھا اور نہ ہی کوئی شاہی عمارت تھی، نہ کوئی پرانا قلعہ تھا بلکہ یہ ایک نہایت برگزیدہ انسان کا مزار تھا جس نے اپنے زہد، اپنے تقویٰ، اپنی پرہیزگاری اور اپنے اخلاص اور محبتِ الٰہی کی وجہ سے محبوبِ الٰہی کا لقب حاصل کیا تھا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ آپ فوت ہو گئے لیکن اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ آپ لاکھوں نہیں کروڑوں زندوں سے بڑھ کے زندہ ہیں۔ آپ نے قربِ

الٰہی سے وہ درجہ حاصل کیا کہ خدا نے آپ کے لئے موت حرام کر دی۔ میرا مطلب ان بزرگ سے حضرت نظام الدین اولیاءؒ ہیں۔ والد صاحب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو بھی آپ سے ایک خاص اُنس تھا بلکہ آپ اُن کے حجرہ میں بھی تشریف لے گئے تھے اور وہاں دُعا بھی مانگی تھی۔ غرض آپ کے مقبرے کی سیر کرتے ہوئے دل میں بار بار جوش آتا تھا کہ ایک تو وہ بادشاہ ہے کہ جس کے آگے شاہانِ زماں کے سر جھکتے تھے اور اُن کی قبر گو کیسی عالی شان عمارت کے نیچے ہے، مگر ویران۔ اور ایک یہ فقیر ولی اللہ ہیں کہ گو بادشاہ ہمایوں سے بھی پہلے گزرے ہیں لیکن اب تک ان کے مقبرہ پر وہ رونق ہے کہ ایک گاؤں کا گاؤں بسا ہوا ہے۔ خواہ کم فہم لوگ آپ کی قبر کی زیارت کو کسی غرض کے لئے ہی آئیں لیکن وہ جو دعائیں مانگ جاتے ہیں اس کا ثواب تو بہر حال آپ کو ملتا ہی رہتا ہوگا۔ اس جگہ مشہور شاعر خسرو کے مزار کو بھی دیکھا۔ یہ بھی حضرت نظام الدین صاحب کے خلفاء میں سے تھے

ایک اور چیز جو یہاں عجیب دیکھی، وہ دنیا طلبی کا ایک نقشہ تھا۔ یعنی یہاں ایک باؤلی ہے جس کے ایک طرف ایک دیوار چلی جاتی ہے جو قریباً پچاس فٹ اونچی ہوگی اتنی بڑی اونچائی پر سے چند لڑکے کچھ پیسے لے کر کودتے ہیں اور اُن کا یہی پیشہ ہے انسان کے لئے یہ تدبر کا مقام ہے کہ دو چار پیسوں کے لئے ایک لڑکا پچاس فٹ اونچا جاتا ہے اور پھر زور سے پانی میں کود پڑتا ہے اور پھر اپنے آپ کو بچانے کے لئے تیر کر باہر آتا ہے۔ اور یہ سب کچھ کس لئے؟ چند پیسوں کے لئے تو پھر وہ ہزاروں ہزار احسانات جو خدا انسان پر کرتا ہے اور وہ بے شمار انعامات جن کا وعدہ کرتا ہے اُن کے بدلہ میں غافل ایک پتا تک نہیں توڑنا چاہتا۔ افسوس! افسوس!! دُنیا کی کچھ ایسی حالت ہو رہی ہے کہ یُوں تو ایک کام کو لوگ تفریحاً روز کرتے رہیں گے لیکن اگر خدا کی طرف سے حکم آجاوے کہ یُوں ضرور کیا کرو تو بہت سے آدمی فوراً اس کام کو چھوڑ دیں اور سو بہانہ بنانے کیلئے تیار ہو جاویں۔ خیر اس کی سیر کر کے ہم آگے روانہ ہوئے اور منصُور کے مقبرہ کی سیر کی۔ یہ مقبرہ نواب منصُور علی خان صفدر جنگ کا ہے۔ ایک تو وہ زمانہ تھا کہ مسلمان ہر بات میں کمال رکھتے تھے مگر آج وہ زمانہ ہے کہ جس بات میں دیکھو زوال ہی زوال ہے۔ نہ علُوم و فنُون کا شوق ہے نہ صنعت و حرفت کا، نہ انجنیئری میں دخل ہے نہ زراعت و باغبانی سے واقفیت۔ ہر بات میں اپنے ہمعصروں سے پیچھے ہی چلے جاتے ہیں اور یہ سب اسکا نتیجہ ہے کہ خدا کو چھوڑ بیٹھے ہیں جس کی وجہ سے خُدا انہیں چھوڑ

بیٹھا ہے ورنہ اس قدر جلدی اُس حالت سے اِس حالت تک پہنچنے سے کیا مطلب؟ افسوس کہ اب بھی اس موقعہ کو ہاتھ سے دے رہے ہیں اور وقت سے کچھ فائدہ نہیں اٹھاتے۔ قصّہ کوتاہ ہم اس جگہ سے چل کر آگے چلے۔ اب جو جگہ دیکھنے کے قابل آئی تھی وہ قطب مینار ہے جس کے راستہ میں حضرت صاحب کو پچھلی دفعہ نہایت مبارک اور مبشّر الہام ہُوا یعنی

"دستِ تو دُعائے تو ترحّم از خدا"

راستے میں سڑک کے کنارہ پر دو مقبرے ہیں۔ جن کا نام بیوی باندی کا مقبرہ مشہور ہے۔ جو باندی کا ہے وہ تو بڑا ہے اور جو بیوی کا ہے وہ بہت چھوٹا سا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ایک لونڈی تھی جو بیوی کو بہت پیاری تھی تو میاں نے بیوی کے لحاظ سے اس کا مقبرہ خوب اچھی طرح بنوایا لیکن جب وہ بیوی مری تو اس کا مقبرہ بہت چھوٹا سا بنوا دیا کیونکہ اس سے کچھ محبت نہ تھی بلکہ کسی قسم کا لحاظ تھا جب لحاظ نہ رہا تو کسی کے دِکھاوے کی کیا ضرورت رہی۔ یہ واقعہ بھی بڑی عبرت کے قابل ہے۔

والد صاحب حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرمایا کرتے تھے کہ جب آپ کے والد فوت ہوئے تو آپ کے بڑے بھائی کے رُعب سے بہت لوگ ان کی وفات پر اظہارِ افسوس کرنے آئے۔ لیکن جب وہ خود فوت ہُوئے تو چونکہ حضرت صاحب کا دُنیا داری سے کچھ تعلق نہ تھا اور لوگ آپ کا اس قسم کا رُعب نہ مانتے تھے۔ کوئی پُوچھنے تک بھی نہیں آیا کہ کیا حال ہے۔ اور یہ واقعات ہمارے سامنے روز ہوتے ہیں، کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ ہم روزمرّہ دیکھتے ہیں کہ ایک معزز شخص کی زندگی میں تو اگر اُن کے نوکر کو بھی پھوڑا پھنسی نکل آوے تو بڑے بڑے معززین دوستی اور محبّت جتلانے کے لئے فوراً آحاضر ہوتے ہیں کہ سُنا ہے کہ آپ کے نوکر کو یہ تکلیف ہو گئی ہے، ہمیں سُن کر بہت صدمہ ہُوا بڑا وفادار نوکر ہے۔ اور اسی قسم کی سو سو باتیں بناتے ہیں لیکن اگر اس کا مالک اُٹھ جاوے تو اگر اس کا اکلوتا بیٹا بھی دُکھ اور مصیبت میں ہو۔ اور تکلیفوں نے اس کی کمر بھی توڑ دی ہو تب بھی کچھ توجہ نہیں ہوتی یا تو محبّت کے دعوے ہوتے ہیں یا ایک ذرا سی مدت میں بات نفرت اور حقارت تک پہنچ جاتی ہے مگر یہ اُن ہی لوگوں کی بات ہے کہ جن کے دِل نُورِ ایمان سے خالی ہوتے ہیں اور دُنیا طلبی اُن کے خمیر میں ہوتی ہے جن کو اس شخص سے محبّت نہیں ہوتی بلکہ اس کے جاہ و جلال سے ہوتی ہے ورنہ مجنوں کو تو سگِ لیلیٰ تک سے بھی

پیار تھا... غرض کہ نیک لوگوں کی محبت نہایت بے غرضانہ ہوتی ہے۔ ہاں جن لوگوں کے دِلوں میں کھوٹ ہو اُن کی محبت بھی نفرت سے بھری ہوتی ہے۔ اتنا فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ ہر ایک شخص اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے کہ اصل تعلق اور پیار خدا سے پیدا کرے کیونکہ اس پر تو فنا نہیں نہ اس کی عظمت و شان جاتی رہے گی... الغرض ہم قطب مینار پر پہنچے۔ یہ دُنیا کی بے نظیر عمارتوں میں سے ہے اس سے اُونچی اَور کوئی عمارت نہیں۔ اس کے سات کھنڈ ہیں... اس مینار کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس قدر اونچا مینار کس طرح بنایا گیا یورپین سیاح بھی دیکھ کر سخت حیران ہوتے ہیں۔ ہمارا تو بے اختیار سبحان اللہ کہنے کو دِل چاہتا ہے کہ وہ عرب کا رہنے والا انسان جس کی نسبت حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا فرماتی ہیں کہ اسے بعض اوقات فاقہ تک گزر جاتا تھا' ایسا پاک اور خدا رسیدہ انسان تھا۔ اس کے وجود میں خدا نے ایسی برکتیں پوشیدہ رکھی تھیں کہ خدا نے اُسے گمنامی سے نکال کر ایک ایسے اونچے مقام پر کھڑا کیا کہ اس کے غلاموں نے آپؐ کے نام کو ہندوستان جیسے بُت پرست ملک میں آکر پھیلایا' جن کے وجود سے ہندوستان میں ہزاروں مساجد تیار ہوئیں۔ چنانچہ یہ مینار ایسی ہی یادگار ہے....

جُمعہ کے دن ہفتہ کی رات کو ینگشن کے کمرہ میں میرا لیکچر تھا۔ وقت پر وہاں پہنچے تو کوئی چھ سات سو آدمی وہاں موجود تھا بعض روسلے تے دہلی بھی آئے تھے۔ لیکچر انشاء اللہ تشحیذ الاذہان میں چھپ جاوے گا۔ میں نے جس طرح خدا تعالےٰ نے سمجھایا وہاں بیان کیا کہ مذہب کیا ہے اور یہ کہ مذہب کی نشانی یہ ہے کہ وہ انسان کو خدا تک پہنچائے اور اس سے تعلق پیدا کروائے اور بنی نوع انسان میں نیکی اور امن قائم کرے اور چونکہ قرآن شریف ہمیں خدا تک پہنچاتا ہے' لیکن برخلاف اس کے آریہ مذہب کے اصول ہمیں خدا تعالیٰ سے متنفر کرتے ہیں اس لئے اسلام تو سچا مذہب ہے اور آریہ سچا مذہب نہیں۔ مثلاً اسلام خدا تعالیٰ کی صفات کے متعلق نہایت پاک تعلیم دیتا ہے لیکن آریہ مذہب خدا کو خالقیت سے جواب دے کر تناسخ کا قائل ہو کر ابدی نجات کا انکار کر کے توبہ کو لغو قرار دے کے ہمیں خدا تعالیٰ سے متنفر کر دیتا ہے۔ جس سے اس کی لغویت ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح اسلام اور آریہ مذہب کی تعلیم کا مقابلہ کر کے دِکھلایا گیا کہ اسلام تو دُنیا میں امن قائم کرتا ہے لیکن آریہ مذہب فساد ڈلواتا ہے... چونکہ

حضرت خلیفۃ المسیح کا حکم تھا۔ اس لئے ہفتہ کو قصور کی طرف روانہ ہوا۔ جہاں کے احمدیوں نے ایک جلسہ کیا تھا۔ ۱۲ر تاریخ کی شام کو جلسہ تھا، صبح کو وہاں پہنچا۔ تھوڑی دیر تک لاہور اور فیروزپور کی جماعتوں سے بہت سے احمدی آدمی اور بھی وہاں آئے.... میرا مضمون یہاں تقویٰ پر تھا... میں شام کو پھر روانہ دہلی ہوا۔ وہاں دوبارہ میرے لیکچر کی تجویز ہوئی اور اب کے میرا لیکچر اسلام اور عیسائیت پر تھا۔ اس کا بھی لوگوں پر اچھا اثر ہوا۔ دہلی کی پبلک اس بات پر بہت حیران تھی کہ یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ہماری طرح ہی عزت کرتے ہیں.... اتوار کی شام کو ہم وہاں سے روانہ ہوئے۔ ...میں دُعا کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ اس دردِ دل کا اثر تم پر بھی کرے، جس سے میں نے یہ مضمون لکھا ہے۔ کاش کہ تم لوگ واقف ہو کہ میں تمہاری خیر خواہی کے لئے کیا درد محسوس کرتا ہوں۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے، سچے جوش اور خیر خواہی سے لکھا ہے ورنہ میں تو ان لوگوں میں سے ہوں جو پکار پکار کر کہتے ہیں کہ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ۔

والسلام

خاکسار مرزا محمود احمد عفی اللہ عنہٗ"[1]

حج بیت اللہ اور سفرِ مصر

حضرت صاحبزادہ صاحب نے اپنی زندگی میں سینکڑوں سفر کئے، لیکن بلاشبہ ان میں سب سے زیادہ اہمیت اور رُوحانی عظمت کا حامل وہ سفر تھا جو آپ نے حج بیت اللہ کی غرض سے اختیار فرمایا اور جس سفر میں آپ کو ابلاغِ حق کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ اس سفر کی روئداد زیادہ سے زیادہ آپ کے اپنے الفاظ میں ہی پیش کی جائے۔ البتہ آغازِ سفر سے متعلق احبابِ قادیان کے جو جذبات تھے، اُن کی ترجمانی کی خاطر یہ مناسب سمجھا گیا کہ اخبار البدر کا ایک مختصر نوٹ ہدیۂ قارئین کیا جائے۔ لہٰذا اس تعارفی اقتباس سے ہم روئداد سفر کا آغاز کرتے ہیں:-

"حضرت صاحبزادہ صاحب کے لئے ایک الوداعی جلسہ میں احبابِ قادیان جمع ہوئے۔

---

[1] الحکم ۱۴ر مئی ۱۹۱۲ء صفحہ ۳ تا ۹

حضرت خلیفۃ المسیح بھی تشریف لائے پہلے صوفی غلام محمد صاحب بی۔اے نے قرآن شریف کی چند آیات خوش الحانی سے پڑھیں۔اس کے بعد محمود احمد پسر شیخ الحکم صاحب نے جلسہ کی غرض بیان کی ...اس کے بعد ماسٹر عبدالرحیم صاحب نے سورۃ فاتحہ کے بعد اپنی تقریر میں فرمایا:۔

"حضرت خلیفۃ المسیح کے ایام علالت میں ایک دن مَیں نے گھبرا کر بہت دُعا کی تو میں نے خواب میں حضرت خلیفۃ المسیح کو دیکھا کہ میاں صاحب بشیرالدین محمود احمد کو پکڑے ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ پہلے بھی اوّل تھے' اب بھی اوّل ہیں۔تب سے میری طبیعت میں ایک خاص تغیر نیکی کی طرف اور میاں صاحب کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کا ہے۔میاں صاحب اس پاک سرزمین مکّہ اور مدینہ میں ہمارے واسطے دعائیں کریں۔اور انبیاءؑ کے مسکن بیت المقدس میں بھی ہمارے لئے دعائیں کریں۔مصر میں مُوسےٰؑ نے فرعون کو غرق کیا تھا۔میاں صاحب بھی وہاں اپنی پاک نصائح پھیلا کر شیطان کو غرق کریں گے اور میرے لئے بھی دُعا کریں۔"

اس کے بعد حضرت صاحبزادہ صاحب نے کلمۂ شہادت اور سورہ فاتحہ پڑھکر فرمایا

"مسلمانوں میں رواج ہے کہ یہ کلمہ اور دُعائیں خُطبہ میں پڑھتے ہیں۔اور مسلمانوں کا پہلا کام یہی ہے۔اس میں خدا کے وجود کا اقرار۔اس کی توحید اور رسالت کا اقرار ہے اور اپنی کمزوریوں سے ڈر کر خدا کی پناہ اور اپنے تمام کاموں میں خدا کے نام اور خدا کی صفات کے جلال کے لئے اظہار کی دُعا اور توفیقِ دُعا کے واسطے دُعا ہے۔اور منعم علیہ گروہ کا راستہ اپنے لئے مانگا گیا ہے اور اس کے واسطے اِستقامت کی خواہش کی ہے۔میرے اس سفر کے متعلق ممکن ہے کہ میرے دِل میں بھی اُمنگیں ہوں کہ میں بڑی بڑی دینی خدمات کروں گا۔اور میرے دوستوں کے دل میں بھی ایسے ہی خیالات ہیں۔مگر سب باتیں اللہ ہی کے اختیار میں ہیں۔اس کے فضل کے سوائے کچھ ہو نہیں سکتا۔اُسی کا ایک دَر ہے' جس کے بالمقابل سب دَر ہیچ ہیں۔اس واسطے ہم سب کو ایک دوسرے کے واسطے دعائیں کرنی چاہئیں۔یہی کامیابی کی چابی ہے۔میں اپنے دوستوں اور بزرگوں کی خدمت میں بھی یہی عرض کرتا ہوں کہ سب میرے واسطے دعائیں کریں۔یہی بڑا تحفہ اور بڑی مدد ہے۔میرے دِل میں مُدت سے خواہش تھی کہ مکّہ معظمہ

جو خدا کے بڑے پیاروں کی جگہ ہے وہاں جا کر دعائیں کروں کہ مسلمان اس وقت بہت ذلیل ہو رہے ہیں۔ اے خدا! قوم نے تجھ کو چھوڑا۔ نہ دین رہا نہ دُنیا رہی۔ کوئی تدبیر ان کی اصلاح کی کارگر نہیں ہوتی۔ اس جگہ تو نے ابراہیم کو وعدہ دیا تھا اور اس کی دُعا کو قبولیت کا شرف بخشا اور حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعاؤں کو قبول کیا تھا۔ آج پھر وہی دعائیں ہمارے لئے قبول فرما اور اہلِ اسلام کو عزت اور ترقی عطا کر۔ جب ہماری دعائیں ایک حد تک پہنچیں گی تو وہ قبول ہوں گی۔ میں اپنے دوستوں سے دُعا ہی کی درخواست کرتا ہوں۔ دشمن بڑا زبردست ہے اور ہم کمزور! مگر ہمارا محافظ بھی بڑا زبردست ہے۔[۱]

آپ کے اس سفر سے متعلق آپ کی والدہ کے جذبات کی عکاسی اس خط کے مندرجہ ذیل اقتباس سے ہوتی ہے جو آغازِ سفر ہی میں بمبئی پہنچنے پر حضرت صاحبزادہ صاحب کو موصول ہوا:۔

"مولوی صاحب کا مشورہ ہے کہ پہلے حج کو چلے جاؤ اور میرا جواب یہ ہے کہ میں تو دین کی خدمت کے واسطے تم کو اللہ تعالیٰ کی خدمت میں دے چکی ہوں۔ اب میرا کوئی دعویٰ نہیں وہ جو کسی دینی خدمت کو نہیں گئے بلکہ سیر کو گئے ان کو خطرہ تھا اور تم کو کوئی خطرہ نہیں۔ خداوند کریم اپنے خدمتگاروں کی آپ حفاظت کرے گا۔ میں نے خدا کے سپرد کر دیا۔ تم کو خدا کے سپرد کر دیا۔ اور سب یہاں خیریت ہے۔

والدہ محمود احمد[۲]

اس سفر کے دوران مختلف ایمان افروز اور عبرت آموز واقعات اور دلگداز قلبی کیفیات کا ایک بیش قیمت خزانہ آپ کے اُن خطوط میں دفن ہے جو سفر کی روئداد سے متعلق آپ نے حضرت خلیفۃُ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کی خدمت میں اور دیگر رفقاء اور اعزاء کو لکھے۔ لیکن افسوس کہ ان تمام کا یہاں نقل کرنا ممکن نہیں۔ ذیل میں اخبار "الحکم" کے مختصر نوٹ کے بعد حضرت خلیفۃ المسیح کی خدمت میں آپ کے لکھے ہوئے خطوط میں سے بعض پیش کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے۔

۱؎ "بدر" قادیان ۳؍اکتوبر ۱۹۱۲ء صفحہ ۲

۲؎ "الفضل" قادیان ۲۰؍نومبر ۱۹۱۶ء و تاریخ احمدیت جلد ۴ صفحہ ۴۴۲

دیارِ محبوبؐ سے نامۂ محمود (ایدہ اللہ الودود)

سب خوبیوں میں کامل پاکانِ حق میں شامل
محمود ابنِ مہدی یہ نوجوان ہمارا

(منقول از اخبار "الحکم" قادیان ۷ر دسمبر ۱۹۱۲ء)

"اس ہفتہ کی ولایتی ڈاک ہمارے اولوالعزم مخدوم حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب ایدہ اللہ بنصرہ العزیز ومتعنا اللہ بطول حیاتہٖ کے کئی خط لے کر آئی جو ہمارے سید و مولیٰ امام حضرت امیر المومنین کے نام ہیں۔ ان خطوط کو پڑھ کر ہر ایک احمدی کا دِل دعا کے لئے جوش سے متحرک ہوگا۔ میری اپنی تو یہ حالت تھی کہ حضرت امیر المومنین اپنی غایت شفقت سے جب ان خطوط کا مضمون آج ۱ر دسمبر کو مجھے زبانی سُنا رہے تھے تو تواجد کی حالت پیدا ہو رہی تھی اور میں حضرت کے چہرہ کو دیکھتا اور اُن کی آواز کو سُنتا تو اس سے مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ آپ پر جوانی کا زمانہ عود کر آیا ہے چہرہ پر مسرت (ایسی مسرت جو حمد الٰہی سے ملی ہوئی ہو) کا خون دوڑتا تھا اور آواز میں بھی جوش، ایسا جوش جو حمدُ اللہ و شکرُ اللہ سے مملوء پایا جاتا تھا۔ حضرت صاحبزادہ صاحب کے ایک فقرہ کا مفہوم جب آپ نے سُنایا کہ دعاؤں کی بڑی تحریک ہوئی تو میں نے عرض کیا کہ حضور نے خود ایک مرتبہ مکّہ معظمہ اور مدینہ منوّرہ کے فیوض میں سے یہ بات بتائی تھی کہ دعاؤں کے بڑے موقعے ملتے ہیں۔ غرض حضرت امیر المومنین کو بڑی خوشی اِن خطوط کو پڑھ کر ہوئی۔ خدا تعالیٰ کے محض فضل سے یہ خطوط مجھ کو مِل گئے ہیں۔ میں احمدی قوم میں دیارِ محبوب سے آتے ہوئے نامہ محمود کو شائع کرنے کی عزّت حاصل کرتا ہوں ان خطوط کے مطالعہ سے حضرت صاحبزادہ صاحب کی پاک سیرت، اُن کے پاک مقاصد و اغراض کا پتہ لگے گا۔ کیونکہ سیرت کا مطالعہ کسی شخص کی خواہشوں اور دعاؤں سے خوب ہوتا ہے۔ کاش یورپ کے سوانح نگار اس لطیف اصل کو سمجھتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائف کو اِس نکتۂ معرفت سے دیکھتے۔ میری آرزو ہے اگر خدا تعالیٰ نے چاہا، اسی رنگ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائف دکھاؤں۔ بہر حال

حضرت صاحبزادہ صاحب کی دعاؤں سے آپ کی سیرت کا پتہ لگے گا۔ ان خطوط پر میں اس وقت اور کوئی ریمارک نہیں کرتا۔ شوقِ محبت بہت کچھ لکھوانا چاہتی ہے۔ اور اشاعت کی عجلت قلم روکنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس لئے اصل خطوط کو ذیل میں درج کرتا ہوں اور درخواست کرتا ہوں کہ احباب اپنے اُولوالعزم مخدوم کے لئے بیش از پیش دُعائیں کریں جو ان کے لئے خدا تعالیٰ کے فضل کے مقامات میں بھی دعائیں کر رہا ہے۔ عجیب بات ناظرین کو یہ معلوم ہوگی کہ ایک طرف حضرت خلیفۃ المسیح ایدہ اللہ بنصرہٖ نے صاحبزادہ صاحب کو حج سے دارالامان واپس آنے کا خط لکھا دوسری طرف خدا تعالیٰ نے ایسے سامان پیدا کر دیئے کہ وہ جنوری یا فروری میں واپس آجائیں اللہ تعالیٰ اُن کا حامی و ناصر ہو.....   ایڈیٹر

پہلا خط جو سویز سے دیارِ محبوبؐ کو جاتے ہُوئے لکھا

سیّدنا و امامنا!   السلام علیکم۔

کل سویز خدا کے فضل سے آگئے اور خواب جو میں نے لکھی تھی اس کی تصدیق بھی ہوگئی کیونکہ جو جہاز آج پیر کو جانا تھا اس میں جگہ نہیں مل سکی اور وہی جواب ملا کہ ٹکٹ اس جہاز کے ختم ہو چکے ہیں کسی اگلے جہاز پر جگہ بنا دی جائے گی۔ ایک جہاز کل منگل کو انتیس ۲۹ اکتوبر کو جانا ہے۔ اس کے ٹکٹ کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن بہت مشکل معلوم ہوتا ہے کیونکہ ہزار ہا حاجی یہاں ہم سے پہلے آیا پڑا ہے آجکل مصر سے حجاج کے لئے روزانہ ایک دو جہاز روانہ ہوتے ہیں اور آخری جہاز وہ ہے جس پر پہلے جانے کا ارادہ کیا تھا اور اگر اسی پر آتے تو اغلب تھا کہ رہ جاتے اب بھی کہ ایک ہفتہ پہلے آگئے ہیں جگہ ملنے کی دِقت ہو رہی ہے۔ مصر سے اٹھائیس ہزار حاجی کے لئے ٹکٹ شائع ہو چکا ہے۔

کل پورٹ سعید سے سویز آتے ہوتے سیکنڈ کلاس میں پانچ آدمی میرے ساتھ اور سوار تھے۔ ایک تو کوئی یورپین تھا اور چار مسلمان۔ دو بدوی روسا تھے غالباً جنوبی حصہ مصر کے اور ایک محکمہ تار کا کوئی افسر تھا اور ایک ریلوے کا انسپکٹر۔ اُن

سے گفتگو ہوتی آئی۔ اور میں نے انہیں موجودہ حالاتِ اسلام پر توجہ دلائی اور بتایا کہ کس طرح مذہبی اور دنیاوی دونوں طور سے مسلمان گر رہے ہیں اور مسیحی غلبہ پاتے جا رہے ہیں۔ اور پھر وفاتِ مسیح کا مسئلہ اور حضرت صاحب کا دعویٰ پیش کیا اور اتحاد کی ضرورت اور تعلقِ باہمی کے بڑھانے پر زور دیا۔ قریباً تین گھنٹہ تک گفتگو ہوتی رہی ان میں سے جو شخص محکمہ تار کا افسر تھا وہ عربی زبان کے علاوہ انگریزی، فرانسیسی اور اٹلی کی زبانیں جانتا تھا۔ خدا کے فضل سے ان پر ایسا اثر ہوا کہ ان سب نے قریباً مجھ سے میرا پتہ لکھوا لیا اور اس شخص نے جو کئی زبانیں جانتا تھا وعدہ کیا کہ میں ان سب خیالات کو اخبار "العلم" میں جو یہاں کا روزانہ اخبار ہے شائع کروں گا اور آپ سے ان باتوں کی نسبت آئندہ خط و کتابت کرتا رہوں گا۔ پھر وہ میرے ساتھ سب اسباب لایا اور ایک لوکندہ تک لا کے اطمینان کر کے کہ اب کوئی تکلیف نہ ہو گی پھر اپنے کام کو گیا، ورنہ سویز میں ہمیں بہت تکلیف ہوتی یہ خدا ہی کا فضل ہے اس نے بھی اپنے دوسرے ساتھی سے جو ریل کا انسپکٹر تھا، فیصلہ کیا کہ ہم آئندہ اس قسم کی انجمن قائم کریں جس کی غرض اشاعتِ اسلام اور اتحاد بین المسلمین ہو۔ میری طبیعت برابر کمزور ہو رہی ہے آج اس قدر سر درد تھی کہ دن کو سونا پڑا۔ جس سے طبیعت پر اور بھی بد اثر پڑا۔ آج رات میں نے خواب میں دیکھا کہ والدہ ناصر کچھ بیمار ہیں جیسے سل کی ابتدا ہوتی ہے۔ ان کی والدہ کو چونکہ ایک دفعہ یہ مرض ہو چکی ہے مجھے ہمیشہ خطرہ رہتا ہے نہ معلوم خواب کی کیا تعبیر ہے لیکن حضور دعا فرمائیں۔ عورتوں کو خاوندوں کی جدائی کا بھی ایک صدمہ ہوتا ہے۔ اور اس سے جسمانی بیماریوں کا بھی ایک خطرہ ہوتا ہے۔ دعا کی سخت ضرورت ہے۔ حضور کی دعا سے اس وقت تک ہر جگہ اللہ تعالیٰ با اخلاق لوگوں سے ہی پالا ڈالتا رہا ہے۔ عرب صاحب بھی تبلیغ میں مصروف رہتے ہیں۔ والسلام

خاکسار۔ مرزا محمود احمد از سویز

دوسرا خط جو جدہ پہنچ کر ۲ر نومبر ۱۹۱۲ء کو لکھا

سیدی و آقائی و استاذی! السلام علیکم

کل بتاریخ یکم اکتوبر (غالباً نومبر ہے کیونکہ جدہ کی مہر ۲ر نومبر کی ہے۔ ایڈیٹر) اللہ تعالیٰ

کے فضل سے بہ خیر و عافیت جدہ پہنچ گئے۔ کل جس وقت اُترا ہوں، گو میرا بدن بہت گرم تھا اور سخت سر درد ہو رہی تھی لیکن چونکہ مصری جہاز کے مسافروں کو دیکھا نہیں جاتا، اس لئے اللہ تعالیٰ کے فضل سے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوئی اور بغیر کسی مزاحمت کے گزر گئے۔ میرا خیال تھا کہ میر صاحب اس وقت تک پہنچ گئے ہوں گے لیکن معلوم ہوا کہ وہ اب تک نہیں پہنچے کیونکہ اُن کا جہاز ابھی دو دن تک آئے گا۔ سو انشاء اللہ وہ یا تو آج تشریف لائیں گے یا کل۔ میں انشاء اللہ جدہ میں اُن کا انتظار کروں گا اور جب وہ تشریف لائیں گے تو اُن کے ساتھ مل کر انشاء اللہ مکہ معظمہ کی طرف روانہ ہوں گے۔ عرب صاحب بہ خیر و عافیت ہیں۔ میری صحت بدستور کمزور ہے۔ بہت خفیف سی کھانسی ہے اور حرارت سی معلوم ہوتی ہے۔ چونکہ ٹمریچر نہیں لیا۔ اس لئے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ واقع میں بھی ہے یا معدہ کے نقص سے معلوم ہوتی ہے۔ سر درد روزانہ ہو جاتی ہے۔ کبھی پیٹ میں درد ہو جاتی ہے شاید اختلافِ غذا کی وجہ سے ہے۔

مصر میں پہلے دن تو کچھ لکھے پڑھوں سے ملاقات ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے میں یہ سمجھا کہ شاید سارے مصر کی زبان ایسی ہے لیکن تین دن کے بعد کے تجربہ سے معلوم ہوا کہ بہت ہی خراب زبان ہے۔ عوام الناس کی زبان کا سمجھنا تو کارِ دارد ہے میں تو خیر زبانِ محاورہ جانتا ہی نہیں۔ لیکن اکثر اوقات عرب صاحب بھی کہتے تھے کہ میں نہیں سمجھا۔ الفاظ بھی بدل دیتے ہیں۔ ایسے ملک میں تو شاید آدمی پانچ سال میں بھی زبان نہ سیکھ سکے۔ جہاز میں خاص قاہرہ کے آدمی بھی ملے۔ اُن کی زبان بھی ویسی ہی تھی۔ حالانکہ بعض اُن میں سے بڑے بڑے آدمی تھے لیکن چونکہ زیادہ مدت رہنے کا موقع نہیں ملا، ابھی درُست رائے قائم نہیں کر سکے۔ اب یہاں جدہ میں اس وقت تک جتنے آدمیوں سے ملنے کا موقع ملا ہے، وہ خوب زبان فصیح بولتے ہیں۔ لیکن نہ معلوم کل تک یہ رائے قائم رہتی ہے یا نہیں۔ جو عرب قادیان میں دیکھے تھے، اُن سے اِن کی زبان مختلف ہے کل ایک دس گیارہ برس کے لڑکے نے کہا کہ مراکب الحجاج تکون مشحونا۔ مشحون کا لفظ اس سے سُن کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ قرآن کریم کا لفظ ہے۔ مصر میں بہت سے لوگوں سے سُنا کہ کہتے تھے اربعۃ یوم، ستۃ یوم، خمسۃ یوم[1] یہاں ایک اور لڑکے نے کہا اربعہ ایام۔ وہاں کسی پڑھے لکھے آدمی کے مُنہ سے

[1] قواعد کی رُو سے خَمسَۃَ اَیَّامٍ ہونا چاہیئے (النحو الواضح فی قواعد اللغۃ العربیۃ)۔

بھی ایام نہیں سُنا۔سب یوم یوم ہی کہتے تھے۔میاں ابوبکر صاحب بتلاتے ہیں کہ مکہ کی زبان یہاں سے بھی صاف ہے۔وہاں مصر کے لوگوں سے اور دوسروں سے یہ سُنا ہے کہ مصر میں لُغت اور حدیث کے بعض بڑے بڑے عالِم ضرور موجود ہیں۔اگر یہ درُست ہے تو مصر سے آدمی یہ فائدہ اٹھا سکتا ہے کہ ایک دو سال تک متواتر رہ کر ان لوگوں سے تعلیم حاصل کرے۔میرے جیسا آدمی جس کا ارادہ زیادہ سے زیادہ چھ ماہ اس سفر میں خرچ کرنے کا تھا' ان سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔میں تو اگر نیّتِ حج نہ کر لیتا تو یہ سفر میرے لئے مشکل ہو جاتا۔اس قسم کی غفلت دُنیا میں چھائی ہُوئی ہے کہ طبیعت گھبرا جاتی ہے۔ہندوستان دین کے لحاظ سے سب ملکوں سے بڑھا ہُوا ہے اور قادیان تو ایک رحمت ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔دین کی ضرورت کو ہی لوگ نہیں سمجھتے مصر کے چار دن کے قیام اور دورانِ سفر جہاز میں بہت سے لوگوں سے گفتگو کا موقعہ ملا۔بہت نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ تبلیغ کی اُن کو ضرورت ہے جو جھُوٹ پر ہیں' اور جو حق پر ہیں اُن کو تبلیغ کی کیا حاجت؟ اگر کوئی لوگ گمراہ ہوتے ہیں تو ہوں۔ہم تو الحمدللہ مسلمان ہیں جب اُن کو سمجھایا گیا تو حیران ہوئے اور اقرار کیا کہ اب تک ہم ضرورتِ تبلیغ و تعلیم کو سمجھتے ہی نہیں تھے۔اور کبھی خیال بھی نہیں کیا۔اگرچہ چار دن ٹھہرنے کا ہی اتفاق ہُوا لیکن جہاز میں تین دن مصریوں کا ہی ساتھ رہا۔اور مصر سے اچھے اچھے لوگ سب بلاد کے حج کو جا رہے تھے۔سب سے میں نے ملاقات کی۔چونکہ ان میں ہماری نسبت تعصّب نہیں اس لئے کچھ مخالفت کے بعد مان لیتے ہیں اور زیادہ ہٹ نہیں کرتے اور تھوڑی سی گفتگو کے بعد محبت کرنے لگ جاتے تھے۔اور خود بُلا بُلا کر گفتگو کرتے تھے۔

باوجود اس کے کہ وہ لوگ عرب ہونے پر افتخار کرتے تھے لیکن تمام تھرڈ کلاس والے عرب صاحب کو اپنا شیخ بنا بیٹھے تھے۔اور ہر ایک اُن سے آ کر فتویٰ پوچھتا تھا۔اور مناسکِ حج دریافت کرتا تھا۔اور سیکنڈ فسٹ والے میرے پیچھے پڑے ہُوئے تھے خصوصاً مصری جہاں ملتے گفتگو شروع کر دیتے اور بُلا کر پاس بٹھا لیتے۔مگر قہوہ اور کافی کی عادت نہ تھی اس لئے ان لوگوں کو بہت تکلیف اور حیرت ہوتی تھی کیونکہ میں اُن کا ساتھ نہ دے سکتا تھا۔قہوہ کی ایک پیالی تو خیر پینی آسان ہے لیکن کافی پینا تو بہت مشکل کام ہے۔کافی سخت کڑوی چیز ہے۔وہ اس پر حیران ہوتے اور مجھ پر رحم کرتے تھے کہ یہ

اس نعمت سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ ایک شخص مجھے کہنے لگا کہ کیا ہندوستانی کافی نہیں پیتے؟ یہ تو بڑی نعمت ہے۔

حج کی قدر اور اس کی عظمت حج کے بغیر نہیں معلوم ہو سکتی۔ واقعی جو دعا اور توجہ اِلَی اللہ اس سفر میں دیکھی ہے وہ کبھی نہ دیکھی تھی۔ سینکڑوں زبانوں کے بولنے والے لوگوں کو جہاز میں اکٹھا دیکھ کر اور اُنکی لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ کی آواز سُن کر ایسی رِقّت اور محبت پیدا ہوتی تھی کہ اندازہ سے بڑھ کر رسول کریمؐ کے کمالات پر تعجب آتا تھا کہ مکہ سے اُٹھ کر اس نُور نے دُنیا کے کس کس گوشہ کو روشن کر دیا۔ آخر وہ کیا قوتِ قدسی تھی جس نے کروڑوں نہیں اربوں کو ضلالت سے نکال کر ہدایت کا راستہ بتا دیا۔ رابغ پر بیٹھتے وقت جب لبّیک لبّیک کا نعرہ اُٹھا اور میں نے ترکوں کو لبّیچ لبّیچ کہتے سُنا تو میری آنکھوں میں آنسو آگئے کہ یہ لوگ لفظ تو درُست بول نہیں سکتے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعاؤں، آہ وزاریوں نے اُن کو کھینچ کر راہِ اسلام دکھا دی۔ رابغ کے قریب اللہ تعالیٰ نے میرے سینے کو دُعاؤں کے لئے کھول دیا اور بہت دُعا کی توفیق ملی۔ قدرتِ الٰہیہ اور اس کے فضل کے قربان جاؤں کہ دو ترک جو اُردو تو الگ عربی بھی نہیں جانتے تھے۔ ایک میرے دائیں اور ایک میرے بائیں کھڑے ہوگئے اور نہایت دردِ دل سے آمین آمین پکارنے لگے۔ فوراً میرے دل میں آیا کہ یہ قبولیت کا وقت ہے کہ خدا نے یہ لوگ میرے لئے آمین آمین کہنے کے لئے بھیج دیئے ہیں اور حالانکہ وہ نہیں جانتے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ اس وقت میں نے اپنے لئے، حضور کے لئے، حضور کے خاندان کے لئے، اپنی والدہ اور سارے خاندان کے علاوہ احبابِ قادیان، احمدیوں اور پھر حالتِ اسلام کے لئے بہت دیر تک دُعا کی اور وہ دونوں ترک برابر آمین کہتے رہے۔ فالحمد للہ علٰی ذٰلک۔ میں حیران ہوں۔ ع

میں تو نالائق بھی ہو کر پا گیا درگاہ میں بار

کونسی بات تھی کہ خدا تعالیٰ نے مجھے اس پاک زمین کی زیارت کی توفیق دی! فضل! فضل! دُعا کی بہت ضرورت ہے۔ گو اس ملک میں دِل خوش ہے لیکن جسم بیمار ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ انشاء اللہ مدینہ سے شام کے راستے مصر ہوتے ہوئے جنوری یا فروری کو واپس ہندوستان روانہ ہو جاؤں۔ ومن اللہ التوفیق۔ والسلام

خاکسار مرزا محمود احمد۔

بیت الحرام سے لکھا ہُوا تیسرا نامۂ محمود

سیدی و امامی و اُستاذی۔ السلام علیکم

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور عنایت سے بخیر و عافیت میر صاحب سمیت کل تاریخ ساتویں نومبر کو مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ خدا تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر اور عنایت ہے کہ اس نے اپنے فضل سے اپنے پاک اور مقدس مقام کی زیارت کا موقعہ دیا۔ کل جب مکہ کی طرف اونٹ آرہے تھے۔ دل کی عجیب کیفیت تھی کہ بیان نہیں ہوسکتی۔ محبت کا ایک جوش دل میں پیدا ہو رہا تھا اور جُوں جُوں قریب آتے تھے دل کا شوق بڑھتا جاتا تھا۔ میں حیران ہوں کہ اللہ تعالیٰ کس طرح اپنی حکمت اور ارادہ کے ماتحت کہاں سے کہاں کھینچ لایا۔ پہلے مصر کا خیال پیدا۔ پھر یہ خیال آیا کہ راستے میں مکہ ہے۔ اس کی زیارت بھی کرلیں۔ پھر خیال ہُوا کہ حج کے دِن ہیں اُن سے بھی فائدہ اٹھایا جائے۔ غرض کہ ارادہ مصر سے مکہ اور حج کا ہُوا اور آخر اللہ تعالیٰ نے وہاں پہنچا دیا۔ مجھے مُدت سے حج کی خواہش تھی اور اس کے لئے دعائیں بھی کی تھیں۔ لیکن بہ ظاہر کوئی صورت نظر نہ آتی تھی کیونکہ وہاں کے راستے کی مشکلات سے طبیعت گھبراتی اور یہ بھی خیال تھا کہ مخالفین کوئی شرارت نہ کریں۔ لیکن مصر کے ارادہ سے یہ خیال ہُوا کہ مصر جانا' اور راستے میں مکہ کو ترک کر دینا ایک بے حیائی ہے۔ اس میں تو کچھ شک نہیں کہ جدہ سے مکہ تک کا سفر نہایت کٹھن ہے اور میر صاحب تو قریباً بیمار ہوگئے اور مجھے بھی سخت تکلیف ہُوئی اور تمام بدن کے جوڑ جوڑ ہل گئے لیکن بڑی نعمتیں بڑی قربانی بھی چاہتی ہیں اس بڑی نعمت کے لئے یہ تکلیف کیا چیز ہے! مدینہ کا راستہ اور بھی طویل اور کٹھن ہے۔ لیکن چند دن کی تکلیف اُن پاک مقامات کے دیکھنے کے لئے کہ جہاں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم' فداہ ابی و امی نے اپنی بعثتِ نبوت کا ایک روشن زمانہ گزارا' کیا چیز ہے؟ میرا دل تو اللہ تعالیٰ کے اس احسان پر قربان ہوا جا رہا ہے کہ وہ کس حکمت کے ساتھ مجھے اس جگہ لے آیا۔ ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء

اللہ تعالیٰ کی حکمت اس سے بھی معلوم ہوتی ہے کہ اول تو اس جہاز سے جو مصر جاتا تھا' رہ گئے۔ لیکن بعد میں جب اصرار کرکے دوسرے جہاز میں سوار ہوتے تو مصر

پہنچتے ہی خواب آیا کہ حضرت یا آپ فرماتے ہیں کہ فوراً مکہ چلے جاؤ پھر شاید موقعہ ملے کہ نہ ملے۔ چنانچہ دو جہاز چلے گئے اور ہم ان میں سوار نہ ہو سکے۔ جس سے خواب کی تصدیق ہو گئی۔ اس طرح مصر کی سیر بھی نہ کر سکے اور جب مکہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ اب مصر نہیں جا سکتے۔ کیونکہ گورنمنٹ مصر کا قاعدہ ہے کہ سوائے ان لوگوں کے جو مصر کے باشندہ ہوں حج کے بعد چار مہینہ تک کوئی شخص حجاز و شام سے مصر نہیں جا سکتا۔ اس طرح گویا اگر میں مصر جانا چاہوں تو مجھے اپریل تک وہاں جانے کی اجازت نہیں، اپریل کے آخر میں وہاں جا سکتا ہوں۔ پہلے تو اس خبر کو میں گپ ہی سمجھا تھا، لیکن بعد میں حاجی علی جان والے جو دہلی کے سوداگر ہیں، اُن کے یہاں سوداگر ہیں، اُن سے معلوم ہوا کہ واقعی حکم یہی ہے اور چونکہ ان کے کاروبار ان دیار میں جاری ہیں، اُن کو یقینی علم ہے۔ ایک اور شخص نے بتایا کہ میں پچھلے سال شام میں تین ماہ تک رکا رہا، اور اس مدت کے گزرنے پر پھر مصر کے داخلہ کی اجازت ملی۔ اب اس صورت میں مصر کو واپس جانا فضول معلوم ہوتا ہے۔ حج کے بعد چار ماہ تک مصر کے داخلہ کا انتظار کرنا فضول ہے۔ میں نے تو ان سب واقعات کو ملا کر یہی نتیجہ نکالا ہے کہ منشائے الٰہی مجھے حج کروانے کا تھا۔ اور مصر کا خیال ایک تدبیر تھی۔ میں تو اللہ تعالیٰ کی اس مہربانی پر قربان ہوں کہ میرے جیسے گنہگار انسان کی کیا حقیقت تھی کہ اس پر اس قدر لطف و عنایت کی نظر ہوتی۔ اور اس طرح اسے ایسے پاک مقامات کی زیارت کروائی جاتی مگر خدا تعالیٰ کا پیار بھی اپنے بندوں سے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ وہ تو محسن ہے مگر ہماری طرف سے ناشکری ہوتی ہے۔ اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم

کل عُمرہ ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے اُمید سے بڑھ کر دُعاؤں کی توفیق دی اور میں نے حتّی المقدور حضور کے لئے، حضور کے خاندان کے لئے، کل احمدی جماعت اور اسلام اور مُسلمانوں کے لئے دعائیں کیں۔ زیارت بَیتُ اللہ کے وقت بھی اور صفا و مروہ کی سعی کے وقت بھی خصوصاً جماعت کی ترقی اور آپس کے اتحاد و مودّت کے لئے وباللہ المجیب۔

والسلام
خاکسار مرزا محمود احمد

حضرت صاحبزادہ صاحب کا خط پورٹ سعید سے

حضرت خلیفۃ المسیح الاوّلؓ کے نام

"اگرچہ میری جسمانی صحت اس سفر میں بہت کمزور رہی ہے' لیکن روحانی طور سے بہت کچھ فائدہ ہُوا ہے اور اس قدر دعاؤں کا موقعہ ملا ہے کہ پہلے کم اتفاق ہُوا تھا۔ اور مجھ سے جس قدر ہو سکا اپنے علاوہ حضور کے لئے' حضور کے خاندان کے لئے' اپنے سب خاندان کے لئے' قادیان کے احباب کے لئے' پھر کل جماعت احمدیہ کے لئے اور اسلام کے لئے بہت دعائیں کیں۔ خصوصاً انیس تاریخ تمام کو جہاز پر کچھ ایسی حالت ہوتی کہ مجھے یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا تمام زمین و آسمان نُور سے بھر گیا ہے اور دل میں دُعا کا اس قدر جوش تھا کہ میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ اور پھر ساتھ دل میں یہ یقین معلوم ہوتا تھا اور اطمینان تھا کہ سب دعائیں قبول ہو رہی ہیں اور دُعا سے طبیعت گھبراتی نہ تھی۔ علاوہ ازیں ہمارے سفر میں اکثر اوقات دُعا کا موقعہ ملتا تھا۔ سمندر بہت اچھا رہا۔ ایک دن تو وہ کچھ تیز تھا مگر کچھ تکلیف نہیں ہُوئی۔ میرے ساتھ بہت سے طلبائے انگلستان سوار تھے۔ مسلمان بھی اور ہنود بھی' اُن کو تبلیغ کا بھی خوب موقعہ مل گیا۔ سب کے سب دھریہ تھے اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہنسی اور ٹھٹھا کرتے تھے۔ ہنود گائے کے گوشت سے کسی قسم کا پرہیز نہیں کرتے تھے کیونکہ اب وہ مذہب سے بالکل آزاد تھے۔ میں حتی الوسع سفر میں اُن کے پیچھے پڑا رہا اور وہ بھی کچھ کچھ مانوس ہو گئے تھے۔ جب اپنے کاموں سے فارغ ہوتے' میرے پاس بیٹھ کر دین کی باتیں شروع کر دیتے۔ تین بیرسٹر تھے سب سے زیادہ دریدہ دہن تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے فضل سے کوشش رائیگاں نہیں گئی اور گو انہوں نے پُورے طور سے اقرار نہ کیا لیکن ایک نے یہ اقرار کیا کہ گو پہلے میں اس معاملہ میں بالکل نڈر تھا لیکن اب خدا کے بارہ میں ہنسی کرتے یا سُنتے میرا دل کانپ جاتا ہے اور ایک خواہش پیدا ہو گئی ہے کہ اس بات کی پوری طرح سے چھان بین کروں' اس لئے یہ بھی کہا کہ اگرچہ آپ کی باتوں کا جواب میں نہیں دے سکتا لیکن چونکہ میرا پُرانا اعتقاد جما ہُوا ہے' اس

لئے پوری تسلی نہیں ہوتی۔ میں ایک امتحان بیرسٹری کا باقی ہے' وہ دے کر جب پانچ ماہ کے بعد واپس ہند آؤں گا تو آپ سے ملوں گا اور قادیان آؤں گا کہ اس مسئلہ کی تصدیق کروں۔ دوسرے ہندو نے کہ وہ بھی بیرسٹری کے سب امتحان پاس کر چکا ہے' صرف ایک ٹرم TERM باقی ہے' کہا کہ آج تک میں نے اس رنگ میں کبھی مذہب پیش ہوتے نہیں دیکھا اور آج تک بغیر دلیل کے ہی ہمیں مذہب منوایا جاتا تھا۔ یہ نیا طریق دیکھا ہے کہ آپ دلائل دیتے ہیں۔ مگر وہ ایسا گستاخ تھا کہ بار بار یہ کہتا تھا کہ اگر خدا تعالیٰ میں کوئی طاقت ہے تو وہ اسے ہلاک کر دے۔ نعوذ باللہ من ذٰلک۔ ایک اور طالب علم نے میرا پتہ لکھ لیا کہ ولایت سے میں مذہب کے متعلق آپ سے خط و کتابت کروں گا۔ میں نے سب سے وعدہ لیا ہے کہ ولایت میں خواجہ صاحب سے ملاقات کریں۔ بعض نے بعض کتابیں بغرض مطالعہ بھی مانگی ہیں۔ فالحمد للہ علیٰ ذٰلک۔ اس فائدہ کے علاوہ مجھے سب سے عظیم الشان فائدہ یہ ہوا ہے کہ ان لوگوں کی حالت دیکھ کر اسلام کی موجودہ حالت کا نقشہ کھنچ گیا۔ ایسا خطرناک دھریہ میں نے کبھی نہ دیکھا ہے جیسا ان لوگوں کو دیکھا۔ سخت دلیر اور منہ پھٹ۔ میں دیکھتا ہوں اسلام کی حالت کا جو پہلے درد تھا اس سے لامحالہ بہت زیادہ اب میں پاتا ہوں۔ دعا کی بہت ضرورت ہے اور سخت ہی محتاج ہوں۔ اس وقت بھی سر درد شروع ہے اور جب طبیعت بہت خراب ہوتی ہے تو دل گھبرا جاتا ہے۔

خاکسار مرزا محمود احمد از پورٹ سعید "

جدّہ سے ایک خط

" حج کے روز طبیعت ایسی صاف ہو گئی کہ خدا کے فضل سے حج نہایت عمدگی اور خیریت کے ساتھ ختم ہوا۔ بہت سے ایسے مقامات جہاں دعا کی قبولیت خاص طور پر بتائی جاتی ہے' وہاں اللہ تعالیٰ کے فضل ایسے دیکھے کہ حیران ہوں۔ عرفات میں قریباً چار گھنٹے سے بھی زیادہ دعا کا موقعہ ملا اور آثارِ رحمتِ الٰہی ایسے نظر آتے

تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ تمام دُعائیں قبول ہو رہی ہیں۔ اور خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے دعائیں اِلقا ہوتی تھیں جو پہلے کبھی وہم میں بھی نہ آئی تھیں۔ فالحمد للہ علیٰ ذٰلک ... دعاؤں سے رغبت اور دُعاؤں کا القا اور رحمتِ الٰہی کے آثار جو میں نے اس سفر میں خصوصاً مکہ مکرمہ اور ایامِ حج میں دیکھے ہیں، وہ میرے لئے بالکل ایک نیا تجربہ ہے اور میرے دل میں ایک جوش پیدا ہُوا ہے کہ اگر انسان کو توفیق ہو تو وہ بار بار حج کرے کیونکہ بہت سی برکات کا موجب ہے۔"[1]

اِن خطوط کے علاوہ آپ کی بعد کی بعض تقاریر اور تحریرات میں بھی اس سفر کی کچھ یادیں محفوظ ملتی ہیں۔ اُن میں سے بھی بعض نمونۃً پیش ہیں:۔

"میں جب ۱۹۱۲ء میں حج کے لئے گیا تو وہاں بھی ہمارے ساتھ ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ میرے ساتھ پانچ آدمی اَور بھی ہم سفر تھے۔ اُن میں سے تین بڑی عمر کے تھے اور وہ تینوں ہی بیرسٹری کر رہے تھے۔ اُن میں سے ایک ہندو تھا جو اَب ہندوستان چلا گیا ہے۔ دو مسلمان تھے، جن میں سے ایک فوت ہو چکا ہے اور ایک ملتان میں بیرسٹری کر رہا ہے۔ یہ تینوں روزانہ میرے ساتھ مذہبی اور سیاسی گفتگو کرتے تھے اور کہتے تھے کہ کانگرس کے ساتھ مِلنا چاہیئے، مسلمانوں کی بہتری اور بھلائی اسی میں ہے۔ غرض خوب بحثیں ہوتی رہتی تھیں۔ جب ہمارا جہاز عدن پہنچا تو ہم اُتر کے عدن کی سیر کے لئے چلے گئے۔ میں بھی تھا اور وہ تینوں بیرسٹر بھی تھے اور وہ دو لڑکے بھی تھے جن میں سے ایک اس وقت ایجوکیشن کا ڈائریکٹر ہے، اُس وقت وہ بچہ تھا۔ بہرحال ہم سارے وہاں گئے۔ جس وقت ہم شہر میں داخل ہونے لگے تو ایک آدمی بالکل سادہ لباس میں ہمارے پاس آیا۔ اس وقت ہم پنجابی میں باتیں کر رہے تھے۔ اُس نے دیکھ لیا کہ پنجابی ہیں۔ چنانچہ آتے ہی کہنے لگا "آ گئے ساڈے لالہ لاجپت رائے جی دے وطن دے خوش قسمت لوگ آ گئے۔" اس نے اِتنا فقرہ ہی کہا تھا کہ انہوں نے اس کو نہایت غلیظ گالیاں دینی شروع کر دیں۔ مجھے بڑی بدتہذیبی معلوم ہوئی کہ اس بیچارے نے کہا ہے کہ تم وہاں سے آئے ہو اور انہوں نے گالیاں دینی شروع کر دی

---

[1] "بدر" قادیان ۹ر جنوری ۱۹۱۳ء صـ۱

ہیں۔ خیر اس وقت تو میں چپ رہا جب ہم واپس آئے تو میں نے کہا کہ آپ لوگوں نے کوئی اچھے اخلاق نہیں دِکھائے۔ کوئی مسافر آدمی تھا۔ پنجابی دیکھ کے اسے شوق آیا کہ وہ بھی پنجابی میں باتیں کرے اور اس نے آپ کو کہہ دیا کہ لالہ لاجپت رائے کے وطن کے لوگ آئے ہیں تو اس میں حرج کیا ہُوا؟ وہ کہنے لگے آپ نہیں جانتے' یہ پولیس مین تھا اور اس کی غرض یہ تھی کہ ہم لالہ لاجپت رائے کی کچھ تعریف کریں اور یہ ہمارے خلاف ڈائری دے۔ اب پتہ نہیں یہ سچ تھا یا جھُوٹ یا اُن کے دِل پر ایک وہم سوار تھا اور اس کی وجہ سے انہوں نے یہ کہا۔ بہرحال دنیا میں یہ کارروائیاں ہوتی ہیں" (سیر روحانی جلد ۳ صفحہ ۱۴۰-۱۴۱)

پھر فرمایا:۔

"جب انسان بیت اللہ کو دیکھتا ہے اور اِس پر اُس کی نظر پڑتی ہے تو اس کے دل پر ایک خاص اثر پڑتا ہے اور وہ قبولیتِ دُعا کا ایک عجیب وقت ہوتا ہے۔ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ جب میں نے حج کیا تو میں نے ایک حدیث پڑھی ہوئی تھی کہ جب پہلے پہل خانہ کعبہ نظر آئے تو اس وقت جو دُعا کی جائے وہ قبول ہو جاتی ہے۔ فرمانے لگے اس وقت میرے دل میں کئی دُعاؤں کی خواہش ہوئی لیکن میرے دل میں فوراً خیال پیدا ہُوا کہ اگر میں نے یہ دعائیں مانگیں اور قبول ہو گئیں اور پھر کوئی اَور ضرورت پیش آئی تو پھر کیا ہو گا۔ پھر تو نہ حج ہو گا اور نہ یہ خانہ کعبہ نظر آئے گا۔ کہنے لگے تب میں نے سوچ کر یہ نکالا کہ اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا کروں کہ یا اللہ میں جو دعا کیا کروں وہ قبول ہُوا کرے۔ تاکہ آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے۔ میں نے حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ سے یہ بات سُنی ہوئی تھی' جب میں نے حج کیا تو مجھے بھی وہ بات یاد آ گئی۔ جونہی خانہ کعبہ نظر آیا ہمارے نانا جان نے ہاتھ اُٹھاتے کہنے لگے دعا کر لو۔ وہ کچھ اَور دعائیں مانگنے لگ گئے مگر میں نے تو یہی دُعا کی کہ یا اللہ! اس خانہ کعبہ کو دیکھنے کا مجھے روز روز کہاں موقعہ ملے گا۔ آج عمر بھر میں قسمت کے ساتھ موقع ملا ہے۔ پس میری تو یہی دُعا ہے کہ تیرا اپنے رسولؐ سے وعدہ ہے کہ اس کو پہلی دفعہ حج کے موقعہ پر دیکھ کر جو شخص دُعا کرے گا وہ قبول ہو گی۔ میری دُعا تجھ سے یہی ہے کہ ساری عمر میری دعائیں قبول ہوتی رہیں۔" [تفسیر کبیر مصنفہ حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد (سورۃ بقرہ) زیر آیت ۲۰۴ صفحہ ۴۵۰]

ایک اَور موقعہ پر حج بیت اللہ کا ذکر کرتے ہُوئے فرمایا:۔

"میں نے دُعا میں چند جگہوں کا خاص تجربہ کیا ہے۔ اوّل خانہ کعبہ کی رویت کے وقت کی دُعا۔ اس وقت میں نے ایک عجیب نظارہ دیکھا کہ آسمان سے نزولِ انوار ہو رہا ہے۔ یہ قلبی کیفیت نہ تھی بلکہ واقعی ایک چیز تھی جو نظر آ رہی تھی۔ دوسرے عرفات کا مقام یہ توجہ کا مغز ہے اس میں بھی نزول برکات کا ہوتا ہے۔ تیسری جگہ غارِ حرا تھی اس میں دُعا کرنے سے بھی قلب میں ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی تھی ایک وجہ اس کیفیت کے پیدا ہونے کی یہ ہے کہ ان مقامات کی وہ لوگ واجبی قدر نہیں کرتے۔

میں نے عرفات کے میدان میں دیکھا کہ لوگ میلوں کی طرح خرید و فروخت میں مصروف تھے، کھاتے پیتے پھرتے تھے، مجھے کوئی دُعا میں مصروف نظر نہ آیا۔ البتہ جب خطیب کے خطبہ پڑھنے کے بعد کپڑا ہلا تو لوگ کچھ متوجہ ہوئے ورنہ باقی تمام وقت کھانے پینے میں ہی گزار دیا۔

میں نے وہاں خصوصیت سے برکات کو دیکھا۔ تین گھنٹہ کا وقت ملا اور میں نے تین گھنٹہ تک دُعا کی، جب وقت تنگ ہونے لگا تو مجھے کہا گیا کہ اب چلنا چاہیئے۔ مگر مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا میں نے دس پندرہ منٹ ہی دعا کی ہے۔

میں نے وہاں تبلیغ شروع کی اور خدا نے اپنے خاص فضل سے میری حفاظت کی۔ اس وقت حکومتِ ترکی کا وہاں چنداں اثر نہ تھا۔ اب تو شاہِ حجاز کے گورنمنٹ انگریزی کے زیرِ اثر ہونے کے باعث ہندوستانیوں سے بدسلوکی نہیں ہو سکتی مگر اس وقت یہ حالت نہ تھی۔ اس وقت تو وہاں جس کو چاہتے گرفتار کر سکتے تھے۔ مگر میں نے تبلیغ کی اور کھلے طور پر کی۔ لیکن جب ہم وہ مکان چھوڑ کر واپس ہوئے تو دوسرے دن اس مکان پر چھاپہ مارا گیا اور مالکِ مکان کو پکڑا گیا کہ اس قسم کا کوئی شخص یہاں تھا۔ وہاں ایک مولوی عبدالستار تاجر کتب تھے جو عالم اور شریف اور سمجھدار انسان تھے اور جمہور سے عقائد میں اختلاف رکھتے تھے۔ مگر ظاہر نہیں ہو سکتے تھے۔ میں نے جب اُن کو تبلیغ کی تو انہوں نے کہا کہ باتیں معقول ہیں مگر میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ فلاں شخص کے پاس اس قسم کی باتیں نہ کریں، وہ آپ کو نقصان پہنچائے گا۔ میں نے اُن کو بتایا کہ میں اس کو بھی دو گھنٹہ تک تبلیغ کر آیا ہوں۔ اس نے سوائے بدزبانی کے اور تو کچھ نہیں کہا۔

وہاں میری شہرت بھی ہو گئی تھی۔ چنانچہ ایک سڑک پر ہم جا رہے تھے کہ ایک نوجوان شخص نے سنجیدگی سے "یا ابن رسول اللہ" یا "یا ابن نبی اللہ" کہہ کر سلام کیا اور ہٹ گیا۔ یہ اس نے تمسخر سے کہا یا حقیقی طور پر یہ معلوم نہیں، مگر تمسخر کی کوئی علامت اس سے ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ ممکن ہے کہ اس کے قلب میں تحریک ہوئی ہو۔ اور وہ خوف سے ظاہر نہ کرتا ہو۔"[1]

حضرت صاحبزادہ صاحب کی سفرِ حج سے واپسی پر بمبئی سے لے کر قادیان تک تمام جماعتوں نے آپ کا شاندار استقبال کیا اور لوگ جوق در جوق مختلف اسٹیشنوں پر آپ سے ملاقات اور خوش آمدید کے لئے آئے۔ یہ محض ایک دُنیوی رسم نہ تھی بلکہ خدمتِ دین کو اس موقع پر بھی اوّلیت حاصل رہی۔ ہر اسٹیشن پر آپ احبابِ جماعت کو مخاطب کرتے ہوئے انہیں سفرِ حج کی رُوئداد سُناتے اور دینی نصائح فرماتے رہے اور باوجود وقت کی تنگی کے مختصر اور پُر اثر تقاریر فرمائیں۔

امرتسر کے اسٹیشن پر استقبال کرنے والوں میں مکرم و محترم پروفیسر قاضی محمد اسلم صاحب ایم۔ اے (کینٹب) (سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور و پروفیسر شعبۂ نفسیات' پنجاب یونیورسٹی) بھی شامل تھے۔ اُس وقت آپ نے پہلی مرتبہ حضرت صاحبزادہ صاحب کی زیارت کی اور یہ موقع اس لحاظ سے بڑا بیش قیمت تھا کہ محترم قاضی صاحب نے اس وقت آپ کی شخصیت کی ایک ایسی تصویر اپنے ذہن میں محفوظ کر لی جس کا دلکش نقش آج تک محترم قاضی صاحب کی یادوں کا ایک قیمتی سرمایہ ہے اور محترم قاضی صاحب کی بدولت ہمیں بھی آپ کی اس نوعمری کی شخصیت سے شناسائی کا موقع مل گیا۔ محترم قاضی صاحب اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

> "۱۹۱۲ء میں جب حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ فریضۂ حج ادا کر کے واپس تشریف لائے تو امرتسر کے اسٹیشن پر امرتسر کی جماعت نے آپ کا استقبال کیا۔ اس موقعہ پر مَیں نے پہلی دفعہ آپ کو دیکھا۔ غالباً سیکنڈ کلاس کے ڈبہ میں تھے۔ یہ میرا پہلا نظارہ ہے جو میں نے آپ کی شخصیت کا کیا۔ بس وہ دِن اور یہ دِن ——— ایک مستقل یاد رکھے ہوئے ہوں اسوقت میری عجیب کیفیت تھی۔ کاش مَیں بیان کر سکتا! میں نے دیکھا کہ ایک نہایت ہی خوبصورت آدمی ہے جو ہمارا بزرگ ہے' لیڈر ہے' قابلِ احترام

---

[1] الفضل ۷ مارچ ۱۹۲۱ء صفحہ ۵

ہے اور عظیم انسان بننے والا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ آپ کو دیکھ کر آپ کے بوڑھے اور جوان ہونے کا فرق محسوس نہیں ہوتا تھا۔ ۱۹۲۴ء میں حضور ولایت تشریف لے گئے تو وہاں کے ایک اخبار نے لکھا کہ امام جماعت احمدیہ جوان آدمی ہیں۔ وہ پڑھ کر احساس ہوا کہ ہمارے حضرت صاحب جوان ہیں! قدرت نے جوان عمر میں ایک رُعب عطا کیا ہوا تھا جس میں حضور کی جوانی چھپی رہتی۔ آپ کے چہرے پر مسکراہٹ تھی لیکن اس پر سنجیدگی غالب تھی۔ سر پر سفید پٹکا باندھے ہوئے تھے۔ پاؤں میں پمپ شو قسم کی کالی چمکدار گرگابی پہنی ہوئی تھی۔ آپ کا چہرہ، لباس ــ غرضیکہ آپ کا مجموعی تشخص بہت دلکش تھا۔ آپ کو دیکھ کر طبیعت بہت خوش ہوئی اس لئے کہ ہمارے امام یعنی بانیٔ جماعتِ احمدیہ کے بیٹے ہیں اور اپنے باپ کی طرح خوبصورت اور دلکش شخصیت کے مالک۔ یہ احساس آخر وقت تک قائم رہا۔ حضور گاڑی سے اُترے۔ احباب سے مصافحہ کیا اور بے تکلفی سے احباب سے باتیں کرتے رہے۔"

محترم قاضی صاحب نے اپنی فراست اور ذہانت کے نتیجہ میں جو بات اس وقت محسوس کی وہ آپ کی شخصیت کا ایک اہم جزو تھی۔ آپ کے چہرہ کو دیکھ کر اور آپ سے ملاقات کے وقت ملنے والوں کا ذہن کبھی آپ کی عمر کی طرف منتقل نہیں ہوتا تھا بلکہ ملاقاتی براہِ راست ایک ایسی شخصیت کے بحرِ بے کراں میں گم ہو جاتا تھا جو وقت کی قید سے آزاد ہو۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے گزرتے ہوئے وقت کا اس شخصیت سے کوئی تعلق نہیں۔ جوانی میں دیکھنے والوں نے آپ کے پختہ ذہن اور عظیم فکر کے نتیجہ میں کبھی آپ کی جوانی کو محسوس نہ کیا اور بڑی عمر میں ملنے والوں کے دل میں آپ کے پُر ولولہ دل اور بے پناہ قوتِ عمل کے نتیجہ میں کبھی آپ کی بڑی عمر کا خیال پیدا نہ ہوا۔ خود میرا ذہن بھی اپنے بچپن سے لے کر تقسیم ہند کے بعد کے چند سالوں تک کی زندگی میں کبھی بھی آپ کی عمر کی طرف منتقل نہیں ہوا۔ البتہ آپ کی عمر کے آخری چند سالوں میں کچھ تو ہجرت کے صدمہ کی بنا پر اور کچھ ایک قاتلانہ حملہ کی وجہ سے پیدا ہونے والی بیماری کے باعث پہلی مرتبہ گرد و پیش میں بسنے والے اعزّا و اقارب اور احبابِ جماعت نے بڑے دُکھ بھرے تعجب سے یہ امر محسوس کیا کہ آپ کی زندگی بڑھاپے کے دَور میں داخل ہو رہی ہے۔ ۱۹۵۰ء کے بعد کے چند ابتدائی سالوں میں ہمارے چچا حضرت مرزا بشیر احمد رضی اللہ عنہ

نے جنہیں ہم عمّو صاحب کہا کرتے تھے، مجھے خاص طور پر اس طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا کہ یہ عجیب بات ہے کہ پہلی مرتبہ حضرت صاحب پر عمر کے آثار ظاہر ہوئے ہیں۔ پس محترم قاضی صاحب کی یہ روایت اس لحاظ سے بہت دلچسپ ہے کہ حضور کی شخصیت کا یہ پہلو عنفوانِ شباب کے وقت بھی اسی طرح نمایاں تھا۔

جب حضرت صاحبزادہ صاحب بٹالہ پہنچے تو اپنی مقدس والدہ حضرت اُمّ المومنین رضی اللہ عنہا کو بٹالہ میں جو قادیان سے بارہ۱۲ میل مغرب کی طرف واقع ہے، جوشِ محبت میں اپنے استقبال کا منتظر پایا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ نے قادیان میں خاص طور پر آپ کے استقبال کی ہدایت فرمائی۔ دونوں تعلیمی اداروں میں تعطیل کر دی گئی۔ طلباء کے علاوہ سینکڑوں احباب جماعت قادیان سے دو۲ میل دُور نہر پر پیشوائی کے لئے پہنچے ہوئے تھے۔ باوجود ضُعف اور ناتوانی کے حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ بھی بنفسِ نفیس قادیان سے بہت دُور تک پیدل استقبال کے لئے تشریف لے گئے۔ آپ کے اعزاز میں طلباء کی طرف سے ایک شاندار چائے کی دعوت کا اہتمام کیا گیا جس میں حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ نے بھی تقریر فرمائی۔ طلباء نے فرطِ عقیدت میں حضرت خلیفۃ المسیح رضی اللہ عنہ سے گزارش کی کہ ہم نہیں جانتے کہ اپنی بے پناہ خوشی کا اظہار کیسے کریں۔ اس پر حضورؓ نے اظہارِ خوشی کا ایک پاکیزہ ذریعہ انہیں یہ سمجھایا:

> "دعا کرو میاں صاحب کی زندگی بابرکت، مفیدِ خلائق اور خادمِ اسلام ہو۔
> مِل کر یہ دُعا کرو۔ دو۲ رکعت نماز پڑھ کر جنابِ الٰہی کی تعریف اور اپنے استغفار کے بعد۔"

پس جو وجود دُعاؤں کا زادِ راہ لے کر قادیان سے روانہ ہوا تھا اس کی پیشوائی دُعاؤں ہی کے رنگا رنگ گلدستوں اور نیک تمناؤں کے پھول نچھاور کر کے کی گئی۔

باب چہارم

حضرت صاحبزادہ صاحب

کی سیرت کے

چند اور متفرق پہلو

- درسِ قرآن کریم۔
- مجلس انصار اللہ کا قیام اور اس کے شیریں ثمرات۔
- حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے صحابہ سے گہری محبّت۔
- تضرّعات کا رنگ۔
- حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کی آپ سے بلند توقعات اور کامل اعتماد۔
- انتخاب بحیثیت پریذیڈنٹ مجلس مشاورت۔
- تعلیم الاسلام سکول کے جاری رکھنے اور مدرسہ احمدیہ کے قیام میں تاریخی کردار۔
- مدرسہ احمدیہ کی بہبود اور ترقی کیلئے مزید خدمات۔
- ایک غیر از جماعت صحافی کے تاثرات۔

درسِ قرآن کریم

حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب نے اوائل ۱۹۱۱ء سے قرآن کریم کا درس دینا شروع فرمایا۔ اس کے متعلق مدیر "الحکم" نے سلسلہ عالیہ احمدیہ کے متعلق اور خبروں کے ضمن میں لکھا :۔

"آپ (صاحبزادہ صاحب) خدمتِ دین اور اشاعتِ اسلام کا جو جوش اپنے سینے میں رکھتے ہیں وہ اب عملی رنگ اختیار کرتا جاتا ہے اور قوم کے لئے بہت ہی مسرت بخش اور اُمید افزا ہے۔ اللہ تعالےٰ رُوح القدس سے آپ کی مدد کرے اور حضرت امیر المومنین کی تربیت اور دعاؤں کے پھلوں سے اسلام کا بول بالا ہو۔" (الحکم "قادیان" ۱۴ر فروری ۱۹۱۱ء مٹ)

وسط ۱۹۱۳ء سے آپ دن میں دو دفعہ درس دینے لگے۔ یعنی فجر اور ظہر کی نمازوں کے بعد۔ ان درسوں میں اہالیانِ قادیان اور زائرین بڑے ذوق و شوق سے حاضر ہوتے اور علم و معرفت کے اس شیریں چشمہ سے جی بھر کر اپنی پیاس بجھاتے۔

افسوس کہ آپ کے درسِ قرآن کریم کا کوئی ریکارڈ محفوظ نہیں، اس لئے ہم اس کا کوئی نمونہ قارئین کی خدمت میں پیش کرنے سے بصد معذرت قاصر ہیں۔ البتہ سامعین اس درس سے جس حد تک استفادہ کرتے اور محظوظ ہوتے تھے، اس کا کسی قدر تصوّر حسب ذیل اقتباس کو پڑھ کر قائم کیا جا سکتا ہے جو مخدوم محمد ایوب صاحب بی۔ اے (علیگ) نئی دہلی کی ایک مطبوعہ یادداشت سے لیا گیا ہے :۔

"مَیں ۱۹۰۹ء میں سکول سے موسم گرما کی تعطیلات میں قادیان گیا۔ اور حضرت خلیفہ اوّل رضؓ جو میرے والد صاحب مرحوم و مغفور کے ساتھ خاص طور پر اظہارِ محبّت فرمایا کرتے تھے، کے زیر سایہ رہا کرتا تھا اور حضرت صاحب کے درسِ قرآن شریف میں شامل ہُوا کرتا تھا۔ انہی ایّام میں معلوم ہُوا کہ حضرت میاں صاحب (حضرت خلیفۃ المسیح الثانی)

بھی درس فرمایا کرتے ہیں۔ چنانچہ میں بھی وہاں حاضر ہُوا مجھے اس درس میں صرف چند روز ہی شامل ہونے کا موقع ملا۔ حضور نے قرآن کریم کے نہایت ہی اعلیٰ درجہ کے معارف و حقائق بیان فرما کر ایک طرف تو لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ کے مطابق اپنی پاکیزہ زندگی کا ثبوت دیا۔ اور دوسری طرف کسی مشکل مقام قرآن مجید کے معنے معلوم کرنے کے لئے کوشش کرنے اور پھر سمجھنے کے لئے دعائیں کرنے اور پھر اس کا حل پانے کا ذکر فرما کر اپنے عشقِ قرآن شریف اور تعلق باللہ کا ثبوت دیا۔

الغرض اس قلیل عرصہ میں مجھ پر حضور کے عشق و فہم قرآن کریم طہارت و تقویٰ، تعلق باللہ، اجابتِ دُعا اور مطہر زندگی کا گہرا اثر ہُوا جو کہ باوجود مُرورِ زمانہ کے دِل سے ہرگز دُور نہیں ہُوا۔ اور یہی اثر تھا جو کہ بفضلہٖ تعالیٰ حضور کو خلیفہ برحق ماننے میں کام آیا۔ الحمد للہ علیٰ ذٰلک یہ اس وقت کی بات ہے جس کو اب انتیس ۲۹ سال گزر چکے ہیں۔ اور اب تو ماشاء اللہ حضور کا علم ایک بحرِ بے پایاں معلوم ہوتا ہے جس کا کچھ اندازہ ہی نہیں اور حضور کا ہر ایک خطبہ بلکہ ہر ایک تقریر و تحریر اپنے اندر ایک ایسی جدت اور شان رکھتی ہے کہ جس کی نظیر صفحۂ ہستی پر ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی۔"[1]

---

[1] الفضل قادیان ۳ر دسمبر ۱۹۴۳ء

مجلس انصار اللہ کے شیریں ثمرات

ذکر گزر چکا ہے کہ حضرت صاحبزادہ صاحب نے ایک رویا سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے ایک دینی انجمن "مجلس انصار اللہ" کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس انجمن کو حضرت صاحبزادہ صاحب نے جن احسن خطوط پر استوار کیا اور جس طرح ان کوششوں کو شیریں پھل لگے اُن کا یہاں کچھ تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱۶ را پریل ۱۹۱۱ء کو اس انجمن کا افتتاحی جلسہ قادیان میں منعقد ہوا۔ حضرت صاحبزادہ صاحب نے اس جلسہ میں ایک ولولہ انگیز تقریر فرمائی۔ اور ممبروں کو متعدد ہدایات دیں۔ مثلاً یہ کہ وہ تبلیغی لیکچر دینے کے لئے بہت مشق کریں۔ چھٹیاں لے کر مرکز میں آئیں۔ ہر روز تبلیغ کے لئے کچھ نہ کچھ وقت دیں خواہ پانچ منٹ کے لئے ہی سہی۔ انصار کثرت سے باہم ملاقات کریں۔ کسی شہر میں جائیں تو وہاں کے انصار کو تلاش کر کے ملیں۔ اگر ریل میں سفر کر رہے ہوں تو جو اسٹیشن راستے میں آتے ہوں وہاں کے انصار کو اطلاع دیں۔ انصار سفر میں حتی الوسع انصار ہی کے پاس ٹھہریں۔ ملیں تو صحابہ کی طرح دینی گفتگو کر کے ایمان تازہ کریں۔ انصار کے لئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ اور علمائے سلسلہ کی بعض خاص کتابوں کا پڑھنا بھی لازمی قرار دیا گیا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کی سرپرستی اور حضرت صاحبزادہ صاحب کی قیادت نے انجمن انصار اللہ کے ممبروں میں زندگی کی ایک لہر دوڑا دی۔ اور اسلام اور احمدیت کی تبلیغ کا کام جس میں سستی آ گئی تھی بڑی تیز رفتاری کے ساتھ شروع ہو گیا۔ جولائی ۱۹۱۲ء تک اس کے ممبروں کے ذریعہ دو تین سو آدمی سلسلہ احمدیہ میں داخل ہوئے اور یہ سلسلہ اسی طرح بعد میں بھی جاری رہا۔ انجمن نے جماعت میں مبلغینِ اسلام کی ایک جمعیت تیار کر دی جس نے آئندہ چل کر جماعت احمدیہ کی ترقی و اشاعت میں بڑا بھاری حصہ لیا۔ انجمن نے اپنے خرچ پر ایک ممبر چوہدری فتح محمد صاحب سیال کو انگلستان بھجوایا۔ علاوہ ازیں شیخ عبدالرحمان صاحب نومسلم اور سید زین العابدین ولی اللہ شاہ صاحب تعلیم و تبلیغ کی خاطر مصر بھیجے گئے۔[1]

۱۹۱۲ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ لندن میں جماعت احمدیہ کا ایک مضبوط مشن ہونا چاہیئے جس کے لئے آپ نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو تحریک فرمائی۔

---

[1] "الحکم" جوبلی نمبر ۱۹۳۹ء صـ ۲۷

چنانچہ چوہدری فتح محمد صاحب سیال جنہوں نے انہی دنوں ایم۔اے کا امتحان پاس کیا تھا اور مولوی محمد الدین صاحب بی۔ اے نے اپنے آپ کو اس خدمت کیلئے پیش کر دیا۔ حضرت خلیفۃ اوّل رضی اللہ عنہ نے جناب مولوی محمد علی صاحب سیکرٹری صدر انجمن احمدیہ سے فرمایا :۔

"آپ تو کہتے تھے کوئی نوجوان جانے کو تیار نہیں۔ میرے پاس تو ایک کی بجائے دو ۲ نوجوانوں کی درخواستیں آگئی ہیں" [1]

اس پر مولوی محمد علی صاحب نے حضرت خلیفۃ اوّل رضی اللہ عنہ کی خدمت میں یہ رپورٹ پیش کی کہ یہ نوجوان دس دس ہزار روپیہ پیشگی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ لیکن چوہدری فتح محمد صاحب سیال نے عرض کیا کہ یہ تجویز خود مولوی صاحب کی ہے ہمارا کوئی مطالبہ نہیں ہے چوہدری صاحب نے پورا واقعہ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیرالدین محمود احمد صاحب سے بیان کیا۔ آپ نے فرمایا مجلس انصار اللہ کا چندہ جو ممالکِ غیر میں تبلیغ کے لئے جمع ہے وہ میں آپ کو دیتا ہوں لیکن میرا اس طرح خود دینا دُرست نہیں۔ تبرّک اور ادب کا تقاضا یہ ہے کہ میں رقم ابھی حضرت خلیفۃ اوّل رضؓ کو بھجوا دیتا ہوں۔ آپ حضور کے مطب میں جا کر انتظار کریں۔ چنانچہ محترم چوہدری صاحب مطب میں حضرت خلیفۃ اوّلؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور روپیہ کا انتظار کئے بغیر عرض کیا کہ حضور میں لندن جا رہا ہوں۔ حضور نے فرمایا کرایہ کا کیا انتظام ہے؟ ابھی آپ یہ کہہ ہی رہے تھے کہ ایک خادم رومال میں تین سو روپیہ لے کر پہنچ گیا۔ حضرت نے یہ رقم بڑی خوشی کے ساتھ چوہدری صاحب کے حوالے کر دی۔ وہاں اُس وقت حضرت میر ناصر نواب صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ انہوں نے بھی ایک سو پانچ روپے حضرت کی خدمت میں پیش کئے۔ علاوہ ازیں بعض اَور دوستوں نے بھی چندہ دیا لیکن یہ سب رقم سات سو سے کم رہی۔ ایک سو پانچ روپے حضرت خلیفۃ اوّلؓ کی فہمائش پر صدر انجمن احمدیہ کی طرف سے دیئے گئے۔

جنوری ۱۹۱۴ء میں حضرت صاحبزادہ صاحب نے حضرت خلیفۃ المسیحؓ کی اجازت سے پُرسوز دُعاؤں اور اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزانہ اِلتجاؤں کے ساتھ ہندوستان بھر میں تبلیغِ اسلام کے لئے ایک سکیم تیار کی جس کے بعض حصے یہ تھے :۔

- ہندوستان کے تمام شہروں اور قصبوں میں خاص طور پر جلسے کئے جائیں۔
- مختلف مقامات میں واعظ مقرر کئے جائیں۔
- ہر زبان میں ٹریکٹ شائع ہوں۔
- مناسب مقامات پر سکول کھولے جائیں۔

---

[1] الفضل ۲۵ر دسمبر ۱۹۵۶ء

اس سکیم کی تکمیل کے لئے جن اصحاب نے خاص طور پر آپ کی آواز پر لبیک کہا اُن میں سے

- مولوی غلام رسول صاحب راجیکی رضؓ
- مولوی سید سرور شاہ صاحبؓ
- سیّد صادق حسین صاحبؓ اٹاوہ
- میر قاسم علی صاحبؓ
- ڈاکٹر حشمت اللہ خان صاحبؓ
- چوہدری عبداللہ خان صاحبؓ داتہ زیدکا
- بابو عبدالحمید صاحب آڈیٹر
- میاں نور الدین صاحبؓ تاجر قادیان

اور میاں محمد شریف صاحب پلیڈر چیف کورٹ، قابل ذکر ہیں۔

اس سلسلہ میں حضرت صاحبزادہ صاحب نے جماعت کو جھنجھوڑتے ہوئے لکھا:۔

"میں حیران ہوں کہ ہیں سوتوں کو جگانے اور جاگتوں کو ہوشیار کرنے کے لئے کونسی راہ اختیار کروں۔ میں ششدر ہوں کہ تمہارے دلوں میں کس طرح وہ آگ لگا دوں جو میرے دل میں لگ رہی ہے۔ لکڑیوں کو جلانے کے لئے دیا سلائیاں ہیں۔ بڑے بڑے جنگل ایک دیا سلائی سے جل سکتے ہیں۔ مگر دلوں کو گرم کرنے کے لئے دنیا نے کوئی سامان ایجاد نہیں کیا۔ جس سے کام لے کر میں تمہارے دلوں میں حرارت پیدا کر دوں۔ دلوں کا پھیرنا خدا تعالیٰ کے ہی اختیار میں ہے اور اسی سے دعا کر کے میں نے یہ سکیم پیش کی ہے۔ اور اسی کے حضور میں اب گرتا ہوں کہ وہ میری آواز کو مؤثر بنائے اور پاک دلوں میں اس کے لئے قبولیت پیدا کرے۔"[1]

---

[1] الفضل ۱۰ر جنوری ۱۹۱۴ء

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے صحابہ سے آپ کی گہری محبّت

حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب بعد کے زمانہ میں کبھی کبھی لطیفہ کے طور پر حسب ذیل شعر سنایا کرتے تھے ؎

تمہیں چاہوں تمہارے چاہنے والوں کو بھی چاہوں
میرا دل پھیر دو، مجھ سے یہ جھگڑا ہو نہیں سکتا

مگر آپ کے بچپن کا ایک واقعہ اس شعر میں ملبوس جذبات کے بالکل برعکس تصویر پیش کرتا ہے۔ آپ جسے چاہتے تھے اس کے چاہنے والوں کو بھی چاہتے تھے۔ اس کے خدام اور فدائیوں سے بھی گہری محبت کرتے تھے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے آپ کی محبّت اور عشق کا یہ عالم تھا کہ جتنا جتنا کسی کو آپ کے قریب پایا، اسی قدر اس کی طرف کھنچتے چلے گئے۔

آپ کی محبّت کا رُخ متعیّن کرنے میں یہ اصل کبھی شعوری طور پر اور کبھی غیر شعوری طور پر بے خطا کام کرتا تھا۔ اسی ضمن میں مندرجہ ذیل واقعہ دلچسپ مطالعہ کا مواد پیش کرتا ہے:-

"مولوی عبد الکریم صاحب بیمار ہوئے ... ایک دفعہ یخنی لے کر میں مولوی صاحب کے لئے گیا تھا۔ اس کے سوا یاد نہیں کہ کبھی گیا ہوں۔ اس زمانہ کے خیالات کے مطابق یقین کرتا تھا کہ مولوی صاحب فوت نہیں ہو سکتے ... مولوی عبد الکریم صاحب کی طبیعت تیز تھی۔ ایک دو سبق اُن کے پاس الف لیلیٰ کے پڑھے پھر چھوڑ دیئے۔ اس سے زائد اُن سے تعلق نہ تھا۔ ہاں اُن دنوں میں یہ بحثیں خوب ہوا کرتی تھیں کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا دایاں فرشتہ کونسا ہے اور بایاں کونسا؟ بعض کہتے مولوی عبدالکریم صاحب دائیں ہیں، بعض حضرت اُستاذی المکرم خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کی نسبت کہتے کہ وہ دائیں فرشتے ہیں۔ علموں

اور کاموں کا موازنہ کرنے کی اس وقت طاقت نہ تھی اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اسی محبت کی وجہ سے جو خلیفۂ اوّل مجھ سے کیا کرتے تھے میں نورالدینیوں میں سے تھا۔ ہم نے ایک دفعہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے بھی دریافت کیا اور آپ نے ہمارے خیال کی تصدیق کی۔ غرض مولوی عبدالکریم صاحب سے کوئی زیادہ تعلق مجھے نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ میں اُن کے پُرزور خطبوں کا مدّاح تھا اور ان کی محبت اور اُن کی حُبِ مسیح موعودؑ کا معتقد تھا مگر جونہی آپ کی وفات کی خبر مَیں نے سُنی، میری حالت میں ایک تغیر پیدا ہوگیا۔ وہ آواز ایک بجلی تھی جو میرے جسم کے اندر سے گزر گئی۔ جس وقت میں نے آپ کی وفات کی خبر سُنی مجھ میں برداشت کی طاقت نہ رہی۔ دوڑ کر اپنے کمرہ میں گھس گیا اور دروازہ بند کرلیا۔ پھر ایک بے جان لاش کی طرح چارپائی پر گر گیا۔ اور میری آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔ وہ آنسو نہ تھے ایک دریا تھا۔ دنیا کی بے ثباتی، مولوی صاحب کی محبتِ مسیح اور خدمتِ مسیح کے نظارے آنکھوں کے سامنے پھرتے تھے۔ دل میں بار بار خیال آتا تھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے کاموں میں یہ بہت سا ہاتھ بٹاتے تھے۔ اب آپ کو بہت تکلیف ہوگی۔ اور پھر خیالات پر ایک پردہ پڑ جاتا تھا اور میری آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہنے لگتا تھا۔ اُس دن نہ میں کھانا کھا سکا نہ میرے آنسو تھمے حتّٰی کہ میری لاابالی طبیعت کو دیکھتے ہُوئے میری اس حالت پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو بھی تعجب ہُوا اور آپ نے حیرت سے فرمایا کہ:

"محمود کو کیا ہوگیا ہے۔ اس کو تو مولوی صاحب
سے کوئی ایسا تعلق نہ تھا یہ تو بیمار ہو جائے گا۔"

خیر مولوی عبدالکریم صاحب کی وفات نے میری زندگی کے ایک نئے دَور کو شروع کیا۔ اسی دن سے میری طبیعت میں دین کے کاموں اور سلسلہ کی ضروریات میں دلچسپی پیدا ہونی شروع ہُوئی اور وہ بیج بڑھتا

ہی چلا گیا۔ سچ یہی ہے کہ کوئی دنیاوی سبب حضرت اُستاذی المکرم مولوی نورالدین صاحب رضی اللہ عنہ کی زندگی اور حضرت مولوی عبدالکریم صاحب کی وفات سے زیادہ میری زندگی میں تغیّر پیدا کرنے کا مُوجب نہیں ہُوا۔ مولوی عبدالکریم صاحب کی وفات پر مجھے یُوں معلوم ہُوا گویا اُن کی رُوح بھی مجھ پر آپڑی"۔ [1]

---

[1] "الحکم" جوبلی نمبر دسمبر ۱۹۳۹ء

تضرّعات کا رنگ

حضرت صاحبزادہ مرزا محمود احمد صاحب نے تشحیذ الاذہان میں ایک مضمون رقم فرمایا جو ماہِ رمضان کے متعلق تھا۔ آپ نے اس مضمون میں رمضان کی برکات کا ذکر کرنے کے بعد لکھا:۔

"میں رسالہ تشحیذ الاذہان کے لئے اپنی میز میں سے ایک مضمون تلاش کر رہا تھا کہ مجھے ایک کاغذ ملا جو میری ایک دُعا تھی جو میں نے پچھلے رمضان میں کی تھی۔ مجھے اس دُعا کے پڑھنے سے زور سے تحریک ہوئی کہ اپنے احباب کو بھی اس طرف متوجہ کروں نہ معلوم کس کی دُعا سُنی جائے اور خدا کا فضل کس وقت ہماری جماعت پر ایک خاص رنگ میں نازل ہو۔ میں اپنا دردِ دل ظاہر کرنے کے لئے اس دُعا کو یہاں نقل کر دیتا ہوں کہ شاید کسی سعید الفطرت کے دِل میں جوش پیدا ہو۔ اور وہ اپنے ربّ کے حضور میں اپنے لئے اور جماعت احمدیہ کے لئے دعاؤں میں لگ جائے جو کہ میری اصل غرض ہے۔ وہ دُعا یہ ہے:۔

"اے میرے مالک میرے قادر خُدا۔ میرے پیارے مولیٰ میرے راہنما۔ اے خالقِ ارض و سما۔ اے متصرف آب و ہَوا۔ اے وہ خدا جس نے آدم سے لے کر حضرت عیسیٰ تک لاکھوں ہادیوں اور کروڑوں رہنماؤں کو دُنیا کی ہدایت کے لئے بھیجا۔ اے وہ علی و کبیر جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسا عظیم الشان رسول مبعوث کیا۔ اے وہ رحمان جس نے مسیح سا رہنما آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں میں پیدا کیا۔ اے نُور کے پیدا کرنے والے اے ظلمات کے مٹانے والے! تیرے حضور میں ہاں صرف تیرے ہی حضور میں مُجھ سا ذلیل بندہ جُھکتا اور عاجزی کرتا ہے کہ میری صدا سُن اور قبول کر کیونکہ تیرے ہی وعدوں نے مجھے جرأت دلائی ہے کہ

میں تیرے آگے کچھ عرض کرنے کی جرأت کروں۔ میں کچھ نہ تھا تُونے مجھے بنایا۔ میں عدم میں تھا تُو مجھے وجود میں لایا۔ میری پرورش کیلئے اربعہ عناصر بنائے اور میری خبرگیری کے لئے انسان کو پیدا کیا جب میں اپنی ضروریات کو بیان تک نہ کرسکتا تھا تُونے مجھ پر وہ انسان مقرر کئے جو میری فکر خود کرتے تھے۔ پھر مجھے ترقی دی اور میرے رزق کو وسیع کیا۔ اے میری جان! ہاں اے میری جان! تُو نے آدم کو میرا باپ بننے کا حکم دیا اور حوّا کو میری ماں مقرر کیا۔ اور اپنے غلاموں میں سے ایک غلام کو جو تیرے حضور عزّت سے دیکھا جاتا تھا اس لئے مقرر کیا کہ وہ مجھ سے ناسمجھ اور نادان اور کم فہم انسان کے لئے تیرے دربار میں سفارش کرے اور تیرے رحم کو میرے لئے حاصل کرے۔ میں گناہ گار تھا تونے ستّاری سے کام لیا۔ میں خطاکار تھا تُونے غفّاری سے کام لیا۔ ہر ایک تکلیف اور دُکھ میں میرا ساتھ دیا جب کبھی مجھ پر مصیبت پڑی تونے میری مدد کی اور جب کبھی میں گمراہ ہونے لگا تونے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ باوجود میری شرارتوں کے تو نے چشم پوشی کی۔ اور باوجود میرے دُور جانے کے تو میرے قریب ہُوا۔ میں تیرے نام سے غافل تھا مگر تونے مجھے یاد رکھا۔ ان موقعوں پر جہاں والدین اور عزیز و اقربا اور دوست و غمگسار مدد سے قاصر ہوتے ہیں تونے اپنی قدرت کا ہاتھ دکھایا اور میری مدد کی۔ میں غمگین ہُوا تو تُونے مجھے خوش کیا۔ میں افسردہ دل ہُوا تو تُونے مجھے شگفتہ کیا میں رویا تو تُونے مجھے ہنسایا۔ کوئی ہوگا جو فراق میں تڑپتا ہو مجھے تو تُونے خود ہی چہرہ دکھایا۔ تونے مجھ سے وعدے کئے اور پُورے کئے اور کبھی نہیں ہُوا کہ تجھ سے اپنے اقراروں کے پورا کرنے میں کوتاہی ہُوئی ہو۔ مَیں نے بھی تجھ سے وعدے کئے اور توڑے مگر تُونے اسکا کچھ خیال نہیں کیا۔ میں نہیں دیکھتا کہ مجھ سے زیادہ گناہ گار کوئی اور بھی ہو اور میں نہیں جانتا کہ مجھ سے زیادہ مہربان تُو کسی اَور گنہگار پر بھی ہو۔

تیرے جیسا شفیق وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا۔ جب میں تیرے حضور میں آکر گڑگڑایا اور زاری کی تُو نے میری آواز سُنی اور قبول کی۔ میں نہیں جانتا کہ تُو نے کبھی میری اضطرار کی دُعا رَد کی ہو۔ پس اے میرے خدا! میں نہایت دردِ دل سے اور سچی تڑپ کے ساتھ تیرے حضور میں گرتا اور سجدہ کرتا ہوں اور عرض کرتا ہوں کہ میری دُعا کو سُن اور میری پُکار کو پہنچ۔ اے میرے قدوس خدا! میری قوم ہلاک ہو رہی ہے۔ اسے ہلاکت سے بچا۔ اگر وہ احمدی کہلاتے ہیں تو مجھے اُن سے کیا تعلق، جب تک اُن کے دل اور سینے صاف نہ ہوں اور وہ تیری محبت میں سرشار نہ ہوں۔ مجھے اُن سے کیا غرض؟ سو اے میرے ربّ! اپنی صفاتِ رحمانیت اور رحیمیت کو جوش میں لا۔ اور اُن کو پاک کر دے۔ صحابہ کا سا جوش و خروش اُن میں پیدا ہو۔ اور وہ تیرے دین کے لئے بے قرار ہو جائیں، اُن کے اعمال اُن کے اقوال سے زیادہ عُمدہ اور صاف ہوں۔ وہ تیرے پیارے چہرہ پر قربان ہوں اور نبی کریمؐ پر فدا۔ تیرے مسیح کی دعائیں اُن کے حق میں قبول ہوں اور اس کی پاک اور سچی تعلیم اُن کے دِلوں میں گھر کر جائے۔ اے میرے خدا میری قوم کو تمام ابتلاؤں اور دُکھوں سے بچا اور قسم قسم کی مصیبتوں سے انہیں محفوظ رکھ۔ ان میں بڑے بڑے بزرگ پیدا کر۔ یہ ایک قوم ہو جائے جو تُو نے پسند کر لی ہو۔ اور یہ ایک گروہ ہو جس کو تُو .... اپنے لئے مخصوص کرے۔ شیطان کے تسلّط سے محفوظ رہیں اور ہمیشہ ملائکہ کا نزول اُن پر ہوتا رہے۔ اس قوم کو دین و دنیا میں مبارک کر، مبارک کر۔ آمین ثم آمین یا ربّ العالمین۔"

اس کے بعد میں اپنے لئے، اپنے بھائیوں کے لئے، اپنی والدہ کے لئے، اپنی ہمشیروں کے لئے، اپنے دوستوں کے لئے اور اُن لوگوں کے لئے جن کا نام نیچے لکھتا ہوں، دُعا کرتا ہوں اور نہایت عاجزی سے دُعا کرتا ہوں۔ کہ ہم کو دین و دُنیا میں مبارک کر، نیک کر، پاک کر۔

اپنے لئے چُن لے' ہدایت کا پھیلانے والا بنا۔ اسلام کا خادم بنا۔ اور صحت و پاک عُمر عطا فرما۔ ہم اسلام پر مریں اور تُو ہماری وفات کے وقت ہم پر خوش ہو۔ اور ہماری عمر تیری ناراضگی سے پاک ہو۔ پھر میں خاص طور سے خلیفۃ وقت کے لئے دُعا کرتا ہوں کہ اے میرے ربّ! اُن کے علم وفضل میں ترقی دے اُن کو اپنے کام میں کامیاب کر اور ہر قسم کے دُکھوں سے بچا' اُن کی تدابیر میں برکت ڈال اور اُن راہوں پر چلا جو اسلام کی ہوں۔

میری اس دعا کو اِس جگہ نقل کرنے سے یہ غرض ہے کہ شاید کوئی نیک رُوح فائدہ اُٹھائے اور اس مبارک مہینہ میں خاص طور سے جماعت احمدیہ اور اسلام کی ترقی کے لئے دعاؤں میں لگ جائے۔ میں آخر میں پھر اپنے احباب پر زور دیتا ہوں کہ اس وقت کو ضائع مت کرو۔ رات کو خدا کے حضور چلاؤ اور دِن کو صدقہ کرو۔ یہ ایک ایسی تدبیر ہے کہ اگر تم میں سے ایک جماعت سچے دِل سے ایسا کرنے والی نکل آئے تو خدا اپنے پاک کلام میں کامیابی کا وعدہ دیتا ہے۔ پس کون بدبخت ہے؟ جس کو خدا کے وعدوں پر اعتبار نہ ہو۔ خدا کرے کہ ہم لوگوں میں وحدت پیدا ہو اور ہم کو نیک اعمال اور دعاؤں کی توفیق ملے اور ظُلمت کے دن دُور ہو کر اسلام کا نورانی چہرہ دُنیا پر ظاہر ہو۔ آمین یا ربّ العالمین

خاکسار مرزا محمود احمد"[1]

---

[1] تشحیذالاذہان ستمبر ۱۹۰۹ء صفحہ ۳۲۸ تا صفحہ ۳۳۱

حضرت اقدس خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ

کی صاحبزادہ صاحب سے بلند توقعات اور کامل اعتماد

حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کے دَورِ خلافت میں آپ نے اپنے محبوب اور مطاع امام سے جو کامل خلوص اور وفا کا تعلق رکھا اس سے حضرت خلیفۃ المسیح رضؓ پوری طرح آگاہ تھے اور مخالفین کی ریشہ دوانیوں کے باوجود ایک لمحہ کے لئے بھی کبھی حضرت صاحبزادہ صاحب کے بارہ میں آپ کا دِل میلا نہ ہُوا بلکہ روز بروز آپ پر حضرت کا اعتماد بڑھتا رہا اور توقعات بلند تر ہوتی چلی گئیں۔ جب حضور باہر تشریف لے جاتے تو بسا اوقات صاحبزادہ صاحب ہی کو امام الصلوٰۃ اور امیر مقامی مقرر فرماتے۔ اسی طرح علالتِ طبع کی صورت میں بھی حضور حضرت صاحبزادہ صاحب کو امام الصلوٰۃ مقرر فرمانے لگے۔ اور کئی مرتبہ اپنی موجودگی میں بھی نمازِ جمعہ کی امامت کا ارشاد فرمایا۔ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں آپ نے پہلی دفعہ نمازِ جمعہ ۲۹ رجولائی ۱۹۱۱ء کو پڑھائی۔ اور خطبہ جمعہ میں آپ نے آیت اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ کی ایسی لطیف تفسیر بیان فرمائی کہ حضرت خلیفۃ المسیح رضؓ بہت ہی محظوظ و مسرور ہوئے اور بڑے پیار سے فرمایا:-

"میاں صاحب نے لطیف سے لطیف خطبہ سُنایا۔ وہ اَور بھی الطف ہو گا۔ اگر تم اس پر غور کرو گے۔ میں اس خطبہ کی بہت قدر کرتا ہوں، اور یقیناً کہتا ہوں کہ وہ خطبہ عجیب سے عجیب نکات اپنے اندر رکھتا ہے"[1]

حضور رضی اللہ عنہ کا یہ اعتماد اور الطاف بعض بااثر اور بارسُوخ دوستوں کو جو اپنے تئیں عالم فاضل اور معزز شمار کرتے تھے اور ظاہری علم اور عمر کے تفاوت کے باعث صاحبزادہ صاحب کو تخفیف کی نگاہ سے دیکھتے تھے ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت خلیفۃ المسیح رضؓ کی علالت کے موقع پر حضرت صاحبزادہ صاحب کے امام الصلوٰۃ مقرر فرمائے جانے پر جناب مولوی محمد علی صاحب نے حافظ روشن علی رضؓ صاحب سے کہا کہ آپ حضرت خلیفۃ المسیح سے بے تکلف ہیں۔ میرا نام لئے بغیر حضور سے عرض کریں کہ جماعت کے بڑے بڑے جید عالم موجود ہیں اُن کی موجودگی میں میاں صاحب کو امام مقرر کرنا مناسب نہیں۔ اس پر بعض دوست اعتراض کرتے

---

[1] الحکم ۲۸ر اکتوبر ۱۹۱۱ء

ہیں۔ محترم حافظ صاحب نے اسی طرح حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کی خدمت میں عرض کر دیا۔ آپ نے فرمایا۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ مجھے محمود جیسا ایک بھی متقی نظر نہیں آتا۔ پھر فرمایا کیا میں مولوی محمد علی صاحب سے کہوں کہ وہ نماز پڑھایا کریں ؟" [1]

انتخاب بحیثیت پریذیڈنٹ مجلس مشاورت

"۱۹۱۰ء میں جلسہ سالانہ مارچ میں ہُوا۔ اس موقع پر احمدیہ کانفرنس کے نام سے مجلس مشاورت ہُوئی۔ اس کانفرنس کے پریذیڈنٹ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب بالاتفاق مقرر ہُوئے۔ اور بعض مضامین پر ایک دلچسپ مباحثہ ہُوا جس سے معلوم ہُوا کہ قومی کاموں سے دلچسپی کا مذاق بڑھ رہا ہے۔" [2]

تعلیم الاسلام سکول کے جاری رکھنے اور مدرسہ احمدیہ کے قیام میں حضرت صاحبزادہ صاحب کا تاریخی کردار

غالباً ۱۹۰۵ء کا واقعہ ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے احباب سے مشورہ طلب فرمایا کہ مدرسہ تعلیم الاسلام کو قائم کرنے کی جو غرض تھی اسے یہ مدرسہ پُورا کر رہا ہے کہ نہیں۔ اس پر مدرسہ کی انتظامیہ نے بعض مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے مدرسہ کو توڑ دینے کا مشورہ دیا۔ اور اس پر بڑا اصرار کیا۔ باوجود اس کے کہ اُس وقت حضرت صاحبزادہ صاحب کی عمر صرف ۱۶ برس تھی۔ آپ کی رائے بڑی عمر کے صاحب تجربہ منتظمین کی نسبت زیادہ پُختہ اور باوزن ثابت ہوئی۔ آپ نے اس بات کی بڑے مؤثر رنگ میں وکالت فرمائی کہ یہ مدرسہ بہر حال قائم رہنا چاہیئے۔ اور مشکلات پر دوسرے ذرائع سے قابو پایا جا سکتا ہے۔ آپ کے اس موقف پر آپ کی مخالف رائے رکھنے والے بعض

---

[1] الفضل ۱۹ر جنوری ۱۹۴۰ء [2] الحکم ۲۸ر مارچ / ۷ر اپریل ۱۹۱۰ء صفحہ ۱۴

دوستوں نے آپ کو انگریزیت کا دلدادہ ہونے کا طعنہ بھی دیا۔ لیکن آپ اپنی رائے کی اصابت پر مصر رہے۔ چونکہ حضرت حکیم مولوی نورالدین صاحب رضی اللہ عنہ کی رائے بھی آپ ہی کے موافق تھی لہٰذا حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اِن دونوں کی رائے کو ترجیح دی اور بعض تبدیلیوں کے ساتھ مدرسہ تعلیم الاسلام کو قائم رکھنے کا فیصلہ فرمایا۔ [1]

انہی دنوں مدرسہ احمدیہ کی بنیاد بھی پڑی۔ اس کی تقریب یوں پیدا ہوئی کہ ۱۹۰۵ء میں سلسلہ کے دو زبردست عالم حضرت مولوی عبدالکریم صاحب سیالکوٹیؓ اور حضرت مولوی بُرہان الدّین صاحب جہلمیؓ وفات پا گئے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو اُن کی وفات کا دُوہرا صدمہ پہنچا۔ کچھ تو اس لئے کہ یہ دونوں اپنے تقویٰ، علم و فضل اور اسلام کے لئے ہمہ تن جاں نثاری میں بہت بلند مقام رکھتے تھے اور کچھ اس لئے کہ اتنے بلند پایہ علماء کی وفات سے ایک ایسا علمی خلاء پیدا ہُوا جسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اس پہلو سے تشویش کا اظہار کرتے ہُوئے آپ نے فرمایا کہ "جماعت میں سے اچھے اچھے لوگ مرتے جاتے ہیں مگر افسوس جو مرتے ہیں اُن کا جانشین ہم کو کوئی نظر نہیں آتا۔ مدرسہ تعلیمُ الاسلام کے متعلق فرمایا مجھے مدرسہ کی طرف دیکھ کر بھی رنج ہی پہنچتا ہے کہ جو کچھ ہم چاہتے تھے، وہ بات اس سے حاصل نہیں ہوئی۔ اگر یہاں سے بھی طالب علم نکل کر دُنیا کے طالب بننے تھے تو ہمیں اس کے قائم کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ دین کے خادم پیدا ہوں۔ چنانچہ تعلیمِ دین کی اس کمی کے پیش نظر آپ نے ارادہ ظاہر فرمایا کہ جماعت میں قادرُ الکلام اور خدمتِ دین کرنے والے علماء پیدا کرنے کا کوئی مستقل انتظام ہونا چاہیئے اور مدرسہ تعلیم الاسلام میں ایسی اصلاح ہونی چاہیئے کہ یہاں سے واعظ اور علماء پیدا ہوں۔ حضورؑ نے اس کے لئے احباب سے مشورہ کیا اور آخر طے پایا کہ فی الحال مدرسہ تعلیم الاسلام کی نگرانی میں ہی دینیات کی ایک شاخ کھول دی جائے۔ چنانچہ جنوری ۱۹۰۶ء میں یہ شاخ کھُل گئی اور اس طرح اس کلاس کے اجراء سے پہلی دفعہ مدرسہ احمدیہ کی بُنیاد پڑی۔ [2]

حضرت خلیفۃُ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت کے آغاز ہی میں

---

[1] الفضل یکم مئی ۱۹۲۸ء [2] مکتوبات احمدیہ جلد نمبر ۲ صفحہ ۶۵، تاریخ احمدیت جلد ۳ صفحہ ۴۲۷، رسالہ تعلیم الاسلام جلد اوّل صفحہ ۲۰۰

بشدت یہ محسوس فرمایا کہ چونکہ مدرسہ کے قیام سے حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کی اوّلین خواہش یہ تھی کہ اعلےٰ پایہ کے علمائے ربانی پیدا ہوں اور اس وجہ سے دینی علوم کی تدریس کے لئے ایک الگ شاخ تعلیم الاسلام سکول میں قائم کی گئی تھی، لہٰذا اس غرض کو باحسن پورا کرنے کے لئے ایک باقاعدہ علیحدہ درس گاہ کا قیام زیادہ مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اس غرض سے آپ نے ایک سب کمیٹی مقرر فرمائی جو حضرت صاحبزادہ مرزا محمود احمد صاحب، نواب محمد علی خان صاحب، مولوی محمد علی صاحب اور مولوی سید محمد سرور شاہ صاحب پر مشتمل تھی۔ اس سب کمیٹی کے سپرد اس نئے دینی مدرسہ کے لئے قواعد وضوابط اور لائحہ عمل تجویز کرنے کے علاوہ جملہ اخراجات کے لئے روپیہ کا انتظام کرنا بھی تھا۔ حضرت صاحبزادہ صاحب اور بعض دوسرے احباب نے حضورؓ کی اس تجویز کو پورے زور اور بڑی وضاحت کے ساتھ جماعت کے سامنے پیش کیا اور لکھا کہ یہ مدرسہ دنیا میں اشاعتِ اسلام کا ایک بھاری ذریعہ ہوگا اور اس کے چلانے کے لئے موزوں عمارت اور بہترین لائبریری کا ہونا ضروری ہے۔[۱]

ذرا زمانہ کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمایئے کہ وہی بزرگان جو کل تک اس نوجوان کو انگریزیت کا طعنہ دے کر تعلیم الاسلام سکول کو بند کر دینے کے مشورے دے رہے تھے، اس واقعہ کے چند سال بعد ہی نیرنگِ زمانہ سے ایسے بدلے کہ اب اس نوجوان کی محض اس بنا پر مخالفت کرنے لگے کہ یہ ایک خالص دینی مدرسہ کے قیام کے لئے کوشاں ہے۔ چنانچہ ۱۵ر نومبر ۱۹۰۸ء کو صدر انجمن احمدیہ کا ایک اجلاس لاہور میں جناب شیخ رحمت اللہ صاحب کے مکان پر منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں حضرت صاحبزادہ صاحب کو جو انجمن کے ممبر بلکہ میرِ مجلس تھے، مدعو نہیں کیا گیا۔ بہرحال صدر انجمن نے اپنے اس اجلاس میں بلا کسی خاص وجہ کے اپنے سابقہ فیصلہ کے بالکل برعکس یہ ریزولیوشن پاس کیا کہ اس مجلس کی رائے میں عربی مدرسہ کے لئے بغیر وظیفہ کے طالب علموں کا ملنا مشکل معلوم ہوتا ہے اور اس طرح پر مقصد دینی مدرسہ کا حاصل نہیں ہو سکتا، بہتر معلوم ہوتا ہے کہ احمدی طلباء کو اعلیٰ درجہ کی مروجہ تعلیم وظائف دے کر دلائی جائے یا ان کو خاص طور پر ڈاکٹری کے لئے تیار کیا جاوے ... وغیرہ وغیرہ

حسبِ قرار داد یہ معاملہ ۲۶ر دسمبر ۱۹۰۸ء بوقت شب انجمن ہائے احمدیہ کی کانفرنس کے

---

[۱] بدر قادیان ۱۸ر جون ۱۹۰۸ء، تاریخ احمدیت جلد ۴ صفحہ ۲۳

اجلاس میں پیش کیا گیا۔ کانفرنس کے اس اجلاس کی اطلاع بھی حضرت صاحبزادہ مرزا بشیرالدین محمود احمد صاحب کو نہیں دی گئی۔ خواجہ کمال الدین صاحب، مولوی محمد علی صاحب، ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب، سیّد محمد حسین شاہ صاحب نے اجلاس سے خطاب کیا اور انجمن کے ۵ار نومبر کے فیصلہ کی پُرجوش رنگ میں وکالت کی۔ اور یہ تجویز پیش کی کہ تعلیمی وظائف بڑھا دیئے جائیں تا احمدی نوجوان زیادہ سے زیادہ تعداد میں کالجوں میں جائیں اور پاس ہونے کے بعد ان میں سے جو دین کی خدمت کے لئے زندگی وقف کریں، انہیں ایک آدھ سال میں قرآن پڑھا کر مبلّغ بنا دیا جائے۔ لہ

جناب خواجہ کمال الدین صاحب کی تقریر خاص طور پر پُرجوش تھی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کہا: ہماری جماعت بڑی عقلمند ہے۔ وہ کسی چیز کا ضائع ہونا گوارا نہیں کر سکتی۔ چونکہ انگریزی دان مبلّغ چاہئیں اس لئے مدرسہ دینیہ پر اس قدر خرچ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس مدرسہ کے ذریعہ جو مبلّغ تیار ہوں گے، دُنیا اُن کے متعلق یہی کہے گی کہ وہ روپیہ کی خاطر تبلیغ کر رہے ہیں۔ لیکن اگر ہم اپنے نوجوانوں کو کالج میں تعلیم دلوائیں، کوئی ڈاکٹر بن جائے، کوئی وکیل بن جائے، کوئی انجنیئر بن جائے، کوئی سائنس کی اعلیٰ ڈگری حاصل کرے تو لوگوں پر اس کا بڑا اثر ہو گا۔ اور وہ کہیں گے کہ یہ کیسے اسلام کے جانثار خدام ہیں جو تنخواہ لئے بغیر تبلیغِ اسلام کر رہے ہیں۔ پس دینی تعلیم کا مدرسہ بند کر دیا جائے اور نوجوانوں کو کالجوں میں تعلیم دِلوائی جائے۔ خواجہ صاحب کی اس پُرجوش تقریر سے سامعین نے کافی اثر قبول کیا، یہاں تک کہ بعید نہ تھا کہ اگر اس وقت رائے لی جاتی تو اکثر حاضرین مکرم خواجہ صاحب سے پُوری طرح اتفاق کر جاتے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا کہ علیحدہ دینی مدرسہ کا قیام تو درکنار، اسکول میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی جاری کردہ دینی تدریس کی شاخ بھی بند کر دی جاتی لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہ تھا۔ عین اس وقت جب کہ خواجہ صاحب کی فصاحت و بلاغت اپنے عروج پر تھی اور آپ کی تقریر اپنے اثر کے منتہا تک پہنچ چکی تھی، حضرت صاحبزادہ صاحب کسی سے صُورتِ حال کا علم پا کر مجلس میں داخل ہُوئے۔ جب حاضرینِ مجلس کا یہ رنگ دیکھا اور یہ محسوس کیا کہ ذہن پُوری طرح خواجہ صاحب کے طلسمِ خطابت کے اسیر ہوتے جاتے

لہ الفضل ۱۲ر نومبر ۱۹۳۵ء

ہیں تو یک دفعہ آپ کو اس فکر سے اپنے پاؤں تلے سے زمین نکلتی ہوئی دکھائی دی کہ اگر خدانخواستہ جماعت نے تدریس امورِ دینیہ کو بند کرنے کا فیصلہ دے دیا تو احمدیت کے مستقبل کا کیا بنے گا۔ بجلی کے کوندنے کی طرح یہ وہم آپ کے دل میں آیا اور گزر گیا اور اچانک الٰہی تصرّف نے آپ کے دل و دماغ کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام لیا اور طبیعت ایک غیر معمولی قوّت اور جوش سے بھر گئی۔ تب آپ نے کھڑے ہو کر آوازِ بلند حاضرینِ مجلس سے کچھ بولنے کی اجازت طلب کی۔ سوائے چند ایک کے سب نے بیک آواز کہا کہ ہاں، ہاں! آپ ضرور بولئے۔ اس پر آپ نے بڑی متانت لیکن انتہائی دردانگیز لہجہ میں اپنی تقریر کا یوں آغاز فرمایا:۔

"آپ نے جو فیصلہ کیا ہے یہ آپ کے خیال میں ٹھیک ہوگا۔ مگر ایک چیز ہے جو میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ ہمارے کام آج ختم نہیں ہو جائیں گے۔ بلکہ سینکڑوں اور ہزاروں سال تک ان کا اثر چلتا چلا جائے گا۔ اور دُنیا کی نگاہیں ان پر ہوں گی اور اگر ہم کسی کام کو چُھپانا بھی چاہیں گے تو وہ نہیں چُھپے گا۔ بلکہ تاریخ کے صفحات پر ان واقعات کو نمایاں حروف میں لکھا جائے گا۔ اس نقطۂ نگاہ کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں آپ کی توجہ اس امر کی طرف پھیرنا چاہتا ہوں کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مرض الموت سے بیمار ہوئے تو آپ نے اپنی وفات سے کچھ دن پہلے ایک لشکر رومی حکومت کے مقابلہ کے لئے تیار کیا۔ اور حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو اسکا سردار مقرر فرمایا۔ ابھی یہ لشکر روانہ نہیں ہُوا تھا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی اور سوائے مکّہ اور مدینہ اور طائف کے سارے عرب میں بغاوت رُونما ہو گئی۔ اس وقت بڑے بڑے جلیل القدر صحابہؓ نے مل کر مشورہ کیا کہ اس موقع پر اسامہؓ کا لشکر باہر بھیجنا درُست نہیں کیونکہ اِدھر سارا عرب مخالف ہے۔ اُدھر عیسائیوں کی زبردست حکومت سے لڑائی شروع کر دی گئی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلامی حکومت درہم برہم ہو جائے گی۔ چنانچہ انہوں نے ایک وفد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں روانہ

کیا اور درخواست کی کہ یہ وقت سخت خطرناک ہے۔ اگر اسامہؓ کا لشکر بھی عیسائیوں کے مقابلہ کے لئے چلا گیا تو مدینہ میں صرف بچّے اور بوڑھے رہ جائیں گے اور مسلمان عورتوں کی حفاظت نہیں ہو سکے گی۔ اے ابوبکرؓ! ہم آپ سے التجا کرتے ہیں کہ آپ اس لشکر کو روک لیں اور پہلے عرب کے باغیوں کا مقابلہ کریں۔ جب ہم انہیں دبا لیں گے تو پھر اسامہؓ کے لشکر کو عیسائیوں کے مقابلہ کے لئے روانہ کیا جا سکتا ہے۔ اور چونکہ اب مسلمان عورتوں کی عزّت اور عصمت کا سوال بھی پیدا ہو گیا ہے۔ اور خطرہ ہے کہ دشمن کہیں مدینہ میں گھس کر مسلمان عورتوں کی آبروریزی نہ کرے۔ اس لئے آپ ہماری اس التجا کو قبول فرماتے ہوئے جیشِ اسامہؓ کو روک لیں اور اسے باہر نہ جانے دیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی عادت تھی کہ جب وہ اپنی منکسرانہ حالت کا اظہار کرنا چاہتے تو اپنے آپ کو اپنے باپ سے نسبت دے کر بات کیا کرتے تھے۔ کیونکہ اُن کے باپ غریب آدمی تھے۔ اور چونکہ اُن کے باپ کا نام اُبو قحافہ تھا۔ اس لئے اس موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جو جواب دیا' وہ یہ تھا کہ کیا ابو قحافہ کا بیٹا خلافت کے مقام پر فائز ہونے کے بعد پہلا کام یہ کرے کہ محمّد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے جو آخری مہم تیار کی تھی' اُسے روک دے؟ پھر آپ نے فرمایا۔ خدا کی قسم! اگر کفّار مدینہ کو فتح کر لیں اور مدینہ کی گلیوں میں مسلمان عورتوں کی لاشیں کُتّے گھسیٹتے پھریں تب بھی اس لشکر کو نہیں روکوں گا جسے محمّد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روانہ کرنے کے لئے تیار کیا تھا۔ یہ لشکر جائے گا اور ضرور جائے گا۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی وفات کے بعد آپ لوگوں کا بھی یہ پہلا اجتماع ہے۔ آپ لوگ غور کریں اور سوچیں کہ آئندہ تاریخ آپ کو کیا کہے گی۔ تاریخ یہ کہے گی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایسے خطرہ کی حالت میں جب کہ تمام عرب باغی ہو چکا تھا۔ اور جبکہ مدینہ کی

عورتوں کی حفاظت کے لئے بھی کوئی مناسب سامان اُن کے پاس نہ تھا، اِتنا بھی پسند نہ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک تیار کئے ہوئے لشکر کو وہ روک لیں۔ بلکہ آپ نے فرمایا کہ اگر مسلمان عورتوں کی لاشیں کُتے گھسیٹتے پھریں تب بھی میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو منسوخ نہیں کروں گا۔ لیکن حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنی وفات سے ۲½ سال پہلے دسمبر ۱۹۰۵ء کے جلسہ سالانہ پر تمام جماعت کے دوستوں سے مشورہ لینے کے بعد جس دینی مدرسہ کو قائم فرمایا تھا اور جس کے متعلق یہ فیصلہ فرمایا تھا کہ وہ مولوی عبدالکریم صاحبؓ سیالکوٹی اور مولوی بُرہان الدین صاحبؓ جہلمی کی یادگار ہوگا اور سلسلہ کی ضروریات کے لئے علماء تیار کرنے کا کام اس کے سپرد ہوگا۔ اسے مسیح موعودؑ کی جماعت نے آپ کے وفات پانے کے معاً بعد توڑ کر رکھ دیا۔ کیونکہ جس طرح جیشِ اسامہؓ کی تیاری کا کام خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا، اسی طرح مدرسۂ دینیات کا اجراء خود حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنی آخری عمر میں فرمایا تھا۔

پس دُنیا کیا کہے گی کہ ایک مامور کی وفات کے بعد تو اس کے متبعین نے اپنی عزّتوں کا برباد ہونا پسند کر لیا مگر یہ برداشت نہ کیا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم باطل ہو۔ مگر دوسرے مامور کے متبعین نے باوجود اس کے کہ ان کے سامنے کوئی حقیقی خطرہ نہ تھا اس کے ایک جاری کردہ کام کو اس کی وفات کے معاً بعد بند کر دیا۔"[1]

آپ کے اس پُرجوش اور رُوح پرور خطاب نے اللہ تعالیٰ کے فضل سے جادُو کا سا اثر کیا۔ اور لوگوں کے قلوب کو یکدفعہ پلٹ کر رکھ دیا اور طبیعتوں میں ایک عظیم انقلاب برپا ہوگیا بعض حاضرین کی فرطِ رقّت سے چیخیں نکل گئیں۔ اور بکثرت پُرجوش آوازیں بلند ہونے لگیں کہ ہم حضرت صاحبزادہ صاحب کی رائے سے مکمل اتفاق کرتے ہیں اور ہرگز یہ رائے نہیں دیتے کہ مدرسۂ دینیہ بند کر دیا جائے۔ جناب خواجہ کمال الدین صاحب نے جب مجلس کا یہ بدلا ہُوا رنگ دیکھا تو کھڑے ہو کر فرمانے لگے کہ

---

[1] تقریر جلسہ سالانہ ۲۸ر دسمبر ۱۹۰۸ء ، تاریخ احمدیت جلد ۴ صفحہ ۲۵۰

ہم حضرت میاں صاحب کی رائے کے خلاف نہیں ہیں۔ دوستوں کو غلط فہمی ہو گئی ہے۔ ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ دوسرے پہلوؤں پر بھی غور کیا جائے۔ اور ابھی کوئی فیصلہ نہ کیا جائے۔ بعد میں خط و کتابت کے ذریعہ مشورہ حاصل کر کے مناسب فیصلہ کیا جائے گا۔ لیکن حاضرین نے خواجہ صاحب کے اس گریز کو کوئی وقعت نہ دی۔ اور اپنے فیصلہ پر قائم رہے۔ بایں ہمہ کچھ عرصہ بعد اس بارہ میں جماعتوں سے جب دوبارہ بھی رائے طلب کی گئی تو ہر جماعت نے یہی لکھا کہ وہی فیصلہ درست تھا جو ہم قادیان میں کر آئے ہیں۔ اور ہرگز کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں۔

قصہ مختصر، حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کی یہ شدید خواہش آخر پوری ہوئی کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے دینی تعلیم کے انتظام کا جو بیج اپنے مبارک ہاتھوں سے بویا تھا وہ ایک علیحدہ منفرد درخت کی صورت میں قائم ہوا اور پھولے پھلے اور قیامت تک اس کے ٹھنڈے سائے اور رنگ و بو اور پھولوں اور پھلوں سے نوع انسانی کو فائدہ پہنچاتا رہے۔ اوائل ۱۹۰۹ء میں باقاعدہ اس مدرسہ کی بنیاد رکھ دی گئی اور نصاب کی تعیین و ترتیب کے لئے جو کمیٹی مقرر کی گئی اس میں بھی حضرت صاحبزادہ صاحب ممبر نامزد کئے گئے۔

مدرسہ احمدیہ کی بہبود اور ترقی کے لئے مزید خدمات

حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کی منظوری سے ۱۹۱۰ء میں مدرسہ احمدیہ کی نگرانی کی ذمہ داری بھی آپ ہی کو سونپ دی گئی۔ آپ کی اس نئی ذمہ داری سے قارئین کو مطلع کرتے ہوئے "اخبار الحکم" لکھتا ہے:۔

> "حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب سلمہ اللہ حضرت خلیفۃ المسیح مدظلہ العالی کی زیر تربیت قوم کی بہترین امید ہو کر نشوونما پا رہے ہیں جیسا کہ خدا تعالیٰ نے اُن کے متعلق حضرت مسیح موعود و مغفور کو وعدہ دیا تھا، اپنے کاموں سے اُولوالعزم ثابت ہو رہے ہیں۔ اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ .....
>
> مدرسہ احمدیہ کی نگرانی اور عمدہ انتظام کے لئے حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود احمد قبلہ سلمہ اللہ الاحد مدرسہ احمدیہ کے انسپکٹر مقرر ہوئے ہیں۔ صاحبزادہ صاحب کی توجہ مدرسہ احمدیہ کے لئے نہایت مفید اور

مبارک ثابت ہونے کی خدا تعالیٰ کے فضل سے اُمید ہے۔''[1]

مدیر الحکم کی یہ نیک اُمید کس شان سے پُوری ہوئی تھی' اس کا پورا اندازہ شاید اس نیک تمنّا کا اظہار کرتے ہوئے خود راقم الحروف کو بھی نہ ہو۔ مدرسہ احمدیہ کا نگران بنتے ہی آپ نے بڑے انہماک اور محنت اور حکمت اور دعاؤں کے ساتھ مدرسہ احمدیہ کا معیار بلند سے بلند تر کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان مخلصانہ کوششوں کو اپنے فضلوں اور برکتوں سے نوازا۔ اور یہ انتہائی مفید دینی درسگاہ جس نے مستقبل میں احمدیت کو اجل مذہبی راہنما مہیا کرنے تھے' بہت جلد ایک بلند اور قابلِ رشک معیار تک پہنچ گئی۔ مدرسہ احمدیہ کے نگران کی حیثیت سے آپ کی شخصیت کا مطالعہ ہمیں آپ کی عظیم مربیانہ صلاحیتوں سے روشناس کرانے کا ایک عمدہ ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں مدیر الحکم کے صاحبزادہ شیخ محمود احمد صاحب عرفانی کے قلم سے کھینچا ہوا ایک مختصر خاکہ پڑھنے کے لائق ہے اور اس ضرب المثل کے مصداق ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے:

''مدرسہ ہائی کے ساتھ جب تک مدرسہ احمدیہ رہا' اس کی حالت بالکل ایک لاوارث چیز کی سی تھی۔ طالب علموں کے پاس پورے طور پر کمرے بھی نہ تھے۔ مدرسوں کے پاس اچھی کرسیاں تک نہ تھیں۔ بعض کلاسیں زمین پر چٹائیاں بچھا کر گزارہ کرتی تھیں۔ ایک دفعہ ایسا بھی ہُوا کہ نہ امتحان ہُوا اور نہ کلاس بند ہُوئی۔ بالکل لاوارثی کی سی حالت تھی۔ اس بے کسی کے زمانہ میں حضرت محمود مدرسہ احمدیہ کے لئے فرشتہ بن کر ظاہر ہوئے۔ مدرسہ احمدیہ کی نظامت آپ کے سپرد ہوئی۔ وہ مدرسہ احمدیہ جس کی ڈوبتی کشتی ایک دفعہ آپ پہلے بچا چکے تھے' اب آپ نے اسے اپنے مضبوط ہاتھوں میں لے لیا۔

آپ کا وجود مدرسہ احمدیہ کے لئے ایک مجسّم رحمت تھا۔ آپ نے پست خیال طالب علموں کے اندر علو ہمتی پیدا کرنے کے لئے متعدد طریق اختیار فرمائے۔ آپ نے حکماً طالب علموں کو زمین پر بیٹھ کر پڑھنے سے منع فرمایا کیونکہ اس سے پست خیالی پیدا ہوتی ہے۔ طالب علموں کو فنِ خطابت سکھانے کے لئے جلسوں اور لیکچروں کا انتظام فرمایا۔ ہر جمعرات کو نصف

---

[1] الحکم ۲۸ رمئی ۱۹۱۰ء صفحہ ۱

دن تعلیم ہوتی تھی اور باقی نصف وقت تعلیم خطابت ہوتی تھی۔

لڑکوں کے بورڈنگ ہاؤس کی صفائی کا خاص اہتمام ہونے لگا۔ ہر ماہ میں ایک دفعہ لازماً آپ خود وقتاً فوقتاً تقریریں فرماتے اور اُن کو اُبھارتے۔ مدرسہ احمدیہ کے طالب علموں کے لئے کھیلنے کے لئے کوئی الگ فیلڈ نہ تھی۔ آپ نے اُن کے لئے فیلڈوں کا انتظام کیا تاکہ آئندہ بننے والے علما صرف مُلّاں ہی نہ ہوں بلکہ ہر طرح چاق وچوبند ہوں۔

مدرسہ ہائی کے پاس تو ایک لائبریری تھی جس سے طالب علم فائدہ اٹھاتے تھے مگر مدرسہ احمدیہ کے پاس کوئی لائبریری نہ تھی۔ آپ نے اس ضرورت کو سخت محسوس کیا اور اپنی لائبریری سے قیمتی کتابوں کا ایک بڑا مجموعہ جس میں "الہلال" مصر کے پرچے بھی تھے، مرحمت فرمایا۔ اور مزید روپیہ بھی انجمن سے منظور کروایا۔ طالب علم عربی کتابوں کو پڑھتے تھے اور فائدہ اُٹھاتے تھے۔

آپ نے مدرسہ احمدیہ کی چوتھی جماعت کو اپنے لئے مخصوص کر لیا اور روزانہ تین چار گھنٹے اپنا وقت دیتے تھے۔ میں بھی اس کلاس کا طالب علم تھا اور اپنے بخت پر فخر کرتا ہوں کہ مجھے بھی آپ سے نسبت تلمذ حاصل ہے۔ آپ اپنی کلاس کے طالب علموں کی ہر طرح سے تربیت فرماتے تھے۔ یہ مدرسہ احمدیہ کا موضوع بہت لمبا ہے، سردست اختصار سے اس قدر لکھتا ہوں کہ بعض طالب علم مدرسہ میں کُرتہ پہن کر آجاتے تھے۔ ایک دفعہ آپ نے ترجمہ میں ایک فقرہ دیا — جو یہ تھا: مدرسہ میں بغیر کوٹ پہنے نہیں آنا چاہیئے۔ اس فقرہ سے سب لڑکے سمجھ گئے کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ دوسرے دن لڑکے کوٹ پہن کر آگئے۔

تربیت کا یہ ایک عجیب پہلو تھا۔ ایک دن سکول میں آپ دیر سے تشریف لائے۔ لڑکے باہم ہنسی مذاق کرنے لگے۔ اسی حالت میں آپ تشریف لے آئے۔ آپ نے اس وقت تو کچھ نہ فرمایا۔ تیسرے دن اُردو سے عربی کرنے کا جب کام دیا تو حسب ذیل فقرات اس میں درج تھے:۔

۱۔ ہنسی مذاق بُری چیز نہیں ۲۔ مگر کھیل کھیل کے وقت کھیلو۔
۳۔ مدرسہ میں جب آؤ ایک دوسرے کا ادب کرو۔
۴۔ دھکم دھکا مت ہو۔ ۵۔ کسی کے کندھے پر ہاتھ مت رکھو۔

لڑکوں نے عربی میں ترجمہ تو کیا مگر اس کے ساتھ ہی اپنی اصلاح کرلی۔ رات کو آپ لڑکوں کو سٹڈی کی حالت میں دیکھنے کے لئے تشریف لاتے۔ الغرض مدرسہ احمدیہ آپ کی پُوری توجہ سے بڑھتا چلا گیا اور سلسلہ میں جس قدر کام کرنے والے علماء آج نظر آتے ہیں وہ آپ کی توجہ اور محنت کا نتیجہ ہیں۔" [1]

آپ کی سیرت سے متعلق ایک غیراز جماعت صحافی کے تاثرات

مارچ ۱۹۱۳ء میں ایک غیر احمدی صحافی محمد اسلم صاحب امرتسر سے قادیان آئے اور چند دن قیام کرکے واپس چلے گئے۔ انہوں نے جماعت کا نہایت قریب سے مطالعہ کرنے کے بعد اپنے تاثرات پر ایک تفصیلی بیان دیا۔ اس نے حضرت صاحبزادہ صاحب کے متعلق لکھا:-

"(حضرت) صاحبزادہ بشیرالدین محمود احمد صاحب سے بھی مل کر ہمیں ازحد مسرت ہوئی۔ صاحبزادہ صاحب نہایت ہی خلیق اور سادگی پسند انسان ہیں۔ علاوہ خوش خلقی کے کہیں بڑی حد تک معاملہ فہم و مدبر بھی ہیں۔ علاوہ دیگر باتوں کے جو گفتگو صاحبزادہ صاحب موصوف اور میرے درمیان ہندوستان کے مستقبل پر ہوئی' اس کے متعلق صاحبزادہ صاحب نے جو رائے اقوام عالم کے زمانۂ ماضی کے واقعات کی بناء پر ظاہر فرمائی' وہ نہایت ہی زبردست مدبرانہ پہلو لئے ہوئے تھی۔ صاحبزادہ صاحب نے مجھ سے ازراہ نوازش بہت کچھ مخلصانہ پیرایہ میں یہ خواہش ظاہر فرمائی کہ میں کم ازکم ایک ہفتہ قادیان میں رہوں۔ اگرچہ بوجوہ چند در چند میں ان کے ارشاد کی تعمیل سے قاصر رہا۔ مگر صاحبزادہ صاحب کی اس بلند نظرانہ مہربانی وشفقت کا ازحد مشکور ہوں۔ صاحبزادہ صاحب کا زہد و تقویٰ اور ان کی وُسعت خیالانہ سادگی ہمیشہ یاد رہے گی" [2]

---

[1] الحکم جوبلی نمبر دسمبر ۱۹۳۹ء صہ۱۷
[2] تاریخ احمدیت جلد ۴ صہ۴۶۹

باب پنجم

عہدِ خلافتِ اُولیٰ کے آخری ایام

خلافتِ ثانیہ کا قیام

انکارِ خلافت کا فتنہ

اور اس کی مختلف اشکال

- عہدِ خلافتِ اُولیٰ کے آخری ایّام ۔
- حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کی وفات ۔
- اور خلافتِ ثانیہ کا قیام ۔
- انکارِ خلافت کا فتنہ اور اس کی مختلف اشکال ۔
- امامِ وقت پر آمریت کا الزام ۔
- پہلے امام یا خلیفہ کی مخالفت کا الزام ۔
- قومی اموال میں غلط تصرّف کا الزام ۔
- یہ اعتراض کہ حق حقدار کو نہیں پہنچا بلکہ کمتر شخص کو اختیار کر لیا گیا ہے ۔
- جُزئی فضیلت کی بحثیں یا نفاق کا چور دروازہ ۔
- خلیفۂ وقت کی غلطیوں کی نشاندہی اور اُن کے چرچے ۔
- اپنی پسند کے آدمیوں کو مسلّط کرنے کا الزام ۔
- بڑھاپے اور کمزوریٔ صحت کے باعث نا اہلی کا الزام ۔
- ایک چاند کے بعد دُوسرا چاند ۔

عہدِ خلافتِ اُولیٰ کے آخری ایّام

حضرت خلیفۃ المسیح حکیم مولوی نورالدین صاحب رضی اللہ عنہ اوائل ۱۹۱۱ء میں ایک مرتبہ گھوڑے سے گر کر شدید زخمی ہوئے تھے اور ایک لمبا عرصہ صاحبِ فراش رہنے کے بعد گو بڑی ہمت اور پامردی کے ساتھ خلافت کی عظیم ذمہ داریوں کی سرانجام دہی میں پہلے کی طرح تن دہی سے مصروف ہو گئے، لیکن آپ کی صحت پر اس حادثہ کے بداثرات بہت گہرے اور دیرپا ثابت ہوئے اور عملاً آپ کے جسم کو اس تکلیف نے نڈھال اور کھوکھلا کر دیا تھا۔ چنانچہ گو حضور کی یہ عادت نہ تھی کہ اپنی جسمانی تکالیف کا ذکر کریں لیکن جب کبھی کسی طبقہ سے دُکھ پہنچتا تھا تو ان کی دل آزار باتوں پر بطور شکوہ یہ فرمایا کرتے تھے کہ میں انتہائی تکلیف اور جسمانی آزار کے باوجود محض خدا تعالیٰ کی رضا کی خاطر تم لوگوں کی بہبود کے لئے اس حد تک کوشاں ہوں کہ دعائیں کرتے ہوئے اپنی ذمہ داریاں نباہ رہا ہوں۔ لہٰذا تمہیں یہی خیال کر کے ایسی باتوں سے پرہیز کرنا لازم تھا جن سے مجھے دُکھ پہنچے۔ بہرحال اس بڑھاپے میں آپ نے بڑی جسمانی سختی اور تکلیف اُٹھا کر بھی اپنے جسم کو خدمتِ دین کے لئے مسخر کئے رکھا۔

۱۹۱۳ء کے جلسہ سالانہ کا واقعہ ہے کہ طبیعت کی خرابی کے باوجود احبابِ جماعت کی دلداری کی خاطر تقریر کے لئے تشریف لے آئے لیکن ابھی چند ہی کلمات فرمائے تھے کہ اچانک بیماری اتنی بڑھ گئی کہ مزید ٹھہرنا ممکن نہ رہا۔ ایک ہی ماہ بعد یعنی جنوری ۱۹۱۴ء میں رات بستر سے اُٹھنے پر چکر آیا اور سینے کے بل زمین پر گرنے سے ایک مرتبہ پھر شدید ضربات پہنچیں اور ہلکی حرارت اور قے کے عارضے لاحق ہو گئے یہاں تک کہ چلنے پھرنے سے معذور اور صاحبِ فراش ہو گئے۔ اس حالت میں بھی جب ذرا طاقت محسوس فرماتے بستر پر لیٹے لیٹے ہی قرآن کریم کا درس دیتے۔ جماعت کے مخلصین پر آپ کی اس بیماری کا جو بعد میں مرض الموت ثابت ہوئی، بہت گہرا اثر تھا۔ ذہن پریشان اور فکرمند تھے اور دل اپنے محبوب آقا کی تکلیف سے پگھلے جاتے تھے۔ ایسے نازک وقتوں میں عموماً اختلافات اگر مٹ نہیں سکتے تو وقتی طور پر بھلا دیئے جاتے ہیں اور خشیّتِ الٰہی دلوں کو نرم کرتی اور بھائیوں کی تقصیرات کو معاف کرنے کے لئے آمادہ کرتی ہے۔ جماعت پہلے سے بھی بڑھ کر دُعاؤں اور ذکرِ الٰہی

میں مصروف تھی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ سے محبت اور آپ کی تکلیف کے احساس سے دلوں کی یہ کیفیت تھی کہ انہی ایام میں جب ایک مرتبہ آپ نے درسِ قرآن دیا تو آپ کے لہجہ کی دردانگیزی سے متأثر ہو کر سُننے والے بے اختیار رو پڑے اور بعض کمزور طبائع رکھنے والے سامعین کی تو فرطِ درد سے چیخیں نکل گئیں۔ آپ کے اس درس میں ایک گونا وصیّت کا رنگ پایا جاتا تھا جس سے سامعین پر یہ تاثر پڑنا قدرتی امر تھا کہ ان کا محبوب امام اُن سے جُدا ہونے کو ہے۔

افسوس ہے کہ ایسے وقت میں بھی منکرینِ خلافت اپنی سعیٔ مذموم سے باز نہ آئے بلکہ اس بیماری سے فائدہ اٹھاتے ہُوئے اور یہ یقین کرکے کہ اب یہ صاحبِ جلال بزرگ کبھی منبرِ رسول پر کھڑا ہو کر اُن کے فتنوں کی مذمّت اور اُن کے فاسد خیالات کی بیخ کنی نہیں کر سکے گا، پہلے سے بھی بڑھ کر اپنی کوششوں میں تیز ہو گئے۔ ایک طرف تو اُن کو یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ جماعت کہیں مستقلاً ہی نظامِ خلافت کو اپنا نہ لے اور اُن کے یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکیں کہ خلیفۃ المسیح کی وفات کے بعد آخر انہی کی بادشاہی کے دن آئیں گے۔ دوسری طرف یہ فکر دامنگیر تھا کہ اگر جماعت نے نظامِ خلافت کو اپنانا ہی ہے تو مبادا حضرت صاحبزادہ مرزا بشیرالدین محمود احمد صاحب کو نیا امام منتخب کرلے۔ اس دوہری تکلیف کا تصوّر اُن کے لئے سوہانِ رُوح بنا ہُوا تھا۔ اور طبیعتیں اس امکان کے خلاف سیخ پا ہوتیں اور سرکشی کرتی تھیں۔ چنانچہ انہی خدشات اور توہّمات میں غلطاں ایک طرف تو انہوں نے سرے سے خلافت کے نظام کو ختم کرنے کا بیڑہ اٹھا رکھا تھا اور زبانی چہ میگوئیوں اور گمنام ٹریکٹوں کے ذریعے جماعت کو خلافت سے برگشتہ کرنے کی کوششیں تیز سے تیز تر کر دی گئی تھیں۔ دوسری طرف اس اِمکان کی پیش بندی کے لئے بھی سکیم بنائی جا رہی تھی کہ اگر خلیفہ بننا ہی ہے تو حضرت صاحبزادہ مرزا محمود احمد صاحب خلیفہ نہ ہوں۔ چنانچہ آپ پر کئی قسم کے ذاتی حملے کرکے آپ کو بدنام کرنے کی نت نئی راہیں تجویز کی جاتیں اور جماعت کی نظر میں آپ کا مقام گرانے کی ہر ممکن سعی کی جاتی۔ یہ سب کچھ ہُوا لیکن احبابِ جماعت کے قلوب میں آپ کی محبت بڑھتی ہی رہی اور ہر طرف آپ کے خلوص، آپ کے تقویٰ، آپ کے دینی کاموں میں اِنہماک اور آپ کے علم و معرفت اور صدق و صفا کے چرچے ہونے لگے۔ یہ حالات منکرینِ خلافت کے لئے سخت تشویشناک تھے۔ اُن کے توہّمات کی نوعیت اور تشویش کی شدّت کا کچھ اندازہ مندرجہ ذیل واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کی زندگی کے آخری ایام میں ایک مرتبہ ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب حضرت صاحبزادہ مرزا محمود احمد صاحب کے پاس تشریف لائے اور فرمایا:-

"ایک مشورہ کرنا ہے آپ ذرا مولوی محمد علی صاحب کے مکان پر تشریف لے چلیں۔ آپ کے نانا جناب میر ناصر نواب صاحب کو بھی وہاں بُلوایا گیا تھا۔ جب آپ وہاں پہنچے تو مولوی محمد علی صاحب، خواجہ کمال الدین صاحب، مولوی صدر الدین صاحب اور ایک دو آدمی وہاں پہلے سے موجود تھے۔ خواجہ صاحب نے ذکر شروع کیا کہ آپ کو اس لئے بُلوایا ہے کہ حضرت مولوی صاحب کی طبیعت بہت ناساز اور کمزور ہے۔ ہم لوگ یہاں ٹھہر تو سکتے نہیں۔ لاہور واپس جانا ہمارے لئے ضروری ہے پس اس وقت دوپہر کو جو آپ کو تکلیف دی ہے تو اس سے ہماری غرض یہ ہے کہ کوئی ایسی بات طے ہو جائے کہ فتنہ نہ ہو۔ اور ہم لوگ آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم میں سے کسی کو خلافت کی خواہش نہیں ہے اور مولوی محمد علی صاحب بھی آپ کو یہی یقین دلاتے ہیں۔ اس پر مولوی محمد علی صاحب بولے کہ مجھے بھی ہرگز خواہش نہیں۔ اس کے بعد خواجہ صاحب نے کہا کہ ہم بھی آپ کے سوا خلافت کے قابل کسی کو نہیں دیکھتے اور ہم نے اس امر کا فیصلہ کر لیا ہے لیکن آپ ایک بات کریں کہ خلافت کا فیصلہ اسوقت تک نہ ہونے دیں جب تک ہم لاہور سے نہ آجاویں۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص جلد بازی کرے اور پیچھے فساد ہو۔ ہمارا انتظار ضرور کر لیا جاوے۔ میر صاحب نے تو اُن کو یہ جواب دیا کہ ہاں جماعت میں فساد مٹانے کے لئے کوئی تجویز ضرور کرنی چاہیئے مگر حضرت صاحبزادہ صاحب نے، جن کو یہ پیشکش کی گئی تھی، اس وقت کی ذمہ داری کو محسوس کر لیا اور صحابہ کا طریق آپ کے سامنے آگیا کہ ایک خلیفہ کی موجودگی میں دوسرے کے متعلق تجویز، خواہ وہ اس کی وفات کے بعد کے لئے ہی کیوں نہ ہو، ناجائز ہے۔ پس آپ نے اُن کو یہ جواب دیا کہ ایک خلیفہ کی زندگی میں اس کے جانشین کے متعلق تعیین کر دینی اور فیصلہ کر دینا کہ اس کے بعد فلاں شخص خلیفہ ہو، گناہ ہے۔ میں تو اس امر میں کلام کرنے کو ہی گناہ سمجھتا ہوں"۔[1]

---

[1] آئینہ صداقت صفحہ ۱۴۶

یہ واقعہ اکیلا ہی یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ ان لوگوں کی کوششیں تقویٰ اللہ پر مبنی نہ تھیں کیونکہ اگر یہ خلافت کے نظام کے سرے سے قائل ہی نہ تھے یا کم از کم ایک دفعہ اسے تسلیم کرنے کے بعد اس سے برگشتہ ہو چکے تھے تو اُن کو کسی بھی اخلاقی معیار کی رُو سے یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ بعض دوسرے لوگوں پر یہ تأثر قائم کرنے کی کوشش کریں کہ دراصل وہ بھی خلیفۃ المسیح الاول کے بعد ایک دوسرے خلیفہ کے انتخاب کے حق میں ہیں، صرف جلد بازی کے فیصلہ سے ڈرتے ہیں۔ چونکہ انکارِ خلافت کی تحریک کے بانی مبانی لاہور سے تعلق رکھتے تھے اور لاہور ہی سے شائع ہونے والے گمنام ٹریکٹوں کے ذریعہ جماعت کو نظامِ خلافت سے برگشتہ کرنے کی کوششیں کی جاتی تھیں حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کو وصال سے دو ہفتہ قبل جب اسی قماش کے ایک ٹریکٹ بعنوان "اظہار الحق" کے مضمون سے آگاہ کیا گیا تو حضور نے اس بارہ میں بڑے دُکھ کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا :-

"لاہور کو جانتا نہیں ؟ وہ ایسا قصبہ ہے کہ جہاں سے مجھ کو ایسے بڑھاپے میں اس قدر تکلیف پہنچی ہے۔ میرا دل جلایا گیا۔ میں اس وقت بوڑھا ہوں کیا یہ مجھ کو دُکھ دینے اور تکلیف دینے کا وقت تھا؟ یہ تو مجھ سے محبت کرنے کا وقت تھا۔ مجھے اس وقت راضی کرنا چاہیئے تھا... پھر فرمایا وہ جو کہتا ہے کہ فلاں شخص کو میں نے خلیفہ مقرر کر دیا ہے، غلط ہے۔ مجھے کیا علم ہے کہ کون خلیفہ ہوگا اور کیا ہوگا۔ کون خلیفہ بنے گا یا مجھ سے بہتر خلیفہ ہوگا؟ میں نے کسی کو خلیفہ نہیں بنایا۔ میں کسی کو خلیفہ نہیں بناتا میرا یہ کام نہیں۔ خلیفے اللہ ہی بناتا ہے۔ میرے بعد بھی اللہ ہی بنائے گا"۔ [1]

حضور کے اس ارشاد میں یہ فقرہ کہ "وہ جو کہتا ہے کہ فلاں شخص کو میں نے خلیفہ مقرر کر دیا ہے، غلط ہے" ایک گذشتہ واقعہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ ۱۹۱۱ء میں جب آپ گھوڑے سے گر کر شدید زخمی ہوئے تو اس حادثہ کے قریباً بیس روز بعد آپ نے وصیت پر مشتمل دو لفافے اپنے ایک شاگرد شیخ تیمور کے سپرد فرمائے تھے۔ ان میں سے ایک کا مضمون تو شیخ تیمور سے بھی خفیہ رکھا گیا۔ لیکن ایک کاغذ پر جو تحریر تھی وہ شیخ صاحب کو دکھا دی گئی اور اُن سے بھی اسی کاغذ پر کچھ لکھوایا گیا تھا ۔ گو بعد ازاں صحت بحال ہونے پر آپ نے اس وصیت کو کسی پر مضمون ظاہر فرمائے بغیر تلف فرما دیا تھا لیکن اس کے متعلق بعض دوستوں کا یہ کہنا تھا کہ اس میں حضرت صاحبزادہ مرزا محمود احمد صاحب

---

[1] الحکم ۲۸ر فروری ۱۹۱۴ء

کو خلیفہ مقرر کرنے کی وصیت تھی۔ مکرم جناب مولوی محمد علی صاحب کا بھی اس بارہ میں یہی نظریہ تھا چنانچہ آپ لکھتے ہیں :۔

"اپنی پہلی بیماری میں یعنی ۱۹۱۱ء میں جو وصیت آپ نے لکھوائی تھی اور جو بند کر کے ایک خاص معتبر کے سپرد کی تھی' اس کے متعلق معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ اس میں آپ نے اپنے بعد خلیفہ ہونے کے لئے میاں صاحب کا نام لکھا تھا۔ یہ وصیت بعد میں بند کی بند ضائع کر دی گئی" [1]

۲۷ر فروری ۱۹۱۴ء کو آپ آب و ہوا اور ماحول کی تبدیلی کی غرض سے شہر سے باہر نواب محمد علی خان صاحبؓ کی کوٹھی "دارالسلام" میں تشریف لے گئے۔ آپ کے خاندان اور آنے جانے والے مہمانوں کے لئے بھی کوٹھی میں ہی رہائش اور کھانے وغیرہ کا انتظام کیا گیا۔ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیرالدین محمود احمد صاحب آپ کی بیماری کے پیش نظر سخت فکر مند تھے اور تیمار داری اور خدمت کی خاطر شب و روز حاضر اور مستعد رہتے تھے۔ ۴ر مارچ کو نماز عصر کے بعد حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کی طبیعت سخت خراب ہوگئی اور بے حد ضعف محسوس ہونے لگا۔ مولوی سید محمد سرور شاہ صاحب پاس بیٹھے تھے۔ انہیں فرمایا قلم دوات اور کاغذ لائیں۔ آپ نے لیٹے لیٹے کاغذ ہاتھ میں لیا اور مندرجہ ذیل وصیت لکھی :۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ وَآلِہٖ مَعَ التَّسْلِیْمِ

خاکسار بقائمی حواس لکھتا ہے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ۔ میرے بچے چھوٹے ہیں۔ ہمارے گھر مال نہیں' ان کا اللہ حافظ ہے۔ انکی پرورش یتامیٰ و مساکین سے نہ ہو۔ کچھ قرضہ حسنہ جمع کیا جاوے۔ لائق لڑکے ادا کریں یا کتب' جائداد وقف علی الاولاد ہو۔ میرا جانشین متقی ہو ہر دلعزیز' عالم باعمل ہو۔ حضرت صاحب کے پرانے اور نئے احباب سے سلوک چشم پوشی درگذر کو کام میں لاوے۔ میں سب کا خیر خواہ تھا۔ وہ بھی خیر خواہ رہے۔ قرآن و حدیث کا درس جاری رہے۔ والسلام۔" [2]

یہ وصیت لکھ کر حضرت خلیفہ اوّلؓ نے مولوی محمد علی صاحب کو فرمایا کہ وہ سنا دیں۔ چنانچہ انہوں نے باآواز بلند پڑھ کر سنا دی۔ پھر ارشاد فرمایا تین مرتبہ پڑھ کر سنا دو۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔

---

[1] حقیقت اختلاف صہ ۶۹ [2] الحکم ۷ر مارچ ۱۹۱۴ء

اس کے بعد آپ نے فرمایا کوئی اور ضروری امر اگر رہ گیا ہو تو بتا دیں میں لکھ دُوں ۔ حاضرین نے عرض کیا : کوئی ضروری امر باقی نہیں رہا ۔ یہ سماں بڑا رقت آمیز اور درد وکرب سے پُر تھا ۔ وصیت سُنائی جانے کے بعد فرمایا : یہ نواب صاحب کے سپرد کر دو ' وہ اسے محفوظ رکھیں ۔ چنانچہ مولوی محمد علی صاحب نے اصل کاغذ نواب صاحب کے سپرد کر دیا ۔ نواب صاحب نے دستخط کیلئے یہ کاغذ حضرت خلیفۃ المسیحؓ کی خدمت میں پیش کیا ۔ آپ نے اس پر دستخط کئے ۔ اس کے علاوہ مولوی محمد علی صاحب ۔ ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب ، صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب اور نواب محمد علی خان صاحب نے بھی بطور گواہ اس وصیت پر دستخط کئے ۔ لیکن افسوس کہ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کی اس واضح اور غیر مبہم وصیت کے باوجود کہ آپ کے بعد کسی متقی فرد کو آپ کا جانشین منتخب کیا جائے (نہ کہ چند افراد پر مشتمل کسی انجمن کو) اور باوجود اس کے کہ نہایت حکیمانہ رنگ میں حضرت خلیفۃ المسیح نے اس وصیت کو سُنانے کے لئے جناب مولانا محمد علی صاحب ہی کو منتخب فرمایا اور پھر تین بار اُن سے وصیت پڑھا کر سنوائی ۔ نہ تو مولانا کے ارادوں میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی نہ اُن کے ہم خیال اور زیر اثر احباب کے طرزِ عمل کی کوئی اصلاح ہُوئی ۔ گویا سر پنچوں کا کہا سر آنکھوں پر تھا لیکن...

حضرت صاحبزادہ صاحب نے جب یہ حالات دیکھے تو سخت فکر مند ہوئے اور اس مضمون کا ایک اشتہار لکھ کر شائع کرنے کا ارادہ فرمایا کہ اب جبکہ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ سخت بیمار ہیں ' مناسب نہیں کہ ہم اس طرح کی اختلافی بحثیں کریں ۔ اس کا انجام فتنہ کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا اس لئے اس وقت تک کہ اللہ تعالیٰ حضورؓ کو شفا عطا فرمائے اور آپؓ خود ان بحثوں کی نگرانی کر سکیں ' نہ کچھ لکھا جائے اور نہ زبانی گفتگو کی جائے ۔ آپ نے اشتہار کا مسودہ مولوی محمد علی صاحب کو بھیجا کہ اگر انہیں اس تجویز سے اتفاق ہو تو وہ بھی اس پر دستخط کر دیں تا ہر قسم کے خیالات کے لوگوں پر اس کا اثر ہو اور ساری جماعت فتنہ سے محفوظ ہو جائے لیکن مولوی محمد علی صاحب نے اس اشتہار پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور عُذر یہ پیش فرمایا کہ چونکہ اس اختلاف سے عام طور پر لوگ واقف نہیں اس لئے ان حالات میں یہ اشتہار ٹھیک نہیں ۔ ایسا اشتہار شائع کرنے سے دشمنوں کو جماعت کے اندرونی اختلاف سے واقفیت ہوگی اور انہیں ہنسی کا موقع ملے گا ۔ اس کی بجائے بہتر صورت یہ ہے کہ قادیان کے لوگوں کو جمع کیا جائے اور اس میں آپ اور مَیں تقریر کریں اور لوگوں کو سمجھائیں کہ اختلافی مسائل پر گفتگو ترک کر دیں ۔ حضرت صاحبزادہ صاحب کا مقصد چونکہ اتحاد و اتفاق تھا ' اس لئے آپ نے مولوی صاحب کی تجویز مان لی اور اشتہار شائع کرنے کا ارادہ ترک کر دیا ۔ چنانچہ اس تجویز کے مطابق لوگ مسجد نُور میں

جمع ہُوئے۔حضرت صاحبزادہ صاحب نے اتحاد و اتفاق سے رہنے اور اس نازک موقع پر اختلافی بحثیں ترک کر دینے کی تلقین فرمائی۔اس کے بعد مولانا محمد علی صاحب نے اس موضوع پر پُرزور خطاب فرمایا کہ اُنکے ہم خیال دوستوں کی اور اُن کے نظریات کی مذمت کرنے والے لوگ باز آجائیں۔ورنہ فتنہ پیدا ہوگا۔چنانچہ اس رنگ میں جناب مولانا صاحب مرحوم وہ سب کچھ کہہ گئے جس کے نہ کہنے کی تاکید کے لئے یہ جلسہ منعقد کیا گیا تھا۔

اس قسم کی بحثیں صرف قادیان تک محدود نہ تھیں بلکہ باقاعدہ مہم کی صُورت میں نمائندگان کو بھجوا کر مختلف جماعتوں میں نظامِ خلافت کے خلاف پراپیگنڈہ کروایا جا رہا تھا اور جہاں جہاں مولانا محمد علی صاحب کے ہم خیال دوست موجود تھے وہ کسی نہ کسی رنگ میں ضرور یہ مسئلہ چھیڑ دیتے تھے۔مکرم چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب ان دنوں انگلستان میں تھے۔اس بارہ میں آپ کی ایک روایت بھی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے:۔

"۱۹۱۲ء میں خواجہ کمال الدین صاحب لندن تشریف لائے ... تھوڑے عرصہ بعد خواجہ صاحب اس مکان میں آگئے جس میں مَیں رہتا تھا اور مجھے روزانہ کچھ وقت اُن کی صحبت میں گزارنے کا موقع مل گیا۔دورانِ گفتگو سلسلہ احمدیہ کا ذکر بھی آتا تھا۔ایک دفعہ ہم دونوں سیر کے لئے جا رہے تھے کہ فرمایا" نورالدین کے بعد خلافت کے متعلق بھی رولا ہی پڑے گا (گفتگو پنجابی زبان میں تھی اور محبت کے رنگ میں خواجہ صاحب اکثر خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کا نام اِسی بے تکلفی سے لیتے تھے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا ذکر بعض دفعہ صرف "مرزا" کہہ کر کرتے تھے)۔میاں محمود ابھی بچہ ہے۔محمد علی بہت حساس ہے۔بات بات پر رو پڑتا ہے۔اور میں ہوں لیکن مجھ میں یہ نقص ہے کہ میں سچی بات منہ پر کہہ دیتا ہوں۔مجھ سے لوگ خفا ہو جاتے ہیں"۔میں نے عرض کیا"خواجہ صاحب! خلافت کے متعلق حضرت خلیفۃ المسیحؓ اپنی لاہور کی تقریر میں بہت کچھ وضاحت فرما چکے ہیں آپ کیوں فکر کرتے ہیں۔وقت آنے پر اللہ تعالیٰ جسے پسند فرماتے گا کھڑا کر دے گا"اس پر فرمایا"یہ مفتی صادق کم بخت ہمارے خلاف سب کچھ شائع کر دیتا ہے۔ہمارے حق کی کوئی بات نہیں لکھتا"[1]

---

[1] تحدیثِ نعمت صفحہ ۴۵-۴۶

حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کی وفات اور خلافتِ ثانیہ کا قیام

۱۳؍مارچ ۱۹۱۴ء جمعہ کا دن تھا حسبِ سابق آپ نے صاحبزادہ مرزا محمود احمد صاحب کو خطبہ دینے کا ارشاد فرمایا جمعہ سے کچھ دیر پہلے اچانک آپ کی طبیعت گرنے لگی۔ اکثر دوست جمعہ کیلئے مسجد اقصیٰ میں جا چکے تھے۔ آپ نے ساعتِ وصال قریب دیکھ کر اپنے صاحبزادہ عبدالحی کو بلوایا اور حسب ذیل الفاظ میں الوداع کہی:

"لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ پر میرا ایمان رہا اور اسی پر مرتا ہوں اور حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے سب صحابہ کو میں اچھا سمجھتا ہوں۔ اس کے بعد میں حضرت امام بخاری کی کتاب کو خدا کی پسندیدہ سمجھتا ہوں۔ حضرت مرزا غلام احمد صاحبؑ کو مسیح موعود اور خدا کا برگزیدہ انسان سمجھتا ہوں۔ مجھے اُن سے اتنی محبت تھی کہ جتنی میں نے اُن کی اولاد سے کی تم سے نہیں کی۔ قوم کو خدا کے سپرد کرتا ہوں اور مجھے اطمینان ہے کہ وہ ضائع نہیں کرے گا۔ تم کو میں نصیحت کرتا ہوں کہ خدا کی کتاب کو پڑھنا، پڑھانا اور عمل کرنا۔ میں نے بہت کچھ دیکھا پر قرآن جیسی چیز نہ دیکھی۔ بے شک یہ خدا کی کتاب ہے۔ باقی خدا کے سپرد"[1]

اسی طرح اپنی صاحبزادی امۃ الحی کو پیغام دیا کہ وہ میرے مرنے کے بعد میاں صاحب سے کہہ دیں کہ عورتوں میں بھی درس دیا کریں"[2]

حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کی وفات عین جمعہ کے وقت ہوئی۔ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب جمعہ کی نماز سے فارغ ہو کر "دار السلام" جانے سے پہلے کچھ دیر کے لئے اپنے گھر تشریف لے گئے تو اچانک حضرت نواب محمد علی خاں صاحبؓ کا ملازم گھبرایا ہوا پہنچا کہ نواب صاحب نے گھوڑا گاڑی بھیجی ہے، فوراً تشریف لے آئیں۔ چنانچہ آپ اسی وقت گاڑی میں سوار ہو کر روانہ ہو گئے لیکن ابھی راستہ ہی میں تھے کہ ایک دوسرا ملازم دوڑتا ہوا آیا اور حضرت خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ عنہ کے وصال کی اندوہناک خبر دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آپ کوٹھی پہنچتے ہی اپنے نہایت مشفق اُستاد اور مہربان آقا کی نعش مبارک کے پاس پہنچے۔ اس سراپا نور مقدس وجود کا چہرہ دیکھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ کر فرمایا۔ طِبْتَ حَيًّا وَّمَيِّتًا۔ اور بڑے الحاح سے آپ کے درجات کی بلندی کے لئے دعا کرنے کے بعد باہر دوستوں کے مجمع میں تشریف لے آئے

---

[1] الحکم ۱۴؍مارچ ۱۹۱۴ء [2] الفضل ۱۸؍مارچ ۱۹۱۴ء

باہر دوستوں کا غم سے بُرا حال ہُوا جاتا تھا۔ جس نے بھی یہ خبر سُنی، پریشان حال دوڑتا ہُوا "دارالسلام" پہنچا۔ چنانچہ بہت جلد غمزدہ مخلصین کی ایک بھاری تعداد کوٹھی کے وسیع دعریض بیرونی صحن میں جمع ہو گئی۔ اسی حالت میں نمازِ عصر کا وقت ہوگیا اور سب احباب نماز کے لئے مسجد نور میں جمع ہو گئے۔ نماز کے بعد حضرت صاحبزادہ مرزا بشیرالدین محمود احمد صاحب نے ایک مختصر تقریر فرمائی اور فرمایا کہ یہ ایک نازک وقت ہے اور جماعت کے لئے ایک بھاری ابتلاء کی گھڑی درپیش ہے۔ سب لوگ گریہ وزاری کے ساتھ اپنے خدا کے حضور دعائیں کریں کہ وہ اس اندھیرے وقت میں جماعت کے لئے روشنی پیدا فرمائے اور ہمیں ہر رنگ میں ٹھوکر سے بچا کر اس راستہ پر ڈال دے جو جماعت کے لئے بہتر اور مبارک ہے۔ جن لوگوں کو طاقت ہو وہ کل ہفتہ کے دن روزہ رکھیں تاکہ رات کی نمازوں اور دعاؤں کے ساتھ کل کا دن بھی دُعا اور ذکرِ الٰہی میں گزرے۔ اس تقریر نے سکینت اور تسلی کی ایک لہر دلوں میں دوڑا دی اور سبھی اپنے خدا کے حضور جھکتے اور اُسی سے فضل کی التجا کرتے ہوئے عاجزانہ دعاؤں میں لگ گئے۔ ادھر شمع خلافت کے پروانوں کی یہ حالت تھی، اُدھر منکرینِ خلافت کا یہ حال تھا کہ وصال کی خبر سُنتے ہی مختلف جماعتوں میں کارندے دوڑا دیئے تاکہ تمام جماعتوں میں فوری طور پر ایک ایسا رسالہ تقسیم کر دیا جائے جو انکارِ خلافت سے متعلق پراپیگنڈے پر مشتمل تھا، اور جو پہلے ہی سے تصنیف اور طبع ہو کر اس انتظار میں تیار پڑا تھا کہ جونہی حضرت خلیفۃ المسیح کا وصال ہو پہلے سے مقرر کردہ کارکنان ان رسالوں کو لے اُڑیں اور تمام جماعتوں میں تقسیم کر دیں۔

یہ رسالہ بیس اکیس صفحات کا تھا جس کے مضمون کا خلاصہ یہ تھا کہ جماعت میں خلافت کے نظام کی ضرورت نہیں بلکہ انجمن کا انتظام ہی کافی ہے البتہ غیر احمدیوں سے بیعت لینے کی غرض سے اور حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کی وصیت کے احترام میں کسی شخص کو بطور امیر مقرر کیا جا سکتا ہے مگر یہ شخص جماعت یا صدر انجمن کا مطاع نہیں ہوگا بلکہ اس کی امارت محدود اور مشروط ہوگی۔

اس رسالہ میں طرح طرح سے جماعت کو اُبھارا گیا تھا کہ وہ کسی واجب الاطاعت خلافت پر رضامند نہ ہو۔ اس رسالہ کی اشاعت کی خبر بہت جلد قادیان میں پھیل گئی جس سے سوگوار مخلصین کی تشویش میں مزید اضافہ ہونا ایک طبعی امر تھا۔ مکرم مولانا محمد علی صاحب کے اس خطرناک اقدام کا وسیع پیمانے پر فوری تدارک کرنا تو ان حالات میں بہت مشکل تھا۔ لیکن بالکل خاموش رہنا بھی خطرات سے خالی نہ تھا۔ اس لئے قادیان میں حاضر الوقت احمدیوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے غلامانِ خلافت کی طرف سے ایک مختصر نوٹ تیار کیا گیا جس کا مضمون یہ تھا کہ جماعت میں اسلام کی تعلیم اور حضرت

مسیح موعود علیہ السلام کی وصیّت کے مطابق خلافت کا نظام ضروری ہے اور جس طرح حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ جماعت کے مطاع تھے اسی طرح آئندہ خلیفہ بھی مطاع ہوگا۔ اس نوٹ پر حاضر الوقت لوگوں سے دستخط لئے گئے تاکہ یہ اس بات کا ثبوت ہو کہ جماعت کی اکثریت نظام خلافت کے حق میں ہے۔ حالات بڑی تیزی سے نازک تر ہوتے جا رہے تھے اور جو آتشیں مادہ مدت سے اُبل رہا تھا' اب پھٹ پڑنے کو تھا۔

اس صورتحال کے تدارک کے لئے حضرت صاحبزادہ مرزا بشیرالدین محمود احمد صاحب نے باہمی سمجھوتے کے لئے ایک آخری کوشش ضروری سمجھی۔ چنانچہ فریقین کے چند زعماء اس غرض کے لئے نواب محمد علی خان صاحب کی کوٹھی میں جمع ہُوئے۔ حضرت صاحبزادہ صاحب کی طرف سے یہ امر پوری وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا کہ اس وقت سوال اصول کا ہے کسی کی ذات کا نہیں۔ اگر آپ لوگ خلافت کے اصول کو تسلیم کرلیں تو ہم خدا کو حاضر وناظر جان کر عہد کرتے ہیں کہ مومنوں کی کثرت رائے سے جو بھی خلیفہ منتخب ہوگا خواہ وہ کسی پارٹی کا ہو' ہم سب دل وجان سے اس کی خلافت کو قبول کریں گے مگر منکرین خلافت نے اس مخلصانہ اور با اصول پیشکش کو قبول نہ کیا اور ہر قسم کے سمجھوتے سے انکار کر دیا۔

اس پر پھر ان لوگوں سے استدعا کی گئی اگر آپ حضرات خلافت کے اتنے ہی مخالف ہیں تو ہمارا آپ پر کوئی زور نہیں لیکن جو لوگ خلافت کو ضروری خیال کرتے ہیں' خدارا آپ اُن کے راستہ میں تو روک نہ بنیں اور انہیں اپنے میں سے کوئی خلیفہ منتخب کرکے ایک ہاتھ پر جمع ہونے کا موقع دیں۔ لیکن یہ مخلصانہ اپیل بھی صدا بصحرا ثابت ہُوئی اور اتحاد کی کوئی صورت وہ لوگ ماننے کے لئے تیار نہ ہُوئے۔

حضرت صاحبزادہ صاحب نے ذاتی طور پر بھی جناب مولوی محمد علی صاحب ایم۔اے سے اس سلسلہ میں بات چیت کی۔ اس بات چیت کے دوران مولوی صاحب نے آپ سے کہا کہ چونکہ ہر ایک کام بعد مشورہ ہی اچھا ثابت ہوتا ہے اس لئے حضرت خلیفۃ المسیح رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد جلدی سے کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیئے بلکہ پورے مشورہ کے بعد کوئی کام ہونا چاہیئے۔ آپ نے اُن سے کہا کہ جلدی کا کام بیشک بُرا ہوتا ہے اور مشورہ کے بعد ہی کام ہونا چاہیئے اور ایک روز انتظار کرلیا جائے جب بیرونی جماعتوں سے احباب بکثرت تشریف لے آئیں تو مشورہ ہو جاوے۔ مولوی صاحب نے اس تجویز کو رد کرتے ہُوئے فرمایا' چونکہ اختلاف ہے اس لئے پورے طور پر بحث ہو کر ایک بات پر متفق ہو کر کام کرنا چاہیئے۔ چار پانچ ماہ اس پر تمام جماعت غور کرے۔ تبادلۂ خیالات کے بعد پھر جو فیصلہ ہو اس پر عمل کیا جاوے۔ آپ نے دریافت کیا

لے تاریخ احمدیت جلد ۴ صد ۵۸۲ ، آئینہ صداقت صد ۱۸۰ ، رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۵۰ء

کہ اوّل تو سوال یہ ہے کہ اختلاف کیا ہے۔ پھر یہ سوال ہے کہ اس قدر عرصہ میں بغیر کسی رہنما کے جماعت میں فساد پڑا تو اس کا ذمہ دار کون ہو گا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات کے موقع پر اس طرح ہُوا تھا کہ جو لوگ جمع ہو گئے تھے۔ انہوں نے مشورہ کر لیا تھا اور یہی طریق پہلے زمانہ میں بھی تھا۔ چھ چھ ماہ کا انتظار نہ کبھی پہلے ہُوا اور نہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے بعد۔

مولوی محمد علی صاحب نے جواب دیا کہ اب اختلاف ہے پہلے نہ تھا۔ دوسرے اس انتظار میں حرج ہی کیا ہے اگر خلیفہ نہ ہو تو اس میں نقصان کیا ہو گا؟ وہ کونسا کام ہے جو کل ہی خلیفہ نے کرنا ہے۔ آپ نے اُن کو جواب دیا کہ اس بات کا فیصلہ تو جماعت حضرت مسیح موعودؑ کی وفات پر ہی کر چکی ہے کہ اس جماعت میں سلسلۂ خلافت چلے گا۔ اس پر دوبارہ مشورہ بے معنی ہے اب یہ سوال نہیں اٹھایا جا سکتا۔ اگر مشورہ کا سوال ہے تو صرف تعیّن خلیفہ کے متعلق ہے۔ اور یہ جو آپ نے کہا ہے کہ خلیفہ کا کام کیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ خلیفہ کا کام علاوہ روحانی نگہداشت کے جماعت کو متحد رکھنا اور فساد سے بچانا ہے اور یہ کام نظر نہیں آیا کرتا کہ میں آپ کو معیّن کر کے بتا دوں۔ خلیفہ کا کام رُوحانی تربیت اور نظام کا قیام ہے نہ روحانی تربیت مادّی چیز ہے کہ میں بتا دوں کہ وہ یہ کام کرے گا اور نہ فساد کا کوئی وقت معیّن ہے کہ فلاں وقت تک اس کی ضرورت پیش نہ آوے گی۔ ممکن ہے کہ کل ہی کوئی امر ایسا پیش آجاوے جس کے لئے کسی نگران ہاتھ کی ضرورت ہو۔ پس آپ اس سوال کو جانے دیں کہ خلیفہ ہو یا نہ ہو۔ مشورہ اس امر کے متعلق ہونا چاہیئے کہ خلیفہ کون ہو۔ اس پر مولوی صاحب نے کہا اس میں دقّت ہے۔ چونکہ عقائد کا اختلاف ہے اس لئے تعیّن میں اختلاف ہو گا۔ ہم لوگ کسی ایسے شخص کے ہاتھ پر کیونکر بیعت کر سکتے ہیں جس کے ساتھ ہمیں اختلاف ہو۔ آپ نے جواب دیا کہ اوّل تو ان امور اختلافیہ میں اب تک کوئی ایسی بات نہیں جس میں اختلاف ہمیں ایک دوسرے کی بیعت سے روکے۔ لیکن بہرحال ہم اس امر کے لئے تیار ہیں کہ آپ میں سے کسی کے ہاتھ پر بیعت کر لیں۔ اس پر مولوی صاحب نے کہا کہ یہ مشکل ہے اور آپ جانتے ہیں کہ لوگوں کی کیا رائے ہے۔ غرض اس طرح کوئی فیصلہ ہوئے بغیر یہ گفتگو بھی ختم ہُوئی۔[1]

پس جب کہ کوئی صورت سمجھوتہ کی باقی نہ رہی اور مولوی محمد علی صاحب اور آپ کے رفقا حضرت خلیفہ اوّلؓ کی وصیت کے باوجود نظامِ خلافت قائم رکھنے پر راضی نہ ہوئے تو ۱۴ر مارچ ۱۹۱۴ء بروز ہفتہ قادیان میں حاضر الوقت احمدی احباب عصر کی نماز کے بعد انتخابِ خلافت کے لئے مسجد نُور میں

---

[1] اختلافِ سلسلہ کی تاریخ کے صحیح حالات ص۱۰۰، آئینۂ صداقت ص۱۸۰

جمع ہُوئے ۔ قریبًا دو ہزار کا مجمع تھا۔ سب سے پہلے نواب محمد علی خاں صاحب نے حضرت خلیفہ اوّل رضؓ کی وصیّت پڑھ کر سُنائی جس میں جماعت کو ایک ہاتھ پر جمع ہو جانے کی نصیحت تھی۔ مولانا سیّد محمد احسن صاحب امروہی رضؓ نے جو جماعت کے بڑے بزرگوں میں سے تھے کھڑے ہوکر تقریر کی اور خلافت کی ضرورت اور اہمیت بتا کر تجویز کی کہ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کے بعد میری رائے میں ہم سب کو حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب کے ہاتھ پر جمع ہو جانا چاہیئے کہ وہی ہر رنگ میں اس مقام کے اہل اور قابل ہیں۔ اس پر سب طرف سے ہاں حضرت میاں صاحب! حضرت میاں صاحب کی آوازیں اُٹھنے لگیں اور سارے مجمع نے بالاتفاق اور بالاصرار کہا کہ ہم اس تجویز کو بدل و جان قبول کرتے ہیں۔ اس وقت مولوی محمد علی صاحب اور اُن کے بعض رفقا بھی موجود تھے۔ مولوی محمد علی صاحب نے مولوی محمد احسن صاحبؓ کی تقریر کے بعد کچھ کہنا چاہا اور اپنے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھا کر لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی۔

اسی اثناء میں دوسری طرف سیّد میر حامد شاہ صاحبؓ کھڑے ہو گئے۔ دونوں کچھ کہنا چاہتے تھے مگر سیّد صاحب چاہتے تھے کہ وہ پہلے اپنا عندیہ بیان کریں اور مولوی صاحب اپنے خیالات پہلے سُنانا چاہتے تھے۔ ان دونوں بزرگوں میں کچھ دیر تک باہم رد وکد ہوتی رہی۔ سیّد صاحب مرحوم مولوی صاحب سے اور مولوی صاحب سیّد صاحب سے صبر اور انتظار کرنے کی درخواستیں کرتے رہے۔ وہ کہتے مجھے پہلے کچھ کہہ لینے دیں اور وہ فرماتے مجھے عرض کر لینے دیں۔ غرض اس طرح ایک مجادلہ کی صورت بن گئی۔ اس پر شیخ یعقوب علی صاحب عرفانی رضی اللہ عنہ نے جرأت کی اور عرض کیا کہ ان جھگڑوں میں یہ قیمتی وقت ضائع نہیں ہونا چاہیئے۔ ہمارے آقا حضرت صاحبزادہ صاحب ہماری بیعت قبول فرمائیں اس پر حاضرینِ مجلس بلاتوقف بے اختیار لبیک لبیک کہتے ہُوئے حضرت صاحبزادہ صاحب کی طرف بڑھے۔

یہ نظّارہ اور لوگوں کا جوش و خروش کسی دیکھنے والے کو بھول نہ سکتا تھا۔ لوگ چاروں طرف سے بیعت کے لئے ٹوٹے پڑتے تھے اور یوں نظر آتا تھا کہ خدائی فرشتے لوگوں کے دلوں کو پکڑ پکڑ کر منشائے ایزدی کی طرف کھینچے لا رہے ہیں۔ اس وقت شوق کا یہ عالم تھا کہ لوگ ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے۔ چاروں طرف سے آواز اُٹھ رہی تھی کہ حضور! ہماری بیعت قبول کریں۔ حضور! ہماری بیعت قبول کریں۔ حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب نے چند لمحات کے تأمل کے بعد جس میں ایک عجیب قسم کا عالمِ تفکر تھا، فرمایا مجھے تو بیعت کے الفاظ بھی یاد نہیں۔ اس پر مولوی سیّد سرور

شاہ صاحبؓ نے کہا میں بیعت کے الفاظ بولتا جاتا ہوں۔ آپ اُن کو دُہراتے ہوتے لوگوں کی بیعت لینا قبول کریں۔

غرض جب حاضر الوقت لوگوں کا اصرار بڑھا تو آپ نے پُوری ذمہ داری محسوس کرتے ہُوئے اپنا ہاتھ بیعت لینے کے لئے بڑھایا اور بیعت شروع ہوگئی۔ الفاظِ بیعت کا سُننا تھا کہ یک لخت مجلس پر ایک سناٹا چھا گیا۔ جو لوگ قریب نہیں پہنچ سکتے تھے انہوں نے اپنی پگڑیاں پھیلا کر یا ایک دوسرے کی پیٹھوں پر ہاتھ رکھ کر بیعت کے الفاظ دہرائے [۱] اور اس طرح خدا کے مسیح کی یہ پیش خبری مکرّر بڑی شان کے ساتھ پوری ہُوئی کہ "میں خدا کی ایک مجسّم قدرت ہوں اور میرے بعد بعض اور وجود ہوں گے جو دوسری قدرت کا مظہر ہوں گے۔"

بیعت کے بعد لمبی دُعا ہوئی پھر حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃُ المسیح الثّانی اَیَّدَہُ اللہُ تَعَالٰی بِنَصْرِہِ الْعَزِیْز نے ایک رُوح پرور اور سکینت بخش تقریر فرمائی۔ آپ نے فرمایا:

"دوستو! میرا یقین اور کامل یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ میرے پیارو! پھر میرا یقین ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول اور خاتم الانبیاء ہیں۔ میرا یقین ہے کہ آپ کے بعد کوئی شخص نہیں آسکتا جو آپ کو دی ہُوئی شریعت میں سے ایک شعشہ بھی منسُوخ کر سکے۔ میرے پیارو! میرا وہ محبوب آقا سید الانبیاءؐ ایسی عظیم الشان شان رکھتا ہے کہ ایک شخص اُس کی غلامی میں داخل ہو کر کامل اتباع اور وفاداری کے بعد نبیوں کا رُتبہ حاصل کر سکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ایسی شان اور عزت ہے کہ آپ کی سچی غلامی میں نبی پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ میرا ایمان ہے اور پُورے یقین سے کہتا ہوں۔ پھر میرا یقین ہے کہ قرآن مجید وہ پیاری کتاب ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہُوئی ہے اور وہ خاتمُ الکتب اور خاتم شریعت ہے۔ پھر میرا یقین کامل ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام وہی نبی تھے جس کی خبر مسلم میں ہے اور وہی امام تھے جس کی خبر بخاری میں ہے۔ پھر میں کہتا ہوں کہ شریعتِ اسلامی

---

[۱] آئینہ صداقت صفحہ ۱۰۹ ، خلافتِ ثانیہ کا قیام صفحہ ۳۶

میں کوئی حصہ اب منسوخ نہیں ہو سکتا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اعمال کی اقتدا کرو۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں اور کامل تربیت کا نمونہ تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دوسرا جو اجماع ہُوا وہ خلافتِ حقّہ راشدہ کا سلسلہ ہے۔ خُوب غور سے دیکھ لو اور تاریخِ اسلام میں پڑھ لو کہ جو ترقی اسلام کی خلفائے راشدین کے زمانہ میں ہُوئی جب وہ خلافت محض ملوکیّت کے رنگ میں تبدیل ہو گئی تو گھٹتی گئی یہاں تک کہ اب جو اسلام اور اہلِ اسلام کی حالت ہے تم دیکھتے ہو۔ تیرہ[۱۳] سو سال کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس منہاجِ نبوّت پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وعدوں کے موافق بھیجا اور اُن کی وفات کے بعد پھر وہی سلسلہ خلافت راشدہ کا چلا ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح مولانا نور الدین صاحبؓ اُن کا درجہ اعلیٰ علیین میں ہو۔ اللہ تعالیٰ کروڑوں کروڑ رحمتیں اور برکتیں اُن پر نازل کرے جس طرح پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی محبت اُن کے دِل میں بھری ہُوئی اور اُن کے رگ و ریشہ میں جاری تھی، جنّت میں بھی اللہ تعالیٰ انہیں پاک وجودوں اور پیاروں کے قرب میں آپ کو اکٹھا کرے اس سلسلہ کے پہلے خلیفہ تھے۔ اور ہم سب نے اسی عقیدہ کے ساتھ اُن کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ پس جب تک یہ سلسلہ چلتا رہے گا' اسلام مادی اور روحانی طور پر ترقی کرتا رہے گا.....

مَیں تمہیں سچ سچ کہتا ہوں کہ میرے دل میں ایک خوف ہے اور اپنے وجود کو بہت ہی کمزور پاتا ہوں۔ حدیث میں آیا ہے کہ تم اپنے غلام کو وہ کام مت بتاؤ جو وہ کر نہیں سکتا۔ تم نے مجھے اس وقت غلام بنانا چاہا ہے تو وہ کام مجھے نہ بتانا جو میں نہ کر سکوں۔ میں جانتا ہوں کہ میں کمزور اور گنہگار ہوں میں کس طرح دعویٰ کر سکتا ہوں کہ دُنیا کی ہدایت کر سکوں گا اور حق اور راستی کو پھیلا سکوں گا۔ ہم تھوڑے ہیں اور اسلام کے دشمنوں کی تعداد بہت

زیادہ ہے مگر اللہ تعالیٰ کے فضل اور کرم اور غریب نوازی پر ہماری امیدیں بے انتہا ہیں۔ تم نے یہ بوجھ مجھ پر رکھا ہے تو سنو! اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے میری مدد کرو اور وہ یہی ہے کہ خدا تعالیٰ سے فضل اور توفیق چاہو اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور فرمانبرداری میں میری اطاعت کرو۔ میں انسان ہوں اور کمزور انسان۔ مجھ سے کمزوریاں ہوں گی تو تم چشم پوشی کرنا۔ تم سے غلطیاں ہوں گی تو میں خدا تعالیٰ کو حاضر ناظر سمجھ کر عہد کرتا ہوں کہ میں چشم پوشی اور درگذر کروں گا۔ اور میرا اور تمہارا متحدہ کام اس سلسلہ کی ترقی اور اس سلسلہ کی غرض و غایت کو عملی رنگ میں پیدا کرنا ہے۔ پس اَب جو تم نے میرے ساتھ ایک تعلق پیدا کیا ہے اس کو وفاداری سے پُورا کرو۔ تم مجھ سے اور میں تم سے چشم پوشی خدا کے فضل سے کرتا رہوں گا۔ تمہیں امر بالمعروف میں میری اطاعت اور فرمانبرداری کرنی ہوگی۔ ... ہاں میں پھر کہتا ہوں اور پھر کہتا ہوں کہ امرِ معروف میں میری خلاف ورزی نہ کرنا۔ اگر اطاعت اور فرمانبرداری سے کام لوگے اور اس عہد کو مضبوط کروگے تو یاد رکھو اللہ تعالیٰ کا فضل ہماری دستگیری کرے گا۔ اور ہماری متحدہ دعائیں کامیاب ہوں گی ... جس کام کو مسیح موعودؑ نے جاری کیا تھا اپنے موقع پر وہ امانت میرے سپرد ہوئی ہے۔ پس دُعائیں کرو اور تعلقات بڑھاؤ اور قادیان آنے کی کوشش کرو اور بار بار آؤ۔ میں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے سُنا ہے اور بار بار سُنا ہے کہ جو یہاں بار بار نہیں آتا اندیشہ ہے کہ اس کے ایمان میں نقص ہو۔ اسلام کا پھیلانا ہمارا پہلا کام ہے۔ مل کر کوشش کرو تاکہ اللہ تعالیٰ کے احسانوں اور فضلوں کی بارش ہو۔ میں پھر تمہیں کہتا ہوں، پھر کہتا ہوں اور پھر میں کہتا ہوں اب جو تم نے بیعت کی ہے اور میرے ساتھ ایک تعلق حضرت مسیح موعود کے بعد قائم کیا ہے اُس تعلق میں وفاداری کا نمونہ دکھاؤ اور مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھو میں ضرور تمہیں یاد رکھوں گا۔ ہاں یاد رکھتا بھی رہا ہوں۔ کوئی دُعا میں نے آج تک ایسی نہیں کی جس میں مَیں نے

سلسلہ کے افراد کے لئے دُعا نہ کی ہو۔ مگر اب آگے سے بھی زیادہ یاد رکھوں گا۔ مجھے کبھی پہلے بھی دُعا کے لئے کوئی ایسا جوش نہیں آیا، جس میں احمدی قوم کے لئے دُعا نہ کی ہو۔ پھر سُنو کہ کوئی کام ایسا نہ کرو جو اللہ تعالیٰ کے عہد شکن کیا کرتے ہیں۔ ہماری دُعائیں یہی ہوں کہ ہم مسلمان جئیں اور مسلمان مریں۔ آمین"۔[1]

دُعا اور تقریر کے بعد حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے تعلیم الاسلام ہائی سکول کے شمالی میدان میں قریباً اڑھائی ہزار اشکبار مخلصین جماعت کے ساتھ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور پھر آپ کی معیت میں احباب حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کی نعش مبارک کو لے کر بہشتی مقبرہ کی طرف روانہ ہوئے اور وہاں پہنچ کر اس مبارک وجود کو ہزاروں دعاؤں کے ساتھ اس کے محبوب آقا کے پہلو میں دفن کیا۔

حضرت اقدس خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کے وصال کے ساتھ جماعت احمدیہ کی تاریخ کا ایک اَور زرّیں باب بند ہُوا اَور ایک اور زرّیں باب کھُلا۔ اگرچہ مذہبی قوموں کی زندگی میں بھی عظیم مخلص رہنما بہت بڑا کردار ادا کرتے ہیں اور قومی تاریخ کے اوراق پر اپنی عظمت کے انمٹ نقوش ثبت کر جاتے ہیں لیکن قومیں اُن کی زندگی سے زندگی تو پاتی ہیں، اُن کے مرجانے سے مر نہیں جاتیں۔ بلکہ ایک عرب شاعر کے اس لازوال شعر کے مصداق ایک کے بعد دوسرا عظیم سردار اُن کے جھنڈے کو مضبوط ہاتھوں میں تھامے ہُوئے اُن کی رہنمائی کے لئے آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ زندہ قوموں کی کیسی سچی اور پاکیزہ تصویر اس شعر میں کھینچی گئی ہے کہ:

اذا سید منا خلا قام سید
قؤل لما قال الکرام فعول

یعنی جب ہم میں سے ایک سردار گزر جاتا ہے تو اس کی جگہ ویسا ہی ایک دوسرا اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ قوم کے صاحب اکرام بزرگوں نے جو اچھی باتیں کہی تھیں، وہ ویسی ہی اچھی باتیں بڑی کثرت سے کہتا ہے اور گفتار کا غازی نہیں بنتا بلکہ کردار کا بھی غازی ہوتا ہے۔ جماعت احمدیہ کی تاریخ کا ہر باب جو ایک دَور پر بند ہوتا اور ایک نئے دَور پر کھُلتا ہے، اس شعر کی صداقت پر مُہرِ تصدیق ثبت کرتا چلا جاتا ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ نے بڑے مشکل مقام پر قدم رکھا تھا لیکن اپنی کمزور صحت

---

[1] الفضل ۲۱ر مارچ ۱۹۱۴ء

دُکھتے بدن اور بڑھاپے کے سو عوارض کے باوجود بڑی جوانمردی، ہمّت، استقلال اور غیر متزلزل توکل کے ساتھ خلافتِ مسیحِ موعودؑ کی عظیم ذمہ داریوں کو نبایا۔ فتنوں کی آندھیاں چلیں مگر آپ کے پائے ثبات کو ایک ذراسی لغزش بھی نہ دے سکیں اور خلافتِ احمدیہ کی جو عظیم امانت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کے سپرد کی گئی تھی، اس کے تقدس پر آپ نے آنچ نہ آنے دی۔ آپ کے وصال پر آج ساٹھ برس گزر چکے ہیں لیکن آج بھی احمدیت کے بلند و بالا گنبدوں سے آپ کے ان پُر شوکت الفاظ کی بازگشت سنائی دیتی ہے کہ :۔

❀ = خلیفہ بنانا انسان کا کام نہیں۔ یہ خدا تعالیٰ کا اپنا کام ہے۔

❀ = خدا تعالیٰ کے بنائے ہوئے خلیفہ کو کوئی طاقت معزول نہیں کرسکتی۔

❀ = جھُوٹا ہے وہ شخص جو کہتا ہے کہ ہم نے خلیفہ بنایا۔

❀ = مجھے تم میں سے کسی کا خوف نہیں اور بالکل نہیں، ہاں میں صرف خدا ہی کا خوف رکھتا ہوں۔

❀ = اگر کوئی کہے کہ انجمن نے خلیفہ بنایا ہے تو وہ جھُوٹا ہے اس قسم کے خیالات ہلاکت کی حد تک پہنچاتے ہیں تم ان سے بچو۔ پھر سُن لو کہ مجھے نہ کسی انسان نے نہ کسی انجمن نے خلیفہ بنایا ہے اور نہ میں کسی انجمن کو اس قابل سمجھتا ہوں کہ وہ خلیفہ بنائے۔

❀ = مجھ کو نہ کسی انجمن نے (خلیفہ) بنایا اور نہ میں اس کے بنانے کی قدر کرتا ہوں اور اس کے چھوڑ دینے پر تھوکتا بھی نہیں اور نہ اب کسی میں طاقت ہے کہ وہ اس خلافت کی ردا کو مجھ سے چھین لے۔

❀ = یہ اعتراض کرنا کہ خلافت حق دار کو نہیں پہنچی رافضیوں کا عقیدہ ہے، اس سے توبہ کرلو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے جس کو حق دار سمجھا خلیفہ بنایا۔ جو اس کی مخالفت کرتا ہے وہ جھوٹا اور فاسق ہے۔

❀ = خلافت کیسری کی دکان کا سوڈا واٹر نہیں۔ تم اس بکھیڑے سے کچھ فائدہ نہیں اُٹھا سکتے ... میں جب مرجاؤں گا تو پھر وہی کھڑا ہوگا جسکو خدا چاہے گا اور خدا اُسکو آپ کھڑا کردے گا۔

❀ = مجھے خدا نے خلیفہ بنا دیا ہے اور نہ اب تمہارے کہنے سے معزول ہوسکتا ہوں اور نہ کسی میں طاقت ہے کہ وہ معزول کرے۔ اگر زیادہ زور دوگے تو یاد رکھو میرے پاس ایسے خالد بن ولید ہیں جو تمہیں مرتدوں کی طرح سزا دیں گے۔

وہ خالد کون تھا جس کی تیغِ براں خلافتِ احمدیہ کے دائیں اور بائیں اور آگے اور پیچھے شہب آسمانی

کی طرح چمکتی اور ہر شیطانِ مارد کو دھتکار رہی تھی۔ یہ وہی ایازِ نور تو تھا جو بعد میں تاریخِ احمدیت کے اُفق پر محمود بن کر اُبھرا اور باون^{۵۲} برس تک مسندِ خلافت پر جلوہ افروز رہا۔

انکارِ خلافت کا فتنہ اور اس کی مختلف اشکال

پیشتر اس کے کہ ہم اس دورِ محمودیت کے روشن باب میں داخل ہوں، ہمیں چند لمحے یہاں توقف کر کے اُس فتنے کی حقیقت سے متعلق کچھ مزید عرض کرنے کی اجازت دیجئے جو انکارِ خلافت کی صُورت میں مختلف وقتوں میں حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کے مبارک عہد میں بار بار سر اٹھانے کی کوشش کرتا رہا اور بالآخر تقدیرِ الٰہی نے خلافتِ اُولیٰ اور خلافت ثانیہ کے سنگھم پر اس کی مرکزی جڑوں کو قادیان کی سرزمین سے اکھاڑ پھینکا۔ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب کی سیرت اور کردار سے اس مضمون کا گہرا تعلق ہے کیونکہ عہدِ خلافتِ اُولیٰ میں بھی اور بعد میں اپنی باون سالہ خلافت کے درخشندہ دَور میں بھی آپ نے خلافتِ احمدیہ کے استحکام کے لئے عظیم الشان جدوجہد کی۔ یہ آپ کی انتھک محنت اور کاوش اور طویل تعلیم و تربیت ہی کا نتیجہ تھا کہ جماعت احمدیہ کے اندر خلافت کا مقام ایسا واضح ہو گیا اور قلوب کی گہرائیوں میں اس شجرۂ طیبہ کی جڑیں ایسی مضبوطی کے ساتھ پیوستہ ہو گئیں کہ فتنوں کی تیز و تند آندھیاں پھر کبھی اُن کے پائے ثبات کو لرزاں نہ کر سکیں۔

ابھی ذکر گزرا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیّت نے منکرینِ خلافت کو خلافتِ ثانیہ کے آغاز ہی میں قادیان چھوڑ کر چلے جانے پر مجبور کر دیا اور اس طرح اس گروہ کا تعلق احمدیت کے مرکزی تنے سے ہمیشہ کے لئے کٹ گیا۔ لیکن اس کے باوجود چونکہ منکرینِ خلافت بھی احمدیت ہی کی طرف منسوب رہے لہٰذا عملاً احمدیت کے نام پر دنیا کے سامنے دو تحریکیں پہلو بہ پہلو چل پڑیں۔ یقیناً احبابِ جماعت کے لئے یہ تقسیم ایک بہت تکلیف دہ امر تھا۔ پس اس گروہ کو نصائح اور انذار کے ذریعہ سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ مصالحت اور مفاہمت کی کوششوں میں بالخصوص حضرت صاحبزادہ صاحب پیش پیش رہے لیکن جیسا کہ دو مرتبہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو رؤیا کے ذریعہ خبر دی تھی نظریات کے اختلاف نے بالآخر تفرقہ کی صورت اختیار کرنی ہی تھی اور ایک گروہ کا کٹ کر جماعت سے الگ ہو جانا گویا تقدیرِ مبرم تھا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس اہم سانحہ کی خبر صرف صاحبزادہ صاحب ہی کو نہیں دی گئی تھی بلکہ ان سرکردہ احباب کو بھی اللہ تعالیٰ نے مکرّر تنبیہ فرمائی جو تحریکِ انکارِ خلافت کے بانی مبانی تھے۔ چنانچہ اس ضمن میں مکرم محترم چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب کی مندرجہ ذیل روایت بڑی عبرتناک ہے!

"خواجہ صاحب اور میں ایک دفعہ سینما میں ملکہ الزبتھ کا ڈرامہ دیکھنے کے لئے گئے۔ اس میں ایک منظر یہ تھا کہ ارل آف ایسیکس کو بغاوت کے جرم میں موت کی سزا ملتی ہے۔ ایک لکڑی کے چبوترے پر جلاد کلہاڑی لئے کھڑا ہے۔ ایسیکس کو اس چبوترے پر لٹا دیا گیا اور اس نے اپنا سر لکڑی کے ایک بلاک پر رکھ دیا۔ جونہی جلاد نے تصویر میں کلہاڑی اُٹھائی کہ ایسیکس کا سر قلم کر دے تو خواجہ صاحب سخت دہشت زدہ ہو گئے اور نہایت اضطراب کی حالت میں مجھ سے کہنا شروع کیا کہ اُٹھو جلدی اُٹھو، یہاں سے نکل جائیں۔ چنانچہ میں بھی خواجہ صاحب کی حالت دیکھ کر گھبرا گیا اور اُن کے پیچھے پیچھے باہر نکل آیا۔ باہر نکل کر خواجہ صاحب نے مکان کا رستہ تو نہ لیا۔ ایک ایسی سڑک پر سراسیمگی کی حالت میں چلتے گئے جو دریا پار ایک کھلے علاقہ کی طرف جاتی تھی۔ کوئی نصف میل تک جا کر ان کی طبیعت سنبھلی تو انہوں نے مجھ سے دریافت کیا' تم کیا سمجھے میری پریشانی کی کیا وجہ تھی؟ میں نے کہا مجھے تو یہی خیال ہوتا ہے کہ شاید آپ کو سردی سے کچھ تکلیف ہو گئی۔ خواجہ صاحب نے کہا' نہیں مجھے سردی سے تو اِس ملک میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ میں تو اس منظر کو دیکھ کر ڈر گیا تھا۔ کیونکہ مجھے اپنا ایک خواب یاد آ گیا تھا۔ خواجہ صاحب نے کہا کہ یہ اُن دِنوں کا ذکر ہے جب مئی ۱۹۰۸ء میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ہمارے مکانوں میں لاہور ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ مجھے اور مولوی محمد علی اور تین چار اور لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور ہم سے کہا گیا ہے کہ تم لوگوں نے بغاوت کی ہے' تمہیں بادشاہ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ چنانچہ ہمیں ایک ایسے کمرے میں لے جایا گیا جو چیف کورٹ کے فرسٹ بنچ کے کمرے کی طرح ہے اور اس کے ایک طرف ایک چبوترے پر ایک تخت بچھا ہوا ہے جس پر بادشاہ بیٹھا ہے۔ میں نے غور سے جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ بادشاہ مولوی نور الدین صاحب ہیں۔ انہوں نے ہم سے مخاطب ہو کر کہا تم نے ہمارے خلاف بغاوت کی ہے' بتاؤ تمہیں کیا سزا

دی جائے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ اب بادشاہ ہیں جیسے چاہیں تجویز کریں۔
اس پر مولوی صاحب نے کہا اچھا ہم تم کو جلاوطن کرتے ہیں۔ اس کے
تھوڑے عرصہ بعد حضرت صاحب کی وفات ہوگئی اور مولوی صاحب خلیفہ
ہوگئے۔ پھر دوسری دفعہ میں نے خواب دیکھا کہ ہم پھر گرفتار کئے گئے ہیں
اور مثلِ سابق ہماری پیشی بادشاہ کے سامنے ہوئی۔ اس دفعہ مولوی
صاحب نے فرمایا تم نے دوبارہ بغاوت کی ہے۔ ہم حکم دیتے ہیں کہ تمہارا
سر کاٹ ڈالا جائے۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل میں مجھے ایک ایسے ہی چبوترے
پر لٹا دیا گیا جیسا اس تصویر میں تھا اور جلاد نے کلہاڑی میری گردن پر چلائی
جس سے میں سخت خوفزدہ ہو کر بیدار ہوگیا۔ اور بیدار ہو کر بھی بہت عرصہ
اس خواب کی دہشت اور ہیبت مجھ پر طاری رہی۔ اب جو میں نے
وہی نظارہ تصویر میں دیکھا تو ویسے ہی میری طبیعت پر خوف طاری ہوگیا
اور میں اس کی برداشت نہ کر سکا۔"[1]

جیسا کہ مکرم خواجہ صاحب کی رؤیا سے واضح ہے آپ اور آپ کے ہم خیال رفقاء کی بطور سرزنش قادیان سے علیحدگی مقدر تھی چنانچہ بعینہٖ اس تنبیہ کے مطابق خلافتِ ثانیہ کے آغاز کے تھوڑے عرصہ کے اندر ہی یہ لوگ قادیان چھوڑ کر چلے گئے اور لاہور میں اس مقام پر جو "احمدیہ بلڈنگس" کے نام سے مشہور ہے۔ "احمدیت" کے ایک نئے مرکز کی بناء ڈالی۔ لیکن یہ گمان کرنا بھی درست نہیں کہ اس گروہ کی علیحدگی کے بعد انکارِ خلافت کا فتنہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا جیسا کہ بعد کی تاریخ بتائے گی مختلف وقتوں اور شکلوں میں یہ فتنہ بعد میں بھی سر اٹھاتا رہا لیکن جماعت کی بہت بھاری اکثریت اس سے اس حد تک متنبہ اور خبردار ہو چکی تھی کہ پھر کبھی اسے وبا کی صورت میں پھیلنے کی توفیق نہ ملی۔ ہاں اِکا دُکا کمزور طبیعتوں کی ہلاکت کا موجب بن کر یہ پھر اپنی کمین گاہوں میں جا چھپتا رہا۔ ایک موعود مصلح کی حیثیت سے حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب کے تمام کارناموں پر یکجائی نظر ڈالی جائے تو آپ کا یہ کارنامہ بلاشبہ ایک امتیازی شان اور دلربا چمک کے ساتھ نظر کو اپنی جانب کھینچے گا کہ آپ نے بفضلہٖ تعالیٰ احمدیوں کے قلوب میں خلافت کی عظمت اور اہمیت کو ہمیشہ کے لئے واضح اور جاگزیں اور راسخ کر دیا اور اختلاف اور افتراق کے فلسفہ اور محرکات کو بار بار ایسی وضاحت کے ساتھ

---

[1] ماہنامہ "الفرقان" سالنامہ - نومبر - دسمبر ۱۹۶۲ء صفحہ ۴۴-۴۵

جماعت کے سامنے رکھا کہ نظامِ خلافت کو سبوتاژ کرنے کے لئے جب بھی اور جس لباس میں بھی کوئی تحریک اُٹھی جماعت نے بلا توقف اسے پہچانا اور سختی سے ردّ کر دیا۔

بعد میں اُٹھنے والے اس نوع کے دوسرے فتنوں پر تفصیلی بحث کا یہاں موقع نہیں۔ لیکن چونکہ مؤمنین کی تطہیر اور آزمائش کے لئے آئندہ بھی اس قبیل کے فتنوں کا وقتاً فوقتاً رونما ہوتے رہنا مقدر معلوم ہوتا ہے اس لئے خصوصاً احمدیت کی نئی نسل کی تعلیم کی خاطر اگر یہاں اس کا مختصر تجزیاتی مطالعہ پیش کر دیا جائے تو بے فائدہ نہ ہوگا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کے دور میں جو انکارِ خلافت کا فتنہ اُٹھا اس کے نقوش کے بغور مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مذہبی دُنیا میں رُونما ہونے والا کوئی نیا اور الگ فتنہ نہیں تھا بلکہ الٰہی جماعتوں کی تنظیم کو کمزور کرنے اور مرکزیت کو پراگندہ کرنے کے لئے ہمیشہ مذہبی دُنیا میں اسی شکل وصورت کے فتنے برپا ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی تا قیامت برپا ہوتے رہیں گے۔ ذیل میں شق وار اس کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے:-

امامِ وقت پر آمریت کا الزام

حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ پر ایک خطرناک اعتراض یہ کیا جاتا تھا کہ آپ جماعت پر اپنا حکم ٹھونس کر آمر بن بیٹھے ہیں اور جماعت کے جمہوری نظام کو آمریت میں تبدیل کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قرآن کریم کی شہادت کے مطابق گزشتہ انبیاء علیہم السلام پر بھی اسی قسم کے اعتراض کئے گئے بلکہ حضرت شعیب علیہ السلام کی جمہوریت پسند قوم نے تو آپ کے انکار کی ایک بڑی دلیل یہ پیش کی کہ ہم اپنے معاملات میں تمہارے حکم کے تابع کیسے ہوسکتے ہیں۔ اسی طرح تاریخِ اسلام سے ثابت ہے کہ مدینہ کے یہودی اور منافقین خود سیّد ولدِ آدم حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی اعتراض کرتے اور اہلِ مدینہ کو اس بناء پر بدظن کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ نعوذ باللہ اسلام کا رسول آمر بننے کی کوشش کرتا ہے۔

پس یہ جمہوریت کی رَٹ کوئی نئے زمانہ کی پیداوار نہیں نہ ہی جدید روشنی اور ترقی یافتہ تہذیب و تمدن سے اس کا کوئی تعلق ہے۔ بلکہ جب سے خدا تعالیٰ کے مقرر کردہ اُولی الامر دُنیا میں آرہے ہیں جمہوریت کے نام پر اُن کے خلاف بغاوت پر اُکسانے کی کوششیں بھی ہوتی رہی ہیں۔ اگرچہ دنیوی آمر

اور مذہبی رہنما کے اُولی الامر ہونے کے مابین قطبین کا بُعد ہے لیکن آمر کے لفظی اشتراک کے باعث بعض اوقات فتنہ پرداز عامۃ الناس کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ آمر اور اولی الامر میں متعدد دوسرے بنیادی اختلافات کے علاوہ جن پر انسان ادنیٰ سے تدبر سے اطلاع پا سکتا ہے۔ ایک فرق یہ ہوتا ہے کہ جب کہ آمر ایک مادر پدر آزاد اور جابر حاکم ہوتا ہے جس کی حکومت بیرونی پابندیوں سے ناآشنا اور جبر و اکراہ پر مبنی ہوتی ہے۔ اُولی الامر بیک وقت ایک پہلو سے آمر اور ایک پہلو سے مامور ہوتا ہے اور براہِ راست جسموں پر نہیں بلکہ دلوں کی معرفت اجسام پر حکومت کرتا ہے۔ وہ ایک مذہبی ضابطۂ حیات اور دستورُ العمل کے اس حد تک تابع ہوتا ہے کہ سرِمُو بھی اس سے انحراف نہیں کر سکتا اور اتنے اخلاص اور فروتنی اور احترام کے ساتھ اس کے ایک ایک نقطے پر عمل پیرا ہوتا ہے کہ کوئی دنیوی جمہوریت کا پرستار اس کا عشرِ عشیر بھی اپنے جمہوری دستور کا احترام نہیں کرتا۔ آمر کا تو معاملہ ہی الگ ہے۔ ایک جمہوری حکمران بھی جب چاہے اپنی چرب زبانی اور اثر و رسوخ سے کام لے کر بنیادی جمہوری دستور کی ہر اس شق کو تبدیل کروا سکتا ہے جسے وہ ناپسند کرے لیکن ایک اُولی الامر مامور من اللہ کو اتنی بھی قدرت نہیں کہ قانونِ شریعت کا ایک شعشہ بھی اپنے مقام سے ٹال سکے۔

المختصر یہ کہ ایک مامور من اللہ پر دنیاوی معنوں میں "آمر" ہونے کا الزام لگانا یا تو جہالت کے نتیجہ میں ہو سکتا ہے یا اندھی دشمنی کے نتیجہ میں۔ تیسری کوئی صورت ذہن میں نہیں آتی۔ ایک مامور من اللہ کے خلیفہ پر یہ الزام عاید کرنا تو بدرجہ اَولیٰ غلط ہے کیونکہ وہ تو اپنے فیصلوں میں دُوہری پابندیوں میں جکڑا ہُوا ہوتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے خلفاء کا معاملہ تو اس اعتراض سے اور بھی دُور تر ہو جاتا ہے کیونکہ یہ خلفاء تو ایک ایسے مامور من اللہ کے تابع فرمان ہیں جس کا پور پور سید المامورین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ عالیہ کے بندھنوں میں عاشقانہ اور والہانہ جکڑا ہُوا تھا۔

پہلے امام یا خلیفہ کی مخالفت کا الزام

دوسرا اعتراض جو منکرینِ خلافت اور منافقین حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کی ذات بابرکات پر کرتے رہے وہ یہ تھا کہ نعوذ باللہ آپ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے منشاء اور وصیت کو پسِ پشت ڈالتے ہُوئے انجمن کی حکمرانی کی بجائے خلافت کو جماعت پر ٹھونس دیا ہے۔

یہ اعتراض بھی کوئی نیا نہیں کیونکہ قدیم سے منافقین کی یہ عادت چلی آئی ہے کہ ایک امام کی

زندگی میں تو اس پر اعتراض کرتے یا اس کے فیصلوں کو با دل نخواستہ قبول کرتے ہیں اور کسی پہلو سے بھی اطاعت کرنے والوں کی صفِ اوّل میں اُن کا شمار نہیں کیا جا سکتا لیکن جب وہ امام گزر جاتا ہے اور اس کے تابع فرمان مخلصین کی صفِ اوّل میں سے ایک نیا امام اس کا جانشین مقرر ہوتا ہے تو اس امام پر یہ الزام لگانے لگتے ہیں کہ وہ گذشتہ امام کے فیصلوں کا احترام نہیں کرتا۔

تاریخ سے ثابت ہے کہ سیّد وُلدِ آدم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک خلفاءؓ کو بھی بارہا اسی قسم کے طعنوں کے چرکے دیئے گئے اور اُن کے فیصلوں کو یہ کہہ کر چیلنج کیا گیا کہ نعوذ باللہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات یا تعامل کے خلاف ہے۔ سادگی اور لاعلمی میں بھی یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے اور بعض اوقات نہایت اخلاص اور صاف نیت کے ساتھ اس خیال سے بھی ایسی بات کر دی جاتی ہے کہ ممکن ہے خلیفہ وقت کے ذہن میں متعلقہ ارشادِ نبوی یا گذشتہ خلیفہ کا فیصلہ مستحضر نہ ہو۔ اس طریق پر اگر بات کی جائے تو یہ تقویٰ کے خلاف نہیں۔ لیکن یہاں جس قبیل کے معترضین کا ذکر ہے وہ مومنین کی جماعت میں حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کے خلاف یہ بدظنی پھیلانے کی کوشش کرتے تھے کہ نعوذ باللہ آپ عمداً حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ارشادات کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے جماعت کو غلط راستے پر ڈال رہے ہیں۔ حالانکہ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے جو فدائیت اور عشق اور اطاعت شعاری کی نسبت تھی اس کا عشرِ عشیر بھی ان معترضین کو نصیب نہ تھا۔

اس ضمن میں میاں محمد عبداللہ صاحب حجام کی ایک روایت بڑی بصیرت افروز ہے جو انہوں نے کچھ عرصہ قبل راقم الحروف سے بیان کی۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ وہ قادیان میں حضرت میاں شریف احمد صاحب کی کوٹھی حجامت بنانے کی غرض سے گئے تو دورانِ انتظار صوبہ سرحد کے ایک معزز دوست غلام محمد خانصاحب بھی ملاقات کی غرض سے تشریف لے آئے لیکن کرسی کے اوپر بیٹھنے کی بجائے بڑے عاجزانہ رنگ میں زمین پر بیٹھ رہے۔ جب حضرت میاں شریف احمد صاحب رضی اللہ عنہ باہر تشریف لائے تو تیزی سے بڑھ کر اُن کو اُٹھایا کہ اوپر تشریف رکھیں لیکن وہ زمین پر بیٹھنے پر مصر رہے۔ بالآخر حضرت میاں صاحبؓ کے اصرار کے بعد گزارش کی کہ دراصل میرے دل پر ایک واقعہ کا بڑا گہرا اثر ہے۔ اس لئے میں اپنے لئے خاکساری کو ہی پسند کرتا ہوں۔ اور وہ واقعہ یہ سُنایا کہ حضرت اقدس مسیحِ موعود علیہ السلام کی زندگی میں جب کبھی ہم قادیان آتے تو ہمیشہ ایک بوڑھے آدمی کو بڑی عاجزی اور انکساری کے ساتھ جوتیوں میں بیٹھے ہوئے دیکھتے۔ جب حضور کا وصال ہُوا تو ہم بھی جلد از جلد قادیان

پہنچے تاکہ اپنے محبوب کا آخری دیدار کر سکیں۔ قادیان پہنچتے ہی ہمیں خبر ملی کہ بہشتی مقبرہ کے ملحقہ باغ میں جماعت کے نئے امام خلیفۃ المسیح بیعت لے رہے ہیں۔ چنانچہ ہم بھی دوڑتے ہوئے وہاں حاضر ہوئے لیکن ہمارے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب دیکھا کہ وہی جوتیوں میں بیٹھنے والا بوڑھا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے پہلے خلیفہ کی حیثیت سے بیعت لے رہا تھا۔ میاں عبداللہ صاحب بیان کرتے ہیں کہ یہ بتاتے ہوئے اُن پر سخت رقّت طاری ہو گئی اور روتے ہوئے کہا کہ اس وقت ہم نے سوچا کہ اللہ کی شان ہے کہ مسیح موعودؑ کی جوتیوں میں بیٹھنے والا یہ بوڑھا آج مسندِ خلافت پر رونق افروز ہے
ستم ظریفی دیکھئے کہ اسی انتہائی منکسر المزاج بزرگ پر بعد ازاں تکبّر اور نخوت کے الزام لگائے گئے اور وہ لوگ جو خود اطاعت کے مفہوم ہی سے نابلد تھے اسی عاشقِ صادق اور اطاعت مجسّم بزرگ پر یہ اعتراض بھی کرنے لگے کہ نعوذ باللہ آپ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے منشائے مبارک اور وصیّت کی کھلم کھلا خلاف ورزی کرتے ہوئے جماعت کو غلط راستے پر ڈال رہے ہیں۔
یہ ستم ظریفی تو ہے لیکن تعجب کی بات نہیں کیونکہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا آیا ہے اور ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ اور خدا کے برگزیدہ بندے ادنیٰ ادنیٰ انسانوں کے ہاتھوں دُکھ اُٹھاتے رہیں گے۔

قومی اموال میں غلط تصرّف کا الزام

ایک اعتراض یہ اُٹھایا گیا کہ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کو نعوذ باللہ جماعتی اموال کا درد نہیں اور بھیرہ کے ایک ہم وطن شخص کی ناجائز رعایت کر کے اُسے جماعت کی جائداد اَدنے پَونے دی جا رہی ہے۔ یہ اعتراض بھی پرانے منافقین کی روش کا اعادہ ہے۔ خلفائے راشدین کی تاریخ سے واقفیت رکھنے والے احباب پر خوب روشن ہوگا کہ کس طرح معترضین نے ایک کے بعد دوسرے خلیفہ پر مالی بے ضابطگیوں اور ناانصافیوں کے الزامات عاید کئے۔ خلفاء تو پھر خلفائ تھے دونوں جہان کے سردار حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ظالم اس بارہ میں زبانِ طعن دراز کرنے سے باز نہ آئے یعنی اس سردارِ دو عالمؐ پر بھی قومی اموال کی ناجائز تقسیم کا الزام لگایا گیا جو اس دنیا میں بھی عدل کی بلند ترین کرسی پر فائز فرمایا گیا اور قیامت کے دن بھی خدا کے بعد عدل و انصاف کی کرسیوں میں اس کی کرسی سب سے اونچی ہوگی۔
خدا کا نبی تو براہ راست خدا کا انتخاب ہوتا ہے لیکن نبی کے خلفاء کا انتخاب چونکہ الٰہی تصرّف کے

تحت نبی کی تربیت یافتہ صالحین کی جماعت کرتی ہے اور انتخاب کے وقت معیار محض تقویٰ اللہ ہوتا ہے۔ اس لئے انبیائ کے خلفاء کو بھی خدا تعالیٰ ہی کا انتخاب شمار کیا جاتا ہے۔ جماعت احمدیہ (مبائعین) کا اسی مذہب پر اجماع ہے۔ پس جس وجود کو خلافت کی عظیم ذمہ داری محض اس لئے سونپی جاتی ہے کہ وہ اپنے وقت کے انسانوں میں اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ تقویٰ اپنے دل میں رکھتا ہے اس پر اس قسم کے لغو اعتراضات مضحکہ خیزی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ دین کی راہ میں مالی قربانی کے میدان میں یہ معترضین حضرت خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ عنہ کی جوتیوں کی خاک کو بھی نہیں پہنچے تھے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام آپ کے بارہ میں فرماتے ہیں :-

"سب سے پہلے میں اپنے ایک روحانی بھائی کے ذکر کرنے کے لئے دل میں جوش پاتا ہوں جن کا نام اُن کے نورِ اخلاص کی طرح نور دین ہے۔ میں انکی بعض دینی خدمتوں کو جو اپنے مال حلال کے خرچ سے اعلائے کلمہ اسلام کے لئے وہ کر رہے ہیں ہمیشہ حسرت کی نظر سے دیکھتا ہوں کہ کاش وہ خدمتیں مجھ سے بھی ادا ہو سکتیں۔ اُن کے دل میں جو تائید دین کے لئے جوش بھرا ہوا ہے اُس کے تصوّر سے قدرتِ الٰہی کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے کہ وہ کیسے اپنے بندوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے! وہ اپنے تمام مال اور تمام زور اور تمام اسبابِ مقدرت کے ساتھ جو اُن کو میسر ہیں ہر وقت اللہ رسول کی اطاعت کے لئے مستعد کھڑے ہیں۔ اور میں تجربہ سے نہ صرف حسنِ ظن سے یہ علمِ صحیح واقعی رکھتا ہوں کہ انہیں میری راہ میں مال کیا بلکہ جان اور عزت تک سے بھی دریغ نہیں اگر میں اجازت دیتا تو وہ سب کچھ اس راہ میں فدا کر کے اپنی رُوحانی رفاقت کی طرح جسمانی رفاقت اور ہر دم صحبت میں رہنے کا حق ادا کرتے۔ اُن کے بعض خطوط کی چند سطریں بطور نمونہ ناظرین کو دکھلاتا ہوں تا انہیں معلوم ہو کہ میرے پیارے بھائی مولوی حکیم نورالدین بھیروی معالج ریاست جموں نے محبت اور اخلاص کے مراتب میں کہاں تک ترقی کی ہے۔ اور وہ سطریں یہ ہیں :-

مولنا مرشدنا امامنا۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

عالیجناب! میری دُعا یہ ہے کہ ہر وقت حضور کی جناب میں حاضر رہوں۔ اور

امامُ الزّمان سے جس مطلب کے واسطے وہ مجدّد کیا گیا' وہ مطالب حاصل کروں۔ اگر اجازت ہو تو میں نوکری سے استعفیٰ دے دوں اور دن رات خدمتِ عالی میں پڑا رہوں یا اگر حکم ہو تو اس تعلق کو چھوڑ کر دُنیا میں پھروں اور لوگوں کو دینِ حق کی طرف بلاؤں اور اسی راہ میں جان دے دُوں۔ میں آپ کی راہ میں قربان ہوں۔ میرا جو کچھ ہے' میرا نہیں آپ کا ہے۔ حضرت پیر و مرشد مَیں کمال راستی سے عرض کرتا ہوں کہ میرا سارا مال و دولت اگر دینی اشاعت میں خرچ ہو جائے تو میں مراد کو پہنچ گیا" [۱]

اس بحث میں یاد رکھنے کے لائق نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقدّس بندوں پر اس قسم کے اعتراض کرنے والوں کو خواہ وہ پہلے گزرے ہوں یا بعد میں آئیں' آپ عموماً خود مالی قربانی کرنے والوں کی صف میں سب سے پیچھے کھڑا ہُوا پائیں گے یا پھر محض تماش بینوں کی حیثیت رکھتے ہوں گے۔ ایسے لوگوں کا مقصد نہ کبھی پہلے نیک ہُوا' نہ آئندہ ہوگا۔ محض ریاکاری یا نفاق پھیلانے یا کسی ذاتی رنجش کا انتقام لینا ان کا مقصد ہوتا ہے۔

یہ اعتراض کہ حق' حق دار کو نہیں پہنچا بلکہ کمتر شخص کو اختیار کر لیا گیا ہے

حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ پر عائد کیا جانے والا یہ اعتراض بھی ہزاروں سال پرانا وہ اعتراض ہے جو منکرینِ نبوّت انبیائے وقت پر کرتے رہے اور منکرینِ خلافت' خلفائے وقت پر۔ یہی اعتراض حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ پر اور بعد میں آنے والے خلفا پر بھی کیا گیا اور خدا جانے کب تک کیا جاتا رہے گا۔ دراصل شیطان مومنین کی جماعت پر مختلف اطراف سے مختلف بھیس بدل کر حملہ آور ہوتا رہتا ہے۔ کبھی وہ ان میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے کبھی مذہبی قیادت کے خلاف عدمِ اعتماد پیدا کرنے کی۔ کبھی وہ پھَپھا کُٹنی کا رُوپ دھار لیتا ہے اور یہ باور کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ امامِ وقت سے بڑھ کر کوئی اور تمہارا ہمدرد اور بہی خواہ موجود ہے۔ کبھی وہ ظاہری

---

[۱] رُوحانی خزائن (فتح اسلام) جلد ۳ صفحہ ۳۵-۳۶

علم کی قباء اوڑھ کر آتا ہے اور یہ وسوسہ پھیلاتا ہے کہ تمہارے امام کا علم خام ہے جب کہ اس کی نسبت بہت بڑے بڑے عالم تم میں موجود ہیں۔ کبھی وہ ایک جُبّہ پوش عابد و زاہد بن کر اُن کو ورغلاتا ہے کہ تمہارے امام سے کہیں بڑھ کر خدا کا پیارا تم میں موجود ہے۔ پس جو کچھ مانگنا ہے' اس کی معرفت مانگو۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب کا جماعت احمدیہ پر ایک عظیم احسان ہے کہ اس قسم کے فتنہ پردازوں کے اطوار و عادات کو بار بار ایسی وضاحت کے ساتھ کھول کر جماعت کے سامنے رکھ دیا ہے کہ اب جب بھی جس بھیس میں بھی فتنہ پرداز حملہ آور ہوتے ہیں' جماعت کی بھاری اکثریت کا ردّ عمل اس مصرعہ کے مصداق ہوتا ہے ؎

ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

ہاں چند احمق یا رُوحانی بیمار اور منافق طبع لوگ ضرور ہر بار شیطان کے ہاتھ لگ جاتے ہیں اور قرآن کریم کا یہ پہلا سبق بھول جاتے ہیں کہ سب سے پہلا فریب جو ابلیس نے خود کھایا اور اپنے متبعین کو کھلایا وہ اَنَا خَیْرٌ مِّنْہُ کا فریب تھا۔ حق پرست اور حق شناس بندگانِ خدا کا امتیازی نشان اَنَا خَیْرٌ مِّنْہُ کا دعویٰ نہیں بلکہ "اَنَا اَحْقَرُ الْغِلْمَانِ" کا اعلان ہوتا ہے۔ وہ خود عاجزانہ راہوں پر قدم مارتے ہیں اور دُنیا کو بھی یہی تعلیم دیتے ہیں کہ ؎

بد تر بنو ہر ایک سے اپنے خیال میں
شاید اسی سے دخل ہو دارالوصال میں

حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کی عظمت بھی آپ کی انکساری اور عجز میں مضمر تھی۔

جُزئی فضیلت کی بحثیں یا نفاق کا چور دروازہ

خلیفۂ وقت سے بہتر ہونے کا گھمنڈ رکھنے والے یا اس پر کسی دوسرے کی فضیلت کا ڈھنڈورا پیٹنے والے بعض اوقات پختہ ایمان والوں کے دلوں میں راہ پانے کے لئے "جزئی فضیلت" کے چور دروازے سے داخل ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی چکنی چپڑی باتیں کچھ اس نہج پر چلتی ہیں کہ خلیفۂ وقت فلاں معاملہ میں تو بہت قابل ہے لیکن فلاں معاملہ کی اسے کوئی واقفیت نہیں۔ اس معاملہ میں فلاں شخص کا جواب نہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ فتنہ مختلف شکلیں اختیار کر لیتا ہے۔ کبھی تقریر و تحریر کی فضیلت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے کبھی عبادت گزاری کی صُورت میں' کبھی ظاہری سادگی اور درویشانہ

زندگی کی قبا پہن کر اُٹھتا ہے، کبھی علمِ قرآن کا چوغہ اوڑھ کر۔ کبھی دنیاوی علوم کی برتری کا تذکرہ بن جاتا ہے۔ کبھی سیاست اور تدبّر اور معاملہ فہمی کا چرچا۔ غرضیکہ جس رخنہ سے موقع ملے یہ مومنوں کی مرصوص صف بندی میں داخل ہو کر انتشار پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ایک قیادت کی طرف مرکوز جماعتی توجہ کو دو یا تین یا زاید قیادتوں کی طرف پھیر کر وحدتِ ملّی کے نقصان کا موجب بنتا ہے۔

رُوحانی قیادت کے خلاف فتنے کی یہ مختلف شکلیں ازمنہ گزشتہ میں بھی پائی جاتی تھیں اور خلافتِ راشدہ کو بھی اس نے نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اس نے یہ شکل اختیار کی کہ آپ کی بزرگی اور علمِ قرآن کو تو تسلیم کیا جانے لگا لیکن ساتھ ہی یہ شوشہ بھی چھوڑ دیا جاتا کہ دراصل خلیفہ اسی لائق ہوتا ہے کہ نمازیں پڑھائے، درس و تدریس کا کام کرے، بیعتیں لے اور دُعائیں کرے۔ اس کا دیگر انتظامی امور وغیرہ سے کیا تعلق؟ یہ کام تو صاحبِ تجربہ، جہاندیدہ اور علوم دنیوی سے آراستہ لوگوں کا ہے۔ لہٰذا جماعت کو ایک سَر کی بجائے دو سَروں والی قیادت کی ضرورت ہے۔ ایک سَر تو مرکزی ملّا کے فرائض انجام دے اور ایک سَر بصورت انجمن تمام دیگر امور میں جماعت کی قیادت کرے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کے عہد میں اس فتنہ نے جو صورت اختیار کی، چونکہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے، اس لئے عین ممکن ہے کہ یہ کسی دوسری خلافت میں اس کے بالکل برعکس شکل میں ظاہر ہو اور کسی خلیفہ کے بارہ میں یہ پراپیگنڈہ کیا جائے کہ دراصل خلیفہ تو انتظامی سربراہ ہوتا ہے اور اسی قابلیت کو ملحوظ رکھتے ہُوئے جماعت نے فلاں شخص کا انتخاب کیا تھا۔ جہاں تک روحانیت اور تعلق باللہ کا سوال ہے، فلاں شخص کا کوئی مقابلہ نہیں۔ پس انتظامی امور میں بے شک خلیفہ کی اطاعت کرو مگر ارادت مندی اور عقیدت اور دلی محبت فلاں بزرگ سے رکھو۔ گویا انجمن کے کام چلانے کے لئے تو خلیفہ ہو اور رُوحانی قیادت اور رہنمائی کے لئے ایک بُت تراش لیا جائے۔ لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، حقیقتِ خلافت سے متعلق حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کے پُرمعرفت جلالی خطبات اور حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی زندگی بھر کی بھرپور جدوجہد کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے جماعتِ احمدیہ کی ایسی ٹھوس اور گہری تربیت ہو چکی ہے کہ جماعت کی بہت بھاری اکثریت ان فتنہ پردازوں کے چھپے ہُوئے بد ارادوں کو فوراً بھانپ لیتی ہے اور اُن کے دِلوں میں پکنے والے بُغض و عناد، حسد و خود پرستی کے زہریلے مواد سے پناہ مانگتی ہے۔

اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ۔ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ

خلیفہ وقت کی غلطیوں کی نشاندہی اور اُن کے چرچے

مذکورہ بالا فتنہ کی ایک شکل یہ بھی بنتی ہے کہ خلیفہ کے فیصلہ جات پر پہلے دبی زبان سے تنقید کی جاتی ہے پھر حسب حالات کھل کر اُن کی مذمت کی مہم چلائی جاتی ہے۔ ایسے فتنے بعض اوقات عمومی شکل بھی اختیار کر جاتے ہیں اور تمام جماعت سے تعلق رکھنے والے مرکزی فیصلوں کو تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے لیکن اکثر اوقات یہ محدود دائرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ بعض قضائی یا انتظامی فیصلے ایسے ہوتے ہیں کہ لازماً خلیفۃ المسیح کا فیصلہ ایک فریق کے حق میں اور ایک فریق کے خلاف ہوگا۔ اس صورت میں منافقین کی ہمدردیاں حق اور ناحق کی تمیز کے بغیر بلا استثناء متأثرہ فریق سے ہوتی ہیں اور وہ انسانی ہمدردی اور اخلاق حسنہ کے پردہ میں متأثرہ دوستوں سے ایسی لگاوٹ کی باتیں کرتے ہیں جو رفتہ رفتہ خلیفہ وقت کے خلاف منافرت انگیزی پر منتج ہو جاتی ہیں۔ حضرت خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ عنہ نے جب منکرین خلافت کا بڑی سختی سے محاسبہ کیا تو فتنہ کی یہی شکل اس موقع پر بھی رونما ہوئی۔ اور اندر اندر ایک دوسرے کے ساتھ اس رنگ میں ہمدردیاں کی جانے لگیں گویا وہ سخت مظلوم اور حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کی تیغ ستم کا کُشتہ ہیں۔ فتنوں کی تاریخ میں یہ شکل بھی بہت قدیمی ہے اور اسی طرح مردود ہے جس طرح دیگر اقسام۔

اپنی پسند کے آدمیوں کو مسلط کرنے کا الزام

ایک الزام حضرت خلیفۃ المسیح الاوّلؓ پر یہ لگایا گیا کہ یہ اپنی پسند کے آدمیوں کو (جو معترضین کی نظر میں نااہل تھے) جماعت پر مسلط کر رہے ہیں۔ یہ اُسی نوعیت کا الزام ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مبارک عہد میں ایک نہایت خطرناک وبا کی صورت میں پھُوٹا تھا دراصل ہر زندہ حقیقت کے ساتھ موت کی منحوس صورتیں ہمیشہ نبرد آزما رہی ہیں اور رہیں گی اور ان وباؤں کے ساتھ مقابلہ میں جب بھی کوئی زندہ جماعت غالب آتی ہے تو اس نوعیت کے دوسرے فتنوں کے مقابلے کی پہلے سے بڑھ کر طاقت اس میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس ازلی ابدی حقیقت کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا کہ ہر زندہ حقیقت کو موت یا اس سے مشابہ قوتوں کے ساتھ نبرد آزما رہنا پڑتا ہے اور اس میں اس کے ارتقا

اور تحسینِ عمل کا راز مضمر ہے۔ قرآن کریم اسی مضمون کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے :-

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ
شَيْءٍ قَدِيْرُۨ ِ الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ
لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ
الْغَفُوْرُ ۙ (الملک ۶۷ : ۲ - ۳)

بابرکت ہے وہ ذات جس کے قبضۂ قدرت میں ہر قسم کی بادشاہی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہی ہے جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہیں آزمائش میں ڈال کر معلوم کرے کہ تم میں سے کون بہترین عمل کرنے والا ہے۔ اور وہ غالب اور بہت بخشنے والا ہے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ پر یہ الزام عائد کرنے والوں کے پیشِ نظر بالخصوص حضرت صاحبزادہ مرزا محمود احمد صاحب کی ذات تھی جن پر حضرت خلیفۃ المسیح غیر معمولی اعتماد فرماتے اور معترضین کی نظر میں نااہل ہونے کے باوجود نہایت اہم جماعتی ذمہ داریاں آپ کے سپرد فرماتے۔ یہاں تک بھی چہ میگوئیاں کی جاتیں کہ اپنے بعد "میاں محمود" کو خلیفہ بنانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اپنی آخری بیماری میں حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا اسی اعتراض کے پیشِ نظر تھا کہ :

"وہ جو کہتا ہے کہ فلاں شخص کو میں نے خلیفہ مقرر کر دیا ہے' غلط ہے۔ مجھے کیا علم ہے کہ کون خلیفہ ہوگا اور کیا ہوگا۔ کون خلیفہ بنے گا یا مجھ سے بہتر خلیفہ ہوگا۔ میں نے کسی کو خلیفہ نہیں بنایا۔ میں کسی کو خلیفہ نہیں بناتا۔ میرا یہ کام نہیں خلیفے اللہ ہی بناتا ہے۔ میرے بعد بھی اللہ ہی بنائے گا"[۱]

بڑھاپے اور جسمانی کمزوری کے باعث نااہلی کا الزام

حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ پر تنقید کا ایک یہ بہانہ بھی بنایا جاتا تھا کہ چونکہ آپ بہت بوڑھے ہو چکے ہیں' لہٰذا عمر کے طبعی تقاضے کے پیشِ نظر (نعوذ باللہ) طبیعت میں تلوّن اور ضد بہت بڑھ گئے ہیں۔ اس ضمن میں بعض خطوط میں سے دو اقتباسات ملاحظہ فرمایئے :-

---

[۱] الحکم ۲۸ فروری ۱۹۱۴ء

(۱)

"خلیفہ صاحب کا تلونِ طبع بہت بڑھ گیا ہے اور عنقریب ایک نوٹس شائع کرنے والے ہیں۔ جس سے اندیشہ بہت بڑے ابتلاء کا ہے ... اگر ذرا بھی تخالف خلیفہ صاحب کی رائے سے ہو تو بڑا افروختہ ہو جاتے ہیں ... سب حالات عرض کئے گئے مگر اُن کا جوش فرو نہ ہوا اور ایک اشتہار جاری کرنے کا مصمم ارادہ رکھتے ہیں۔" [1]

(۲)

"حضرت مولوی صاحب کی طبیعت میں ضد اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ دُوسرے کی سُن ہی نہیں سکتے۔ وصیت کو پس پشت ڈال کر خدا کے فرستادہ کے کلام کی بے پرواہی کرتے ہوئے شخصی وجاہت اور حکومت ہی پیش نظر ہے سلسلہ تباہ ہو تو ہو مگر اپنے منہ سے نکلی ہوئی بات نہ ٹلے۔ وہ سلسلہ جو کہ حضرت اقدس کے ذریعہ بنا تھا اور جو کہ بڑھے گا، وہ چند ایک اشخاص کی ذاتی رائے کی وجہ سے اب ایسا گرنے کو ہے کہ پھر ایک وقت کے بعد ہی سنبھلے تو سنبھلے۔" [2]

منافقین کا یہ پرانا وطیرہ ہے کہ بل فریب سے بات کرتے ہیں اور کسی بزرگ ہستی کی گستاخی کے لئے زبان بے قابو ہو رہی ہو تو لفظی چالاکی سے کوئی نہ کوئی راہ نکال لیتے ہیں۔ چنانچہ خدا تعالیٰ کی تقدیر کے خلاف زبان درازی مقصود ہو تو فلک کو بُرا بھلا کہہ کر دل کی بھڑاس نکال لی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے افلاک یا گردشِ ایام کو بُرا بھلا کہنے سے سختی سے منع فرمایا ہے کیونکہ یہ دراصل تقدیرِ الٰہی کو بُرا کہنے کے مترادف ہے۔

پس منافقین بھی خلیفہ وقت کو کوسنے کی جرأت نہ پا کر کبھی اس کے بڑھاپے کو بُرا بھلا کہتے اور کبھی اس کی بیماری کو آڑ بنا کر مومنوں کی جماعت میں "عزلِ خلیفہ" کے جراثیم پھیلانے کی کوشش کرتے اور اس حقیقت کو فراموش کر دیتے کہ مومنوں کی سوسائٹی میں خلیفہ کا مقام اُس سے بہت بڑھ کر ہے، جو

---

[1] خط ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب بنام سید حامد علی شاہ صاحب سیالکوٹی [2] خط ڈاکٹر سید محمد حسین شاہ صاحب بنام سید حامد علی شاہ صاحب سیالکوٹی

ایک خاندان کے ماحول میں ماں باپ کو حاصل ہوتا ہے یعنی ان ماں باپ کو جن کے بارہ میں قرآن کریم یہ تعلیم دیتا ہے کہ اگر اُن میں سے دونوں یا ایک بہت بوڑھے ہو جائیں، تب بھی (دامنِ ادب ہاتھ سے نہ جانے دینا اور) اُن کے سامنے اُف تک نہ کرنا۔

ایک چاند کے بعد دُوسرا چاند

اب ہم اِس باب کو ختم کرتے ہیں۔ بلاشبہ تاریخِ احمدیت کا یہ ایک زرّیں اور بڑا معرکۃ الآراء دَور تھا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ نے شدید مشکلات اور مخالفتوں کے علی الرغم خلافت کی مقدّس امانت کی اِس شان سے حفاظت فرمائی کہ بالآخر منکرینِ خلافت کو ناکامی اور نامرادی کا منہ دیکھ کر ہمیشہ کے لئے مرکزِ احمدیت کو الوداع کہنا پڑا۔ اُفقِ احمدیت پر خلافت کا ایک چاند غروب ہُوا تو ایک اور چاند طلوع ہُوا۔ اُسی طرح روشن اور چمکتا ہُوا اور ماحول کو نُورِ آسمانی سے جگمگاتا ہُوا۔ مخالفین بڑے کرب اور تکلیف کے ساتھ حسد کی آگ میں جلتے اور کسمساتے ہُوئے اُسے بلند سے بلند تر ہوتا ہُوا دیکھتے رہے لیکن کوئی نہ تھا جو اِس کا کچھ بگاڑ سکے۔ خلافتِ احمدیہ مستحکم اور متمکّن ہو چکی تھی اور مومنوں کی جماعت کو اپنے سایہ عاطفت میں لئے ہُوئے بلند تر منازل کی طرف بڑھ رہی تھی۔

حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب رضی اللہ عنہ اس موقع پر بڑے دلنشین انداز میں احمدیت کے ایک رُخصت ہوتے ہُوئے خلیفہ کو الوداع اور ایک قدم رنجہ فرماتے ہُوئے خلیفہ کو خوش آمدید کہتے ہیں:

"اے جانے والے تجھے تیرا پاک عہدِ خلافت مبارک ہو کہ تُونے اپنے امام و مُطاع مسیح کی امانت کو خوب نبھایا اور خلافت کی بنیادوں کو ایسی آہنی سلاخوں سے باندھ دیا کہ پھر کوئی طاقت اسے اپنی جگہ سے ہلا نہ سکی۔ جا! اور اپنے آقا کے ہاتھوں سے مبارک باد کا تحفہ لے اور رضوانِ یار کا ہار پہن کر جنّت میں ابدی بسیرا کر۔ اور اے آنے والے! تجھے بھی مبارک ہو کہ تُونے سیاہ بادلوں کی دل ہلا دینے والی گرجوں میں مسندِ خلافت پر قدم رکھا اور قدم رکھتے ہی رحمت کی بارشیں برسا دیں۔ تو ہزاروں کانپتے ہوئے دلوں میں سے ہو کر تختِ امامت کی طرف آیا اور پھر ایک ہاتھ کی جنبش سے ان تھرّاتے ہوئے سینوں کو سکینت بخش دی۔ آ! اور ایک شکور جماعت کی ہزاروں دعاؤں اور تمنّاؤں کے ساتھ اُن کی سرداری کے تاج کو قبول کر۔ تو ہمارے پہلو سے اُٹھا ہے مگر بہت دُور سے آیا ہے۔ آ! اور ایک قریب رہنے والے کی محبّت اور دُور سے آنے والے کے اکرام کا نظارہ دیکھ۔" (سلسلہ احمدیہ صفحہ ۳۴۳)